

حُكْمِ اِذَا ل



وَارْهِنَا
صِرَاطِي
مُسْتَقِيمًا
فَاتَّبِعُوهُ
وَلَا تَتَّبِعُوا
السَّبِيلَ
فَتَفْرُقَ
بَيْنَهُ
سَبِيلًا

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں پائند
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
بہار ہو کر حنا لہ لالہ لالہ اللہ
مجھے ہے حکم اذان لا الہ الا اللہ

لَا كُؤْنَ مَعَ الصَّادِقِينَ

حکم اذان

ڈاکٹر محمد نجیبانی سہادیؒ

ترجمہ : مستجاب احمد انصاری

تدوین : رضا حسین رضوانی

مجمع علمی اسلامی

خُطْبَةُ الْكِتَابِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. الرَّحْمَنِ
الرَّحِيمِ. مَا لِكَ يَوْمَ الدِّينِ. إِيَّاكَ
نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ. اهْدِنَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ. وَصَلِّ عَلَى
مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّينَ. الَّذِي
أَرْسَلْتَهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ. وَأَنْزَلْتَ
عَلَيْهِ كِتَابًا لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ
وَسَلَّمَ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ الْمُطَهَّرِينَ
الَّذِينَ جَعَلْتَ صِرَاطَهُمْ صِرَاطَ
الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ
عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ.

فہرس

گفتارِ مؤلف

اسلوبِ تالیف

قرآن - اہل سنت اور اہل تشیع کی نظر میں

سنتِ رسول - اہل سنت اور اہل تشیع کی نظر میں

شیعہ اور سنی عقائد

اللہ تعالیٰ کے متعلق فریقین کا عقیدہ

نبوت کے بارے میں فریقین کا عقیدہ

فریقین کے نزدیک امامت کا عقیدہ

امامت قرآن کی رو سے

امامت سنتِ نبوی کی رو سے

خلافت کے بارے میں اہل سنت کی رائے

ولایت علیؑ قرآن کریم میں

آیہ تبلیغ کا تعلق بھی ولایت علیؑ سے ہے

اکمالِ دین کی آیت کا تعلق بھی خلافت سے ہے

یہ دعویٰ کہ آیتِ اکمالِ عرفہ کے دن نازل ہوئی ہے

اس بحث کا ایک جزو

حسرت و افسوس

بحث کے آخر میں کچھ تبصرہ

امام علیؑ کی ولایت کے دوسرے شواہد

شوریٰ پر تبصرہ

مسئلہ تقدیر - اہل سنت کی نظر میں

قضا و قدر کے بارے میں شیعہ عقیدہ

قضا و قدر کے ضمن میں خلافت پر بحث

۵

۹

۱۲

۱۹

۳۱

۳۲

۳۶

۴۲

۴۴

۴۸

۵۳

۵۷

۶۰

۷۸

۸۲

۱۰۱

۱۲۲

۱۳۰

۱۴۰

۱۴۵

۱۵۱

۱۶۲

۱۶۷

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

گفتارِ مولف

میری پہلی کتاب **ثُمَّ اهْتَدَيْتَ** (جس کا اردو ترجمہ تجلی ہے) کو قارئین کرام نے حسن قبول سے نوازا اور اس پر کئی اہم تبصرے بھی کیے۔ بعض نے اُن مسائل کے بارے میں جو اہل سنت اور اہل تشیع میں اختلافی ہیں مزید وضاحت چاہی تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ اور جو شخص تحقیق کرنا اور حقیقت سے واقف ہونا چاہے، اس کے لیے کوئی شک اور ابہام باقی نہ ہے۔

اس لیے میں نے یہ ایک اور کتاب اُسی طرز پر لکھی ہے تاکہ انصاف پسند تحقیق کا طالب بہ آسان حقیقت تک اُسی طرح رسائی حاصل کر سکے جیسے میں نے تفصیل بحث و مطالعہ کے بعد حاصل کی ہے۔ برکت کے لیے میں نے اس کتاب کا نام **لَا كُؤْنَ مَعَ الصَّادِقِينَ** رکھا ہے، جو اس آیت کریمہ سے ماخوذ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ۝۱۰
ظاہر ہے کہ حضرت رسول ﷺ اور ان کی آل پاکؑ سے بڑھ کر اور کون سچا ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں میں سے جو بھی ان سچوں کا ساتھ دینے سے انکار کرے گا وہ خود کو راہِ راست سے دُور ہٹا ہوا پاتے گا اور اس طرح یا تو مغضوب علیہم کے زمرے میں شامل ہوگا یا ضالین کے زمرے میں۔

مجھے ذاتی طور پر تو اس بات کا یقین اور اطمینان ہو گیا ہے۔ اب میری کوشش یہ ہے کہ جہاں تک بن پڑے دوسروں کے لیے بھی یہ بات واضح کر دوں مگر میں کسی پر اپنی رائے ٹھونسنا نہیں چاہتا بلکہ دوسروں کی رائے کا بھی احترام کرتا ہوں۔

رسولؐ کے ترکہ کے بارے میں اختلاف	۱۷۰
۱۔ حدیث کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں صحابہ میں اختلاف	۱۸۰
ابو ہریرہؓ کا ایک اور قصہ	۱۸۲
عائشہؓ اور ابن عمرؓ کا اختلاف	۱۸۳
عائشہؓ اور ازواجِ نبیؐ کا اختلاف	۱۸۳
۲۔ سنتِ رسولؐ کے بارے میں فقہی مذاہب میں اختلاف	۱۸۷
۳۔ سنتِ رسولؐ کے بارے میں شیعوں میں اختلاف	۱۸۸
خمس	۱۹۹
تقلید	۲۰۷
وہ عقائد جن پر اہل سنت شیعوں کو الزام دیتے ہیں	۲۱۶
ائمہ کی عصمت	۲۲۲
عصمت از دوتہ قرآن	۲۲۳
عصمت از دوتہ حدیث	۲۲۴
ائمہ کی تعداد	۲۲۹
ائمہ کا علم	۲۳۱
بکار	۲۳۶
تفتیش	۲۴۶
مشعہ: معلیۃ مدّت کا نکاح	۲۵۷
مسئلہ تحریفِ قرآن	۲۶۸
جمع بین الصلّاتین	۲۸۳
خاک پر سجدہ	۲۹۵
رجعت	۳۰۱
مہدی منتظر علیہ السلام	۳۰۶
ائمہ کی محبت میں غلو	۳۱۶

کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ میں نے اپنی پہلی کتاب کا نام :
ثُمَّ اهْتَدَيْتُ کیوں رکھا ؟ ان کا کہنا ہے کہ یہ اہل سنت کو اشتعال دلانا ہے کیونکہ
اگر انھوں نے ہدایت نہیں پائی تو مطلب یہ ہوا کہ وہ ضلالت میں مبتلا ہیں۔

میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ

✽ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن شریف میں ضلالت کا لفظ بھول چوک کے
معنی میں آیا ہے۔ ارشاد ہے : قَالَ عَلَّمَهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّي
وَلَا يَنْسِي ۝

ایک اور جگہ آیا ہے : اَنْ تَضِلَّ اِحَدًا هُمَا فَتُذَكِّرَا هُمَا
الْاٰخَرٰی ۝

اسی طرح قرآن کریم میں ضلالت کا لفظ بحث و تفتیش کے معنی میں بھی
استعمال ہوا ہے۔ اپنے پیارے رسولؐ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ
نے فرمایا ہے : وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰی ۝ جیسا کہ معلوم ہے، بعثت سے قبل
مکے میں رسول اللہؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر کسی کسی راتیں حقیقت
کی تلاش میں غارِ جرا میں بسر کیا کرتے تھے۔

انہی معنوں میں آپؐ کا یہ قول بھی ہے : الْحِكْمَةُ ضَالَّةٌ الْمُؤْمِنِ
اَيْنَمَا وَجَدَهَا اَخَذَهَا ۝

پس کتاب کا نام ان ہی معنوں پر محمول کیا جائے۔ ثُمَّ اهْتَدَيْتُ یعنی میں
نے حقیقت کی تلاش کی اور اللہ نے مجھے اس تک پہنچا دیا۔

✽ دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم اللہ سبحانہ کا یہ قول پڑھتے ہیں کہ

ہم اس کا علم میرے پروردگار کے پاس کتاب میں ہے۔ میرے پروردگار سے کبھی بھول چوک نہیں
ہوتی۔ (سورہ طہ - آیت ۵۲)

۱؎ اگر ایک بھول جاتے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ (سورہ بقرہ - آیت ۲۸۲)

۲؎ آپ کو حقیقت کی تلاش میں پایا تو آپؐ کو اس تک پہنچا دیا۔ (سورہ صبحی)

۳؎ حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے، جہاں ملتی ہے لے لیتا ہے۔

وَ اِنِّي لَخَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی ۝ تو ہمیں ہدایت
نہ پانے والے کی گمراہی کا مطلق احساس نہیں ہونے پاتا۔ کیونکہ جس نے توبہ کی، ایمان
لایا اور نیک عمل کیے اسے ضال یا گمراہ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے لاییت
اہل بیتؑ کی طرف ہدایت نصیب نہ ہوتی ہو۔

✽ تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ بالفرض جسے ولایت اہل بیتؑ کے قبول
کرنے کی ہدایت نہیں ملی وہ ضال ہے اس معنی میں کہ ضلالت ہدایت کی ضد ہے
تو یوں ہی سہی۔ یہ تو وہ حقیقت ہے جس سے اکثر لوگ بھاگتے ہیں، خوشدلی سے
اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتے اور حق کو خواہ کر پوہا ہی کیوں نہ ہو برداشت کرنے کو تیار
نہیں ہیں۔ ورنہ اس حدیث رسولؐ کے کیا معنی ہیں کہ تَوَكَّلْ فَيَكْمُرُ الشُّكَّانِ
كِتَابَ اللّٰهِ وَ عَثَرَتْ اَهْلَ بَنِي مَا اِنْ تَمَسَّكَتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي
اَبَدًا ۝ جو ان دونوں میں سے ایک کے ساتھ تم شک نہیں کرے گا اس کے ضال ہونے
کے بارے میں یہ حدیث واضح اور صریح ہے۔

بہر حال مجھے تو یقین اور اطمینان ہے کہ میں بھٹکا ہوا تھا اور اللہ کے فضل
سے مجھے کتابِ خدا اور عشرتِ رسولؐ سے تمسک کی ہدایت نصیب ہوئی۔ فَالْحَمْدُ
لِلّٰهِ الَّذِي هَدٰى اَنَا لِهٰذَا ۝

میری پہلی کتاب کی طرح اس کتاب کا نام بھی قرآن کریم سے ماخوذ ہے، جو
سب سے سچا اور سب سے اچھا کلام ہے۔ میں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اگر وہ
مکمل طور پر حق نہیں بھی ہے، جب بھی وہ حق سے اس قدر نزدیک ہے جتنا
امکانی طور پر ہو سکتا ہے، کیونکہ اس میں ان ہی باتوں کا تذکرہ ہے جن پر شیعہ اور سنی
دونوں کا اتفاق ہے اور جو دونوں کے نزدیک ثابت اور صحیح ہیں۔

۱؎ میں یقیناً اس کو بخش دوں گا جس نے توبہ کی، ایمان لایا اور نیک عمل کیے اور پھر ہدایت
پائی۔ (سورہ طہ - آیت ۸۲)

۲؎ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں : ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عمرؑ
میرے اہل بیتؑ۔ جب تک تم ان دونوں کا دامن تھامے رہو گے کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

میں حریم اقدسِ الہی میں دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہم مسلمانوں کو خیرِ الٰہی
 بننے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم ہدیٰ برحق کی قیادت میں قافلۂ انسانیت کی
 نور و ہدایت کی طرف رہنمائی کر سکیں، وہی ہدیٰ جن کے ظہور و انقلاب کی
 خبر دیتے ہوئے ان کے نانا رسول اللہؐ نے بتایا ہے کہ وہ ظلم و جور سے سستی بلکتی
 اس دنیا میں ایسا عادلانہ نظام قائم کریں گے کہ ہر طرف انصاف کا دور دورہ ہوگا
 اور دشیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں گے۔

صِبْطٌ عَلٰی حَقِّ یَسْبِیْہِ

اُسلوبِ تالیف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 وَالصَّلٰةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْمُرْسَلِیْنَ
 سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّآلِہِ الطَّاهِرِیْنَ

دین و مذہب کی بنیاد عقائد پر ہوتی ہے جو ان افکار و تصورات کے مجموعے
 کا نام ہے جس پر اس دین کے ماننے والے ایمان لاتے اور یقین رکھتے ہیں۔ بعض عقائد
 کو بغیر کسی علمی اور عقلی دلیل کے تسلیم کر لیا جاتا ہے، کیونکہ علم اور عقل دونوں محدود ہیں
 جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات زمان و مکان ہر لحاظ سے لامحدود ہے۔ اس کا احاطہ نہ علم
 کر سکتا ہے اور نہ عقل۔ اس لیے ہر دین کے پیروکاروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ
 کچھ ایسے امور پر بھی ایمان لائیں اور ان کی تصدیق کریں جو علم اور عقل کے معیار پر
 بظاہر پورے نہیں اُترتے۔ مثلاً آگ کا ٹھنڈک اور سلامتی کا موجب بن جانا جبکہ
 علم اور عقل کا اس پر اتفاق ہے کہ آگ گرم اور ٹھنڈک ہے۔ یا کسی پرندے کے
 ٹکڑے کر کے ان ٹکڑوں کو پہاڑوں پر بکھیر دینا اور پھر بٹلانے پر ان پرندوں کا
 روڑتے ہوئے آنا جبکہ علم اور عقل کے نزدیک یہ سب ناممکن ہے۔ یا اندھے،
 جذامی اور پیدائشی نابینا کا حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ پھیر دینے سے اچھا ہو جانا بلکہ
 مُردے کا بھی زندہ ہو جانا، جبکہ علم اور عقل ان باتوں کی توجیہ نہیں کر سکتے۔

آج زیادہ سے زیادہ علم اور عقل نے جو ترقی کی ہے اس سے یہ ممکن ہو گیا
 ہے کہ مُردہ آنکھ کو زندہ آنکھ سے اور مُردہ دل کو زندہ دل سے بدل دیا جائے،
 یعنی مُردہ عضو کی جگہ زندہ عضو لگا دیا جائے۔ جیسا کہ معلوم ہے ان دونوں باتوں میں
 زمین آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ یہ مُردے کو زندہ سے بدلنا ہے اور وہ مُردے کو زندہ
 کرنا۔ بہ الفاظِ دیگر۔ ایک عملِ اصلاح اور درستگی ہے اور دوسرا تخلیق۔ اسی لیے

”اے لوگو! تمہارے لیے ایک مثال بیان کی جاتی ہے،

اسے غور سے سنو! جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکار لے ہو وہ سب مل کر بھی ایک ہتھی تک تو پیدا کر نہیں سکتے۔“

میں نے قصداً وہی مثالیں بیان کی ہیں جو عقل اور عزم سے ماوراء ہیں اور جن پر مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں سب کا ایمان اور اتفاق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ہاتھ سے معجزات اس لیے ظاہر کیے تاکہ لوگوں کو یہ سمجھایا جائے کہ ان کی عقلیں ہر چیز کا ادراک اور احاطہ کرنے سے قاصر ہیں، کیونکہ اللہ سبحانہ نے ان کو علم کا صرف تھوڑا سا حصہ عطا کیا ہے اور شاید اسی میں ان کی بھلائی مضمر تھی اور ان کے جزوی کمال کے مناسب یہی صورت تھی کیونکہ بہت سوں نے خدائے منعم کی نعمتوں کا انکار کیا ہے اور بہتوں نے تو خود اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا ہے اور بہت سے اپنے غیر معمولی علم اور عقل کی بنا پر اتنے بڑے سمجھے گئے کہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر انھی کی پرستش کرنے لگے۔ یہ تو جب ہوا جب انسان کا علم بھی کم تھا اور اس کی عقل بھی ناقص تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو ہر چیز کا علم عطا کر دیتا پھر تو نہ جانے کیا ہوتا۔

عطا کر دیتا پھر تو نہ جانے کیا ہوتا۔
اس لیے میں نے اس کتاب میں اسلامی عقائد میں سے فی الجملہ ان ہی عقائد کو بیان کیا ہے جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں اور جن کے بارے میں مخمکف اسلامی فرقوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان ہی کے زیر اثر علم کلام وجود میں آیا اور وہ فلسفی و حکماء نے عربی ادبیات کو ایسی میراث کی شکل عطا کر دی جس کی نظیر دوسرے اذیان میں شاید ناپید ہے۔ یہ کارنامہ تنہا عربوں کا نہیں بلکہ اس کا سہرا ان تمام مسلمانوں کے سر ہے جنہوں نے اپنی زندگی بحث، کھوج اور اسلامی عقائد کے دفاع میں صرف کر دی۔

لَهُ يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضَرْبٌ مِثْلُ فَاستَمْعُوا لَهُ. إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ ... (سورة حج - آیت ۷۳)

1.

شاید اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ بیشتر اسلامی عقائد علم اور عقل دونوں کے لیے قابل قبول ہیں۔ میری اس بات میں اور جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے، کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ ان تمام امور میں جن کا ادراک علم اور عقل کے اپنے معیار سے نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمان کا علم اور اس کی عقل نصوص قرآنی اور احادیث نبوی کے تابع ہیں۔

اسی بنیاد پر میں نے اپنی کتاب میں سب سے پہلے ان عقائد سے بحث کی ہے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے اور اس کے بعد ان عقائد کو لیا ہے جن کی بابت فریقین میں اختلاف ہے اور ان کی وجہ سے بغیر کسی جواز کے ایک نے دوسرے پر اعتراض کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہم سب کو اپنی مرضیات پر عمل کی توفیق دے، اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرے۔

وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ



قرآن - اہل سنت اور اہل تشیع کی نظر میں

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ باطل کبھی اس کے منہ نہیں آسکتا، نہ سامنے سے نہ پیچھے سے۔ احکام، عبادات اور عقائد کے بارے میں قرآن مسلمانوں کے لیے مرجع اعلیٰ ہے، جو اس میں شک کرنے یا اس کی توہین کرے اسلام پر پھر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ قرآن کے تقدس، احترام اور بغیر طہارت کے اس کو چھونے کی ممانعت پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ لیکن اس کی تفسیر اور تاویل کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف ہے؛ شیعوں کے نزدیک قرآن کی تفسیر اور تاویل کا حق صرف ائمہ اہل بیت کو ہے جبکہ اہل سنت اس سلسلے میں یا تو صحابہ پر اعتماد کرتے ہیں یا ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک پر۔

قدرتی طور پر اس صورت حال کی وجہ سے احکام اور بالخصوص فقہی احکام میں اختلاف پیدا ہوا۔ کیونکہ خود اہل سنت کے چاروں مذاہب میں آپس میں کافی اختلاف ہے، تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ شیعوں اور سنیوں میں اور بھی زیادہ اختلاف ہو۔

میں نے کتاب کے شروع میں کہا ہے کہ اختصار کے پیش نظر میں شاید چند ہی مثالیں دے سکوں۔ اس لیے جو کوئی مزید تحقیق کا خواہشمند ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سمندر کی تہ میں غوطہ زن ہو تاکہ حسب توفیق کچھ جواہر پائے اس کے ہاتھ آسکیں۔

اہل سنت اور اہل تشیع کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے سب احکام بتلا دیئے ہیں اور اس کی تمام آیات کی تفسیر بیان کر دی ہے، لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ آپ کی وفات کے بعد قرآن کی تفسیر

اور تاویل کے لیے کس سے رجوع کیا جائے؟ اہل سنت کہتے ہیں کہ سب صحابہ قرآن کی تفسیر کے بدرجہ اولیٰ اہل ہیں اور ان کے بعد علماء اُمت اسلامیہ۔ جہاں تک تاویل کا تعلق ہے تو اہل سنت کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ۔

بجز اللہ کے کسی کو اس کی تاویل کا علم نہیں۔

اس موقع پر مجھے وہ گفت گو یاد آگئی جو ایک دفعہ میرے اور تیونس کے مشہور عالم شیخ زغوانی کے مابین ہوئی تھی۔ میں نے ان سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تھا جو حضرت موسیٰؑ کے ملک الموت کو تھپڑ مار کر ان کی آنکھ نکال لینے کے بارے میں بخاری اور مسلم میں آئی ہے۔

شیخ زغوانی بخاری پڑھانے اور اس کی شرح کے ماہر سمجھے جاتے تھے انھوں نے فوراً جواب دیا: جی ہاں! یہ حدیث بخاری میں موجود ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔ بخاری میں جو بھی حدیث ہے اس کی صحت کے بارے میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے کہا: میں سمجھا نہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس کی تشریح فرمادیں! وہ: صحیح بخاری کتاب اللہ کی طرح ہے، جو سمجھ سکتے ہو اُسے سمجھ لو، جو نہیں سمجھ سکتے اُسے چھوڑ دو اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد کر دو۔

میں: صحیح بخاری کس طرح قرآن کی طرح ہے؟ ہم سے تو قرآن کو بھی سمجھنے کے لیے کہا گیا ہے۔

وہ: بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ . هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ . فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ . ٥

۵۔ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ باب وفات موسیٰؑ اور مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۰۰ باب فضائل موسیٰؑ۔ ۵۔ وہ وہی اللہ ہے جس نے آپؐ پر کتاب اتاری۔ اس میں کچھ محکم آیتیں ہیں جن پر اصل کتاب

میں بھی شیخ زغوانی کے ساتھ ساتھ تلاوت کر رہا تھا، میں نے اِلَّا اللّٰہ کے بعد پڑھا وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ تو انھوں نے چیخ کر کہا :

وہ : ٹھہرو ! اللّٰہ کے بعد وقف لازم ہے ۔
میں : حضرت ! وارو عاطفہ ہے، الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کا عطف اللّٰہ پر ہے ۔

وہ : نہیں ! یہ نیا جملہ ہے : وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا بلہ گو وہ اس کی تاویل سے ناواقف ہوں ۔
میں : حضرت ! آپ تو بڑے عالم ہیں، آپ کیسے اس مطلب کو تسلیم کرتے ہیں ؟

وہ : اس لیے کہ صحیح تفسیر یہی ہے ۔
میں : یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ نے ایسا کلام نازل کیا ہو جس کا مطلب صرف وہی جانتا ہے ۔ آخر اس میں کیا حکمت ہے ۔ ہمیں تو قرآن پر غور کرنے اور اس کو سمجھنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ بلکہ قرآن نے تو لوگوں کو لکھا رہا ہے کہ اگر ہو سکے تو اس جیسی کوئی آیت یا کوئی ایک سورت بنا کر لے آؤ ۔ اگر اللہ کے سوا کوئی قرآن کو سمجھتا ہی نہیں تو پھر اس چیخ کا کیا مطلب ؟

اس پر شیخ زغوانی ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو مجھے ان کے پاس لیکر گئے تھے اور کہنے لگے : ”تم میرے پاس ایسے آدمی کو لے کر آئے ہو جو مجھے صرف لاجوا کرنا چاہتا ہے، وہ کوئی سوال پوچھنا نہیں چاہتا۔“ پھر انھوں نے ہمیں یہ کہتے ہوئے رخصت کر دیا : ”میں بیمار ہوں، تم میری بیماری بڑھانے کی کوشش نہ کرو۔“ جب ہم ان

کا مذاکرہ کرتے ہوئے آتے ہیں ۔ اب جن لوگوں کے دلوں میں کبھی ہے وہ اس کے اسی حصے کے پیچھے ہولتے ہیں جو متشابہ ہے ۔ ان کا مقصد شورش پھیلانا اور متشابہ آیات کا غلط مطلب لانا ہے حالانکہ ان آیات کا صحیح مطلب کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے (سورۃ آل عمران - آیت ۷) لے اور راسخون فی العلم کہتے ہیں : ”ہم تو اس پر ایمان لے آئے ۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔“

کے پاس سے نکلے تو میرے ساتھیوں میں سے ایک تو مجھ سے سخت خفا تھا، باقی چہار میرے طرفدار تھے اور کہہ رہے تھے کہ معلوم ہو گیا کہ بقول شخصے ”شیخ بالکل کوڑے ہیں۔“ اب میں پھر اصل موضوع پر آتا ہوں ۔ قرآن کی تاویل نہ کرنے پر سب اہل سنت کا اتفاق ہے ۔ کیونکہ ان کے نزدیک قرآن کی تاویل کا علم صرف اللہ کو ہے ۔ لیکن شیعہ کہتے ہیں کہ ائمہ اہلبیت قرآن کی تفسیر اور تاویل دونوں کے

اہل ہیں اور راسخون فی العلم سے وہی مراد ہیں اور وہی وہ اہل ذکر ہیں جن سے جوع کرنے کا اللہ نے ہمیں اس آیت میں حکم دیا ہے : فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ بلہ اور یہی وہ ہیں جن کو اللہ نے منتخب قرار دیا ہے اور اپنی کتاب کے علم کا وارث بنایا ہے ۔ ارشاد ہے : كُنْتُمْ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا بلہ

اسی مقصد کے لیے رسول اللہ نے انھیں قرآن کا ہمدوش اور ثقّلین میں سے ایک قرار دیا ہے اور ان سے تمسک کرنے کا سب مسلمانوں کو حکم دیا ہے ۔ آپ نے فرمایا :

تَرَكْتُ فِيكُمْ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللَّهِ وَعِترتي أَهْلَ بَيْتِي مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي أَبَدًا ۔

میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، ایک تو اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت، میرے اہل بیت جب تک تم ان کا دامن تھامے رہو گے، میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے ۔
”مسلم کے الفاظ ہیں : ”کتاب اللہ اور میرے اہلبیت ۔ میں تمہیں اپنے اہلبیت

لے اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو (سورۃ نحل - آیت ۴۳) تفسیر طبری جلد ۱۴ صفحہ ۱۰۹ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ۔

۵ پھر ہم نے وارث بنایا کتاب کا ان کو جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا ۔ (سورۃ فاطر آیت ۳۲)

۳ جامع ترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۹ ۔ حدیث ۳۸۷۴۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۔

کے بارے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔“ آپ نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔
 سچی بات یہ ہے کہ میرا رجحان شیعہ قول کی طرف ہے کیونکہ وہ زیادہ سمجھ میں
 آنے والا ہے۔ قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اس کی تفسیر بھی ہے اور تاویل
 بھی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ صرف اہل بیتؑ ہی کو اس کے سب علوم سے واقف ہونا
 چاہیے کیونکہ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ اللہ سبحانہ سب لوگوں کو قرآن کی سمجھ
 عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ۔ علمائے اسلام تک میں قرآن کی تفسیر میں اختلاف ہے،
 مگر جیسا کہ خود اللہ نے گواہی دی ہے رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ قرآن کی تاویل سے واقف ہیں
 اس لیے ان کے مابین قرآن کی تفسیر میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔
 یہ بھی بالبدایت معلوم ہے کہ اہل بیتؑ سب سے زیادہ عالم، سب سے زیادہ
 پرہیزگار، سب سے زیادہ متقی اور سب سے افضل تھے۔ فردق نے ان کے بارے میں
 کہا ہے۔

وَإِنْ عُدَّتْ أَهْلُ الثَّقَىٰ كَانُوا أَثِمَّتْهُمْ

وَإِنْ قِيلَ مَنْ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ قِيلَ هُمْ

اگر اہل تقویٰ کو گنویا جائے تو یہ اُن سب کے امام ہیں۔

اور اگر پوچھا جائے کہ دنیا میں بہترین لوگ کون ہیں تو کہا جائے گا

کہ یہی تو ہیں۔

میں اس سلسلے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا جس سے ظاہر ہو جائیگا
 کہ شیعہ وہی کچھ کہتے ہیں جو قرآن کہتا ہے اور جس کی تائید سنت نبوی سے ہوتی ہے۔
 آئیے یہ آیت پڑھیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ

تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مُّكْنُونٍ

۱۔ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۶۲ باب فضائل علی بن ابی طالب۔

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ.....

میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کی جگہ کی، اور اگر تم سمجھو تو یہ

ایک بڑی قسم ہے۔ واقعی یہ ایک قابل احترام قرآن ہے، ایک

نخسہ کتاب میں، جسے کوئی مس نہیں کر سکتا سولتے ان کے جو

پاک کیے گئے ہیں۔ (سورۃ واقفہ - آیات ۷۵ تا ۷۹)

ان آیات سے بغیر کسی ابہام کے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اہل بیتؑ ہی
 ہیں جو قرآن کے چھپے ہوئے معنی سمجھ سکتے ہیں۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ قسم جو رب العزت نے کھائی ہے واقعی ایک بڑی

قسم ہے بشرطیکہ ہم سمجھیں۔ کیونکہ اللہ نے (دوسری سورتوں میں) قسم کھائی ہے

عَصْرُکِی، قَلَمُکِی، انجیرِکِی، زیتونِکِی، ان کے مقابلے میں مَوَاقِعِ النُّجُومِ یعنی ستاروں

کی جگہوں کی یا ستاروں کی منازل کی قسم، ایک بڑی قسم ہے کیونکہ ستاروں کی منازل

اللہ کے حکم سے پراسرار طور پر کائنات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے

کہ جب اللہ قسم کھاتا ہے تو یہ قسم کسی بات کی ممانعت کے لیے نہیں ہوتی بلکہ کسی بات

کی نفی یا اثبات کے لیے ہوتی ہے۔

قسم کے بعد اللہ سبحانہ زور دے کر کہتا ہے کہ واقعی یہ قابل احترام قرآن،

ایک کتاب مکنون میں ہے اور مکنون نخسہ یا چھپے ہوئے کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد

ہے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ۔ اس میں لا صرف نفی کے لیے ہو سکتا ہے کیونکہ قسم

کے بعد آیا ہے۔ يَمَسُّهُ کے معنی یہاں درک کرنے اور سمجھنے کے ہیں، ہاتھ سے چھونے

کے نہیں جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ دراصل مَسَّ اور لَمَسَّ دو لفظ ہیں اور دونوں

کے معنی میں فرق ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ

تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ۔ ۱

۱۔ جو لوگ متقی ہیں جب انھیں کوئی شیطانی خیال ستاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں جس سے

انھیں یکایک سبھائی دینے لگتا ہے۔ (سورۃ اعراف - آیت ۲۰۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے :

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ
الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ لَهُ

ان آیات میں مس کا تعلق دل و دماغ سے ہے ہاتھ سے چھونے سے نہیں۔
ہم پوچھتے ہیں یہ کیسی بات ہے کہ اللہ سبحانہ تو قسم کھا کر کہتا ہے کہ قرآن کو کوئی چھو
نہیں سکتا بجز اس کے جو پاک کیے گئے۔ جبکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بنی امیہ کے حکمران
افلاس ایمان کے سبب تو انہیں قرآن کے مرتکب ہوتے رہے ہیں اور ولید بن مروان
نے تو یہاں تک کہا تھا کہ

”تو ہر جابر سرکش کو عذاب سے ڈراتا ہے اور میں بھی جابر
اور سرکش ہوں، جا بھڑ میں اپنے رب سے کہہ دینا کہ ولید نے
مجھے بھاڑ دیا تھا۔“

ہم نے خود دیکھا ہے کہ جب اسرائیلیوں نے بیروت پر قبضہ کیا تو انہوں نے
قرآن پاک کو اپنے پیروں تلے روندنا اور جلایا۔ اس کی دل ہلا دینے والی تصویریں ٹیلیوژن
پر دکھائی گئی تھیں یہ

اس لیے یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ قسم کھائے اور پھر قسم توڑے۔ البتہ
اللہ سبحانہ نے اس کی نفی کی ہے کہ قرآن مکنون کے معانی کو کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے،
بجز اس کے اُن منتخب بندوں کے جنہیں اس نے چن لیا ہے اور خوب پاک کیا ہے۔
اس آیت میں مُطَهَّرُونَ اسم مفعول کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں :

”وہ جو پاک کیے گئے۔“ سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ

اے جو لوگ سُورہ کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) ایسے اٹھیں گے جیسے وہ اٹھتا ہے جو شیطان کے اثر سے

نچلی ہو گیا ہو۔ (سورۃ بقرہ- آیت ۲۷۵)

اے پاکستان جیسے اسلامی ملک میں بھی مذہبی و سیاسی جھگڑوں میں قرآن جلانے جاتے ہیں اور مسجدوں
کی بے حرمتی کی جاتی ہے جو باعثِ شرم اور قابلِ مذمت ہے۔ (ناشر)

وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا .

اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ اے اہلبیت تم سے جس کو دُور

رکھے اور تمہیں خوب پاک کر دے۔ (سورۃ احزاب- آیت ۳۲)

سو اس آیت میں لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ کے معنی ہیں کہ ”قرآن کی
حقیقت کو کوئی نہیں سمجھتا سوائے اہل بیت کے۔“ اسی لیے رسول اللہ نے ان کے بارے
میں کہا ہے :

الْجَعْدُ أَمَانٌ لِأَهْلِ الْأَرْضِ مِنَ الْغَرَقِ، وَأَهْلُ
بَيْتِي أَمَانٌ لِأُمَّتِي مِنْ اخْتِلَافٍ فَإِذَا اخْتَلَفَتْهَا قَبِيلَةٌ
مِّنَ الْعَرَبِ اخْتَلَفُوا فَصَارُوا حِزْبَ الْإِبْلِيسِ .

ستارے زمین والوں کو ڈوبنے سے بچاتے ہیں اور میرے اہلبیت

میری اُمت کو اختلاف سے بچاتے ہیں۔ جب عرب کا کوئی قبیلہ

میرے اہلبیت کی مخالفت کرتا ہے تو اس قبیلے میں پھوٹ پڑ جاتی

ہے اور وہ ابلیس کی جماعت بن جاتا ہے۔

اس لیے شیعوں کا یہ کہنا کہ قرآن اہلبیت ہی سمجھتے ہیں ایسی بات نہیں صبار

اہل سنت دعویٰ کرتے ہیں کہ شیعہ تو جھوٹ بولتے ہیں اور اہلبیت کی محبت میں غلو

کرتے ہیں کیونکہ شیعوں کی تائید میں دلائل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

سُنَّتِ رَسُولٍ - اہل سنت اور اہل تشیع کی نظر میں

سنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر قول، فعل اور تقریر شامل

ہے۔ یہ مسلمانوں کے نزدیک اعتقادات، عبادات اور احکامات کا دوسرا بڑا ماخذ ہے

اے بُرائی اور بری چیز کو جس کہتے ہیں۔ جس کی مختلف اقسام ہیں :- کوئی چیز طبعی طور پر بُری

ہوتی ہے مثلاً مُرَدَّار - یا عقلی طور پر مثلاً جَو - اور یا شرعی طور پر بُری ہوتی ہے مثلاً شرک - (ناشر)

اے یہ حدیث حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے مُستدرک علی الصحیحین جلد ۳ میں بیان کی ہے اور کہا

ہے کہ اس حدیث کی اُستاد صحیح ہیں مگر بخاری اور مسلم نے یہ حدیث روایت نہیں کی۔

اہل سنت والجماعت سنت نبوی کے ساتھ خلفائے راشدین یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کی سنت کا بھی اضافہ کرتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں ایک حدیث ہے کہ
عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمُهَدِّدِينَ
مِنْ بَعْدِي عَصُوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ . ۱۰

اس کی ایک بہت واضح مثال نماز تراویح ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا تھا، مگر سنت عمر کی پیروی میں یہ نماز پڑھتے ہیں۔

بعض اہل سنت والجماعت سنت رسول کے ساتھ سنت صحابہ (تمام صحابہ بغیر کسی تفریق کے) کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں ایک روایت ہے کہ
أَصْحَابِي كَالنَّجْوِمِ يَا أَيُّهَا أَقْدَرُ يَتَمُّ أَهْتَدِي تَتَمُّ

حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں کہ حدیث اصحابی کالنجوم شیعہ حدیث الایمۃ من اہل بیت کالنجوم یا ایہم اقتدیتم اہتدیتم کے مقابلے پر وضع کی گئی ہے۔ شیعہ حدیث کی معقولیت میں تو اس لیے شک نہیں کیونکہ ائمہ اہلبیت علم وزہد اور ورع وتقویٰ کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز تھے۔ ان کے پیروکاروں کو تو چھوڑیے، اس کی گواہی تو ان کے دشمن بھی دیتے ہیں اور پوری تاریخ اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے۔

لیکن حدیث اصحابی کالنجوم ایسی حدیث ہے جسے عقل سلیم قبول نہیں کرتی، کیونکہ صحابہ میں تو وہ لوگ بھی ہیں جو رسول اللہ کے بعد مرتد ہو گئے تھے نیز

۱۰ تم میری سنت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین کی سنت کو دانستوں سے مضبوط پکڑنا۔ (مسند

امام احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۲۶)

۱۱ صحیح بخاری جلد ۵ صفحہ ۹۹ باب مَا يُؤْخَرُ مِنَ الْخُصْبِ وَالْبَشَقَةِ لِأَمْرِ اللَّهِ -

۱۲ میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی پیروی کر دگے ہدایت پا جاوے گے۔ (صحیح مسلم

کتاب فضائل الصحابہ اور مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۹۸)

۱۳ قاضی نعمان بن محمد دعائم الاسلام جلد ۸۶ مطبوعہ دارالمعارف، مصر۔

۱۴ جیسے اہل بدعت جن سے حضرت ابوبکر نے جنگ کی تھی۔

یہ کہ اصحاب بہت سے امور میں ایک دوسرے کے خلاف تھے اور ایک دوسرے میں کھڑے نکالتے تھے، ایک دوسرے پر لعنت کرتے تھے، بلکہ ایک دوسرے کے خلاف لڑتے تھے، حتیٰ کہ بعض صحابہ پر تو شراب نوشی، زنا اور چوری وغیرہ کے الزام میں حد جاری کی گئی تھی۔ ان حالات میں کیسے کوئی عاقل اس حدیث کو قبول کر سکتا ہے جس میں ایسے لوگوں کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور کیسے کوئی امام علی کے خلاف جنگ میں معاویہ کی پیروی کر سکتا ہے جبکہ رسول اللہ نے معاویہ کو اِمَامُ الْفِتْنَةِ الْبَاغِيَّةِ کہا تھا۔ وہ شخص کیسے ہدایت یافتہ ہو سکتا ہے جو عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ اور بشیر بن ابی ارطاة کی پیروی کرے جنہوں نے انہی اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہول کھیلی۔

کوئی بھی باشعور قاری جب حدیث اصحابی کالنجوم پڑھے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ گھڑی ہوتی حدیث ہے۔ کیونکہ اس حدیث کے مخاطب صحابہ ہیں۔ اور رسول اللہ یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ”اے میرے اصحاب! میرے اصحاب کا اتباع کرنا۔“ لیکن دوسری حدیث کہ ”اے میرے اصحاب! ان ائمہ کا اتباع کرنا جو میرے اہلبیت میں سے ہیں کیونکہ میرے بعد وہ تمہاری رہنمائی کریں گے“ بالکل حق ہے۔ اس میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کے متعدد شواہد سنت رسول میں پائے جاتے ہیں۔

شیعہ کہتے ہیں کہ حدیث عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمُهَدِّدِينَ مِنْ بَعْدِي سے مراد ائمہ اثناعشر ہیں۔ ان ہی سے تم شک اور ان ہی کا اتباع، کلام اللہ سے تمسک اور کلام اللہ کے اتباع کی طرح ہے ۱۵

۱۵ جیسے اکثر صحابہ حضرت عثمان پر طعن کرتے تھے، یہاں تک کہ عثمان کو قتل کر دیا گیا۔

۱۶ جیسے معاویہ نے امام علی پر لعنت کرنے کا حکم دیا تھا۔

۱۷ جیسے جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان وغیرہ۔

۱۸ حدیث کہ ”عمارؓ کو باغی گردہ قتل کرے گا۔“

۱۹ صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۸ - صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۶۲ - خصائص امیر المومنین، امام نسائی - کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۴۴ -

مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۸۹ - مسند کمال جلد ۲ صفحہ ۱۳۸ - مرقع محمدی صفحہ ۱۴۸ - طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹۲ -

الطبرانی جلد ۱ صفحہ ۱۳۱ -

میں نے عہد کر رکھا ہے کہ جن روایات سے شیعہ استدلال کرتے ہیں، میں ان میں سے صرف وہی روایات نقل کروں گا جو اہل سنت والجماعت کی صحاح میں پائی جاتی ہیں، ورنہ شیعوں کی کتابوں میں تو اس سے کئی گنا زیادہ احادیث موجود ہیں اور ان کی عبارت بھی زیادہ واضح اور صاف ہے۔

یہ بھی واضح کر دوں کہ شیعہ یہ نہیں کہتے کہ ائمہ اہلبیت کو تشریع کا حق حاصل ہے یا ان کی سنت ان کا اپنا اجتہاد ہے بلکہ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ ائمہ کے بیان کیے ہوئے سب احکام یا تو قرآن سے مانع ہیں یا اس سنت سے جس کی تعلیم رسول اللہ نے امام علیؑ کو دی تھی اور انھوں نے اپنی اولاد کو۔ اس طرح ائمہ کا علم متواتر ہے۔

اس ضمن میں شیعوں کے پاس بہت سے دلائل ہیں جن کی بنیاد ان روایات پر جو علمائے اہل سنت نے اپنی صحاح، مسانید اور تاریخوں میں نقل کی ہیں۔ یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے جو بار بار ذہن میں آتا ہے کہ اہل سنت والجماعت کیوں ان آیات کے مضمون پر عمل نہیں کرتے جو خود ان کے نزدیک صحیح ہیں ؟؟؟

پھر جس طرح اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان قرآن کی تفسیر میں اختلاف ہے اسی طرح ان کے درمیان احادیث کے معانی میں بھی اختلاف ہے۔ مثلاً خلفائے راشدین کے الفاظ آئے ہیں اور اس حدیث کو فریقین نے صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن اہل سنت کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین سے مراد وہ چار خلیفے ہیں جو رسول اللہ کے بعد مسند خلافت پر بیٹھے۔ اور شیعہ کہتے ہیں کہ ان سے مراد بارہ خلفاء ہیں اور وہ ائمہ اہل بیت ہیں۔

یہی اختلاف ان تمام اشخاص کے بارے میں ہے جن کو قرآن یا رسول اللہ نے پاک قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو ان کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ اس کی مثال رسول اللہ

لہ میں صرف ایک مثال دوں گا۔ شیخ صدوقؒ نے اہل الدین میں بسند امام صادق عن ابن عباسؓ

ایک روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

”میرے بعد بارہ امام ہوں گے: پہلے امام علیؑ اور آخری امام قائم ہوں گے“

کا یہ قول ہے کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ اَفْضَلُ مِنْ اَنْبِيَاءِ بَنِي اِسْرَآءِيْلَ (میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے افضل ہیں) یا یہ قول کہ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ (علماء انبیاء کے وارث ہیں)۔

اہل سنت کے نزدیک یہ حدیث عام ہے اور اس کا مصداق سب علمائے امت ہیں۔ جبکہ شیعوں کے نزدیک یہ حدیث صرف بارہ اماموں سے مخصوص ہے اور اسی بنا پر وہ ائمہ اثنا عشر کو اَوَّلُو الْعِزِّمِ انبیاء کو چھوڑ کر سب انبیاء سے افضل قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل کا رجحان بھی اسی تخصیص کی طرف ہے:

اول تو اس لیے کہ کلام الہی کے مطابق قرآن کی تاویل کا علم صرف راستوں فی العزم سے مخصوص ہے۔ اسی طرح قرآن کے علم کا وارث بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے چیدہ و چنیدہ بندوں کو ہی قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تخصیص ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت کو سَفِيْنَةُ النِّجَاةِ - اَيَّمَةُ الْهُدٰى اور مَصَابِيْحُ الدُّجٰى کہا ہے اور وہ ثقَل ثانی قرار دیا ہے جو گمراہی سے بچانے والا ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اہل سنت والجماعت کا قول اس تخصیص کے منافی ہے

جو قرآن اور حدیث نبوی سے ثابت ہے عقل بھی اس قول کو قبول نہیں کرتی کیونکہ اس میں ابہام ہے اس لیے کہ اس میں حقیقی علماء اور بناوٹی علماء میں فرق نہیں کیا گیا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ یہاں وہ علماء بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم جس سے پاک رکھا ہے اور وہ علماء بھی ہیں جنہیں انوی اور عباسی حکمرانوں نے امت پر سوار کر دیا تھا۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دو قسم کے علماء ہیں: ایک وہ جن کو

علم لدنی عطا ہوا ہے۔ اور دوسرے وہ جنہوں نے استادوں سے راہ نجات کی تعلیم حاصل کی۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تاریخ کسی ایسے استاد کا ذکر نہیں کرتی جس سے ائمہ اہلبیت نے تعلیم حاصل کی ہو۔ بجز اس کے کہ بیٹے نے باپ سے علم حاصل کیا ہے۔ اس کے باوجود خود علمائے اہل سنت نے اپنی کتابوں میں ان ائمہ کی علیت کی حیرت انگیز داستانیں بیان کی ہیں خصوصاً امام باقرؑ امام صادقؑ

اور امام رضا سے متعلق۔ امام رضا کا تو ابھی لو کہیں ہی تھا جب انھوں نے اپنی کثرت معلومات سے چالیس قاضیوں کو مبہوت کر دیا تھا جنھیں مامون نے ان کے مقابلے کے لیے جمع کیا تھا۔

اسی سے یہ راز بھی آشکارا ہو جاتا ہے کہ سنتوں کے مذاہب اربعہ کے اماموں میں تو ہر مسئلے میں اختلاف ہے اور اہل بیت کے بارہ اماموں میں کسی ایک مسئلے میں بھی اختلاف نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر اہل سنت کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ آیات اور احادیث بلا امتیاز سب علمائے اُمت کے بارے میں ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ آراء اور مذاہب کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ شاید علمائے اہل سنت نے اپنی رشتے کی اسی کمزوری کو بھانپ لیا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے عقیدے کی تفریق سے بچنے کی خاطر ائمہ اربعہ کے وقت سے ہی اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا۔

اس کے برعکس، شیعوں کا نظریہ اتفاق اور ان ائمہ سے وابستگی کی دعوت تیار جنھیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے خصوصی طور پر ان سب علوم و معارف سے نوازا ہے جن کی ہر زمانے میں مسلمانوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اب یہ کسی مذہبی کی مجال نہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے کوئی غلط بات منسوب کر کے کسی نئے مذہب کی بنیاد ڈالے اور لوگوں کو اس کے اتباع پر مجبور کرے۔

اس مسئلے میں شیعہ، سنی اختلاف کی نوعیت بالکل وہی ہے جو ہندی موعود سے متعلق احادیث کے بارے میں ان کے اختلاف کی ہے۔ ہندی موعود سے متعلق حدیث کی صحت کے دونوں فریق قائل ہیں۔

شیعوں کے یہاں ہندی کی شخصیت معلوم ہے۔ یہ بھی علم ہے کہ ان کے باپ دادا کون ہیں۔ لیکن اہل سنت کے خیال میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں کہ ہندی کون صاحب ہوں گے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ آخری زمانے میں پیدا ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک

بہت سے لوگ مہدی ہونے کا دعویٰ کر چکے ہیں۔ خود ہادی نے کہا کہ وہ مہدی منتظر ہیں۔ یہ بات انھوں نے میرے یہاں کہی جو اس وقت ان کا مرید تھا بعد میں شیعہ ہو گیا۔

بہت سے اہل سنت اپنے بچے کا نام مہدی اس امید میں رکھتے ہیں کہ سید وہی امام منتظر و موعود ہو۔ لیکن شیعوں کے یہاں یہ ممکن ہی نہیں کہ اب پیدا ہونے والا کوئی شخص ایسا دعویٰ کر سکے۔ کچھ لوگ اپنے بچوں کا نام مہدی برکت کے لیے ضرور رکھتے ہیں جیسے بعض لوگ اپنے بیٹے کا نام محمد یا احمد یا علی رکھتے ہیں۔ شیعوں کے نزدیک مہدی کا ظہور خود ایک معجزہ ہے کیونکہ وہ اب سے بارہ سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے، اس کے بعد غائب ہو گئے۔ اس طرح شیعہ خود بھی آرام سے ہو گئے اور انھوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے بھی راستہ بند کر دیا۔

اسی طرح بہت سی صحیح احادیث کے معنی میں بھی شیعوں اور سنیوں کے درمیان اختلاف ہے۔ حتیٰ کہ ایسی احادیث کے معنی میں اختلاف ہے جن کا تعلق اشخاص سے نہیں مثلاً ایک حدیث ہے:

اِخْتِلَافُ اُمَّتِي رَحْمَةٌ

سننی کہتے ہیں: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی فقہی مسئلے میں فقہاء کے مابین اختلاف مسلمان کے لیے رحمت ہے کیونکہ اس طرح وہ مسئلہ کا وہ حل اختیار کر سکتا ہے جو اس کے حالات کے مناسب ہو اور اسے پسند ہو۔ مثلاً اگر کسی مسئلہ میں امام مالک کا فتویٰ سخت ہو تو وہ مالکی ہونے کے باوجود امام ابوحنیفہ کی تقلید کر سکتا ہے اگر اسے ان کا مذہب سہل اور آسان معلوم ہو۔

مگر شیعہ اس حدیث کا مطلب کچھ اور بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں روایت ہے کہ جب امام صادق علیہ السلام سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے کہا کہ رسول اللہؐ نے صحیح فرمایا۔ سائل نے پوچھا کہ اگر اختلاف رحمت ہے تو کیا اتفاق مصیبت ہے؟ امام صادقؑ نے کہا: نہیں! یہ بات نہیں، تم غلط راستے پر چل پڑے اور اکثر لوگ اس حدیث کا مطلب غلط سمجھتے ہیں۔ رسول اللہؐ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حصول علم کے لیے ایک دوسرے کے پاس جانا اور سفر کرنا رحمت ہے۔ آپ نے

اپنے قول کی تائید میں یہ آیت پڑھی :

”قُلْ لَا نَفَرٌ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لَّيْسَتْ فَرَقُهُمْ
فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ
يَحْذَرُونَ“

ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر جماعت میں سے ایک گروہ تحصیل علم کے لیے
نکلا کرے تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرے، پھر اپنی قوم کے لوگوں کے
پاس واپس آکر ان کو ڈراتے۔ کیا عجب کہ وہ غلط کاموں سے بچیں لے
پھر فرمایا کہ اگر لوگ دین میں اختلاف کریں گے تو وہ شیطانی جماعت بن
جاتیں گے۔

جیسا کہ ظاہر ہے، یہ تفسیر اطمینان بخش ہے کیونکہ اس میں عقائد میں اختلاف
کے بجائے اتحاد کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ نہیں کہ لوگ جماعتوں اور گروہوں میں بٹ جاتیں
ایک اپنی رلنے کے مطابق کسی چیز کو حلال قرار دے تو دوسرا اپنے قیاس کی بنا پر اسی چیز
کو حرام قرار دے دے۔ ایک اگر کراہت کا قائل ہو تو دوسرا استحباب کا اور تیسرا وجوب کا یہ
عربی زبان میں دو مختلف ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں :

اِخْتَلَفْتُ إِلَيْكَ اور اِخْتَلَفْتُ مَعَكَ .
دونوں کے معنی میں واضح فرق ہے۔ اِخْتَلَفْتُ إِلَيْكَ کے معنی ہیں : میں تیرے
پاس آیا۔ اور اِخْتَلَفْتُ مَعَكَ کے معنی ہیں : میں نے تیری رلنے سے اختلاف کیا۔
اس کے علاوہ اہل سنت والجماعت نے حدیث کا جو مفہوم اختیار کیا ہے وہ اس
لحاظ سے بھی نامناسب ہے کہ اس میں اختلاف اور تفرقہ کی دعوت ہے جو قرآن کریم کی اس
تعلیم کے منافی ہے جس میں اتحاد و اتفاق اور ایک مرکز پر جمع ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

۱۲۲۔ سورۃ توبہ آیت ۱۲۲۔

۱۲۔ مالکیوں کے نزدیک نماز میں بسم اللہ پڑھنا مکروہ ہے۔ شافعیوں کے نزدیک واجب ہے۔ حنفیوں
۱۳۔ حنفیوں کے نزدیک مستحب ہے مگر کہتے ہیں کہ جہری نماز میں بھی آہستہ پڑھی جاتے ہیں۔

وَلَا تِلْكَ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ

اور یہ تمہاری امت ایک امت ہے اور میں تمہارا پروردگار
ہوں اس لیے مجھ سے ڈرتے رہو۔ (سورۃ مومنون - آیت ۵۲)

وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور نا اتفاق نہ کرو۔
(سورۃ آل عمران - آیت ۱۰۳)

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ

آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ ناکام رہو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ
(سورۃ انفال - آیت ۴۶)

جلتے گی۔
اس سے بڑھ کر اور کیا پھوٹ اور تفرقہ ہوگا کہ اُمت واحدہ ایسے مختلف فرقوں

اور گروہوں میں بٹ جائے جو ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہوں، ایک دوسرے کا مذہب
اڑاتے ہوں بلکہ ایک دوسرے کو کافر کہتے ہوں یہاں تک کہ ایک دوسرے کا خون بہانا
جائز سمجھتے ہوں۔ یہ کوئی خیال بات نہیں بلکہ مختلف ادوار میں فی الواقع ایسا ہوتا رہا ہے
جس کی سب سے بڑی گواہ تاریخ ہے اور اُمت میں پھوٹ کے اسی انجام سے خود اللہ

تعالیٰ نے ڈرایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ
مَا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو دلائل آجانے کے باوجود آپس
میں بٹ گئے اور ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے۔

(سورۃ آل عمران - آیت ۱۰۵)

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا أَلَسْتُ مِنْهُمْ
فِي شَيْءٍ

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ درگروہ
بٹ گئے ان سے تم کو کچھ کام نہیں۔ (سورۃ انفال - آیت ۱۶۰)

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا أَلَسْتُ مِنْهُمْ
فِي شَيْءٍ

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ درگروہ
بٹ گئے ان سے تم کو کچھ کام نہیں۔ (سورۃ انفال - آیت ۱۶۰)

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا أَلَسْتُ مِنْهُمْ
فِي شَيْءٍ

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ درگروہ
بٹ گئے ان سے تم کو کچھ کام نہیں۔ (سورۃ انفال - آیت ۱۶۰)

وَكَاثُوا شَيْعًا. كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ.

مشرکوں میں سے نہ بن جاؤ اور نہ ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقے فرقے ہو گئے۔ سب فرقے اسی سے خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔ (سورہ روم - آیت ۳۲-۳۱)

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ لفظ شیعہ سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ ایک سادہ لوح شخص نے سمجھا تھا جو ایک دفعہ میرے پاس آکر مجھے نصیحت کرنے لگا: ”بھائی جان! خدا کے واسطے ان شیعوں کو چھوڑیے، اللہ ان سے نفرت کرتا ہے اور اس نے اپنے رسولؐ کو متنبہ کیا تھا کہ ان کے ساتھ نہ ہوں“ میں نے کہا: یہ کیسے؟

اس نے یہ آیت پڑھ دی: إِنَّ الَّذِينَ فَزَعُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شَيْعًا لَسْتُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ.

میں نے اسے سمجھانے کی بہتری کوشش کی کہ شیعہ کے معنی ہیں گروہ، جماعتیں پارٹیاں۔ اس کا شیعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ شیعہ کا لفظ تو اچھے معنی میں آیا ہے مثلاً: وَإِنَّ مِنْ شَيْعَتِهِ لِابْنِ هَنِيْمٍ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ.

یا حضرت موسیٰؑ کے قصے میں آیا ہے کہ

فَوَجَدَ فِيهِ رَجُلَيْنِ يَخْتَلِمَانِ هَذَا مِنْ شَيْعَتِهِ وَهَذَا مِنْ عَدُوِّهِ.

مگر افسوس! یہ شخص کسی طرح میری بات مان کر نہ دیا کیونکہ اسے تو مسجد کے امام صاحب نے شیعوں کے خلاف سکھا پڑھا دیا تھا۔ پھر وہ کوئی اور بات کیوں سنتا؟ اب میں اصل موضوع کی طرف پلٹتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں شیعہ ہونے سے پہلے سخت شش و پنج میں تھا۔ جب میں یہ حدیث پڑھتا تھا کہ اخْتَلَفَ أَقْبَتِي رَحْمَةً اور اس کا مقابلہ اس دوسری حدیث سے کرتا تھا جس میں آیا ہے کہ میری امت بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جو ایک کو چھوڑ کر سب جہنم میں جاویں گے۔ یہ تو میں دل ہی دل

لے سنن ابن ماجہ کتاب الفتن جلد ۲ - مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۲۰ - جامع ترمذی کتاب الايمان -

میں حیران ہوتا تھا کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو امت کا اختلاف ہو اور ساتھ ہی وہ دخول جہنم کا موجب بھی ہو؟؟

پھر جب میں نے اس حدیث کی وہ تشریح پڑھی جو امام جعفر صادقؑ نے کی ہے تو میری حیرت دور ہو گئی کیونکہ معاملہ ہو گیا تھا۔ اس وقت میں سمجھا کہ ائمہ اہل بیتؑ واقعی بہترین رہنما، اندھیروں میں چراغ اور صحیح معنی میں قرآن و سنت کے ترجمان ہیں۔ جب ہی تو رسول اللہؐ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

مَثَلُ أَهْلِ بَيْتِي فِيكُمْ كَسَفِينَةٍ نُوحٍ مِّن رَّكِبِهَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ. لَا تَتَقَدَّمُوهُمْ فَتَهْلِكُوا وَلَا تَتَخَلَّفُوا عَنْهُمْ فَتَهْلِكُوا، وَلَا تَعْلَمُوهُمْ فَإِنَّهُمْ أَعْلَمُ مِنْكُمْ.

میرے اہل بیت کی مثال سفینہ نوحؑ کی سی ہے جو اس پر سوار ہو گیا نچ گیا اور جو اس سے پچھڑ گیا ڈوب گیا۔ ان سے نہ تو آگے نکلو نہ ان سے پیچھے رہو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ انہیں کچھ سکھانے کی کوشش نہ کرو کہ وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ امام علیؑ نے بھی ان کے حق میں فرمایا ہے:

”اپنے نبی کے اہل بیت پر نظر جماتے رکھو، ان ہی کے رخ پر ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہو وہ تمہیں راستے سے بھٹکنے نہیں دیں گے نہ تمہیں کسی گڑھے میں گرنے دیں گے۔ اگر وہ کہیں ٹھہریں تو تم بھی ٹھہر جاؤ اور اگر وہ اٹھیں تو تم بھی اٹھ کھڑے ہو۔ ان سے لگے نہ نکلو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے اور نہ ان سے پیچھے رہو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔“

ایک اور خطبے میں اہل بیتؑ کی قدر و منزلت بیان کرتے ہوئے امام

۱۔ صواعق خرقہ ابن حجر عسقلانی مکی۔ جامع الصغیر بیوطی جلد ۲ صفحہ ۱۵۔ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۲۰۔ ۲۔ نوح السلاطین خطبہ ۹۵۔

علیؑ نے فرمایا: ”وہ علم کی زندگی اور جہالت کی موت ہیں۔ ان کا علم ان کے علم کی اور ان کا ظاہر ان کے باطن کی خبر دیتا ہے۔ ان کی خاموشی ان کی عاتلانہ گفتگو کی غمازی کرتی ہے۔ وہ نہ حق کے خلاف کرتے ہیں اور نہ امر حق میں اختلاف کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے ستون ہیں۔ تعلق مع اللہ ان کی فطرت ہے۔ ان کی دجہ سے حق کا بول بالا ہوا، باطل کی جڑیں کٹ گئیں اور اس کی زبان گدھی سے کھینچ گئی ان کے پاس وہ عقل ہے کہ انھوں نے دین کو سمجھا اور برتا، نہیں کہ سنا اور بیان کر دیا۔ علم کو بیان کرنے والے بہت ہیں اور اسے سمجھنے اور برتنے والے کم ہیں“ لے

جی ہاں سچ فرمایا امام علیؑ نے، کیونکہ وہ شہر علم کا دروازہ ہیں۔ بڑا فرق ہے اس عقل میں جو دین کو سمجھتی اور برتی ہے اور اس عقل میں جو منہ پی اور بیان کر دیتی ہے۔ سننے اور بیان کر دینے والے بہت ہیں۔ کتنے صحابہ ہیں جنہیں رسول اللہ ص کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہے۔ وہ احادیث سنتے تھے اور بغیر سمجھے بوجھے نقل کر دیتے تھے جس سے حدیث کے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے تھے بلکہ بعض دفعہ تو مطلب بالکل اٹھا ہو جاتا تھا یہاں تک کہ صحابی کے سخن شناس نہ ہونے اور اصل مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے بات کفر تک جا پہنچی۔

لیکن جو علم پر پوری طرح حاوی ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ آدمی اپنی پوری

لے شیخ البلاغہ خطبہ ۲۳۶ -

لے اس کی مثال ابو ہریرہ کی یہ روایت ہے کہ إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ۔ اس کی وضاحت امام جعفر صادقؑ نے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ ص نے سنا کہ دو آدمی ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ ایک نے کہا: تیری شکل پر بھٹکا اور تیرے جیسی جس کی شکل ہو اس پر بھی بھٹکا۔ اس پر رسول اللہ ص نے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ۔ مطلب یہ کہ اس کی شکل تو حضرت آدم جیسی ہے۔ گویا تو حضرت آدم کو گالی دے رہا ہے کیونکہ اُن کی شکل اس جیسی تھی۔

عمر تحصیل علم میں صرف کر دیتا ہے لیکن بسا اوقات اسے بہت ہی کم علم حاصل ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ وہ علم کی کسی ایک شاخ یا کسی ایک فن میں مہارت حاصل کر پاتا ہے لیکن علم کی تمام شاخوں پر حاوی ہو جانا یہ بالکل ناممکن ہے مگر جیسا کہ معلوم ہے ائمہ اہل بیت مختلف علوم سے مکاتفہ واقف تھے اور ان میں مہارت رکھتے تھے۔ اس چیز کو امام علیؑ نے ثابت کر دیا تھا جس کی شہادت مؤرخین نے بھی دی ہے۔ اسی طرح امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے ہزاروں علماء کو مختلف علوم میں تلمذ حاصل تھا، جیسے فلسفہ، طب، اکیمیا اور طبیعیات وغیرہ۔

شیعہ اور سنی عقائد

جس بات سے مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ شیعہ امامیہ ہی نجات پانے والا فرقہ ہے، وہ یہ ہے کہ شیعہ عقائد فراخ دلانہ، آسان اور ہر موشمند اور باذوق شخص کے لیے قابل قبول ہیں۔ شیعوں کے یہاں ہر مسئلے اور ہر عقیدے کی مناسب اور اطمینان بخش وضاحت موجود ہے جو ائمہ اہل بیت میں سے کسی نہ کسی سے منسوب ہے جب کہ ممکن ہے کہ ایسی کافی وشافی وضاحت اہل سنت اور دوسرے فرقوں کے یہاں نہ مل سکے۔

میں اس فصل میں فریقین کے بعض اہم عقائد کے بارے میں گفتگو کروں گا اور کوشش کروں گا کہ ان کے متعلق اپنی سوچی سمجھی رائے ظاہر کروں۔ قارئین کو آزادی اور اختیار ہے کہ وہ میری رائے کو مانیں یا نہ مانیں، مجھ سے اتفاق کریں یا اختلاف۔

میں یہاں اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ بنیادی عقیدہ سب مسلمانوں کا ایک ہے۔ سب مسلمان اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے رسولوں میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔

اسی طرح سب مسلمان اس پر متفق ہیں کہ جہنم حق ہے، جنت حق ہے، اللہ سب مردوں کو زندہ کرے گا اور انھیں محشر میں حساب کتاب کے لیے جمع کرے گا۔

اسی طرح قرآن پر بھی اتفاق ہے اور سب کا ایمان ہے کہ حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ سب کا قبلہ ایک ہے، ان کا دین ایک ہے، لیکن ان عقائد کے مفہوم میں اختلاف ہو گیا۔ اور اس طرح یہ عقائد مختلف کلامی

فقہی اور سیاسی مکاتب فکر کی جولان گاہ بن گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق فریقین کا عقیدہ

اس سلسلے میں ایک اہم اختلاف رویت باری تعالیٰ کے متعلق ہے۔ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ جنت میں سب مومنین کو رویت باری تعالیٰ نصیب ہوگی۔ ان کی حدیث کی مستند کتابوں مثلاً بخاری اور مسلم وغیرہ میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ یہ رویت مجازی نہیں بلکہ حقیقی ہوگی۔ بلکہ ان میں ایسی روایات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے گویا خدا انسانوں کے مشابہ ہے، وہ ہنستا ہے، اُٹھتا جاتا ہے، چلتا پھرتا ہے اور ساتویں آسمان سے پہلے آسمان پر اُترتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پنڈلی کھوتا ہے جس پر شناختی علامت بنی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ جب وہ اپنا ایک پاؤں دوزخ میں رکھے گا تو دوزخ بھر جائے گی۔ غرض ایسی باتیں اور ایسے اوصاف حق تعالیٰ سے منسوب کیے گئے ہیں جن سے وہ پاک اور منزہ ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار کینیا (مشرقی افریقہ) کے شہر لاموسے میرا گزر ہوا۔ وہاں مسجد میں ایک دہائی امام صاحب نمازیوں کو خطاب کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں، دو پاؤں ہیں، دو آنکھیں اور چہرہ ہے۔ جب میں نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے اپنی تائید میں قرآن کی کچھ آیات پڑھیں، فرمایا:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۷۷-جلد ۵ صفحہ ۱۷۸ اور جلد ۶ صفحہ ۳۳-

۲۔ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۲۵-جلد ۵ صفحہ ۲۸۰، ۲۷۷-صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۱۲، ۱۲۲-

۳۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۹۷-۱۹۸ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۸۲-

۴۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۸۷، ۲۰۲ سے ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ہاتھ اور انگلیاں ہیں۔

نوٹ: واضح ہو کہ یہ تو خدا کو حادث ماننا ہوا جبکہ وہ قدیم ہے۔ (ناشر)

وَلَعَنُوا إِبْرَاهِيمَ قَالَوْا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ ...

یہود کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ تو بندھا ہوا ہے۔ بندھیں ان کے ہاتھ! اور لعنت ہوں پر یہ بات کہنے کی وجہ سے۔ اللہ کے ہاتھ تو کھلے ہیں۔

اس کے بعد دو آیتیں اور پڑھیں:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا

ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بناؤ۔

اور: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَإِنْ وَيَبْقَى وَجْهٌ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ

وَالْإِكْرَامِ۔

جو مخلوق بھی زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے اور تمہارے

پروردگار کا چہرہ جو صاحب جلال و عظمت ہے باقی رہے گا۔

میں نے کہا: بھائی صاحب! جو آیات آپ نے پڑھی ہیں مجاز ہیں حقیقت میں نہیں۔

کہنے لگے سارا قرآن حقیقت ہے اس میں مجاز کچھ نہیں۔

اس پر میں نے کہا: پھر اس آیت کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں:

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى

کیا آپ آیت کو اس کے حقیقی معنی میں لیں گے؟ کیا واقعی دنیا میں جو بھی اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا؟

امام صاحب نے جواب دیا: ہم اللہ کے ہاتھ، اللہ کی آنکھ اور اللہ کے

چہرے کی بات کر رہے ہیں، اندھوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں۔ (فکر جس جوہر کی انتہا

ملاحظہ ہو۔)

میں نے کہا: اچھا اندھوں کو چھوڑیے! آپ نے جو آیت ابھی پڑھی ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَإِنْ وَيَبْقَى وَجْهٌ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

آپ کیسے کریں گے؟

امام صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا: کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو اس

آیت کا مطلب نہ سمجھتا ہو؟ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ یہ بالکل ویسی ہی آیت ہے جیسی کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ۔

میں نے کہا: آپ نے اور بھی گڑبڑ کر دی۔ بھائی صاحب میرا آپ کا اختلاف قرآن کے بارے میں ہے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں مجاز نہیں سب حقیقت ہے، میں کہتا ہوں مجاز بھی ہے خصوصاً ان آیات میں جن سے تجسیم یا تشبیہ کا شبہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اپنی رے پر اصرار ہے تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاتھ پاؤں اور اس کا پورا جسم فنا ہو جائے گا اور صرف چہرہ باقی بچے گا۔ (نمود پالندہ) پھر میں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا: کیا آپ کو یہ تفسیر منظور ہے؟

پورے مجمع پر سکوت طاری ہو گیا اور امام صاحب کو بھی ایسی چپ لگ گئی جیسے منہ میں گھٹا گھٹیاں بھری ہوں۔ میں انھیں رخصت کر کے یہ دعا کرتا ہوا چلا آیا کہ اللہ انھیں نیک ہدایت کی توفیق دے۔

جی ہاں! یہ ہے ان کا عقیدہ جو ان کی معتبر کتابوں میں اور جو ان کے مواعظ و خطبات میں بیان کیا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کچھ علمائے اہل سنت اس کے انکاری نہیں ہیں لیکن اکثریت کو یقین ہے کہ آخرت میں اللہ کا دیدار ہوگا اور وہ اس کو اسی طرح دیکھیں گے جس طرح چودھویں کا چاند دیکھتے ہیں۔ ان کا استدلال اس آیت سے ہے:

وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاطِرَةٌ۔^۱
کچھ چہرے اس دن ہشاش بشاش اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

جیسے ہی آپ کو اس بارے میں شیعوں کا عقیدہ معلوم ہوگا آپ کے دل کو اطمینان ہو جائے گا اور آپ کی عقل اسے تسلیم کر لے گی۔ کیونکہ شیعہ ان قرآنی آیات کی جن میں

۱۔ سورۃ قیامت - آیت ۲۲ - اَمْ اَنْتُمْ اَنْبِیَآءُ لَمْ يَخْلُقْكُمْ اَوْ لَكُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ الرَّبِّ الَّذِیْ یُحْیِیْ الْمَوْتِ الَّذِیْ فُتِنَ بِهِ النَّاسُ۔^۲ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے کی تفسیر یہ کی ہے کہ اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار ہوں گے۔

تجسیم یا تشبیہ کا شبہ ہوتا ہے تاویل کرتے ہیں اور انھیں مجاز پر محمول کرتے ہیں، حقیقت پر نہیں۔ اور وہ مطلب نہیں لیتے جو ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، یا جیسا بعض دوسرے لوگ سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے میں امام علی علیہ السلام کہتے ہیں:

”ہمت کتنی ہی بلند پروازی سے کام لے اور عقل کتنی ہی گہرائی میں غوطے لگائے، اللہ کی ذات کا ادراک ناممکن ہے۔ اس کی صفات کی کوئی حد نہیں اور نہ اس کی تعریف ممکن ہے نہ اس کا وقت متعین ہے اور نہ زمانہ مقرر ہے۔“

امام محمد باقر علیہ السلام تجسیم الہی کی تردید کرتے ہوئے کتنی فلسفیانہ، علمی، نازک اور چچی ملی بات کہتے ہیں:

”ہم چاہے جس چیز کا تصور ذہن میں لائیں اور اس کے بارے میں جتنا بھی سوچیں ہمارے ذہن میں جو بھی تصویر ابھرے گی وہ ہماری طرح کی مخلوق ہوگی۔“

جو عقل میں گھر گیا لانا نہیں کیوں کر ہوا

جو سمجھ میں آ گیا، وہ خدا کیوں کر ہوا

(الکبر الابدادی)

تجسیم اور تشبیہ کی رد میں، ہمارے لیے تو اللہ پاک کا اپنی کتاب محکم میں یہ قول کافی ہے:

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ اَوْ لَا تُدْرِکُهٗ الْاَبْصَارُ۔

اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ اور۔ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔

جب حضرت موسیٰؑ نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور کہا: رَبِّ اَرِنِّیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ تو جواب ملا لَنْ تَرٰنِیْ تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ اور بقول زکریاؑ

۱۔ نبی البلاغہ۔ پہلا خطبہ

۲۔ عقائد امامیہ۔ شیخ مظفر۔ یہ کتاب جامعہ تعینات اسلامی نے مکتب شیعہ کے نام سے شائع کی ہے۔

لَنْ کے مفہوم میں تائید شامل ہے۔ یعنی ابد تک کبھی بھی نہیں دیکھ سکو گے۔
یہ سب شیعہ اقوال کی صحت کی دلیل قاطع ہے۔ بات یہ ہے کہ شیعہ ائمہ
اہل بیت کے اقوال نقل کرتے ہیں جو سرچشمہ علم تھے اور جنہیں کتاب اللہ کا علم
میراث میں ملا تھا۔

جو شخص اس موضوع سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہے وہ اس موضوع
پر مفصل کتابوں کی طرف رجوع کرے۔ مثلاً المرآۃ البصائر کے مولف سید شرف الدین عاملی
کی کتاب کلمۃ حول التزویر۔

نبوت کے بارے میں فریقین کا عقیدہ

نبوت کے بارے میں شیعہ شنتی اختلاف کا موضوع عصمت کا مسئلہ ہے شیعہ
اس کے قائل ہیں کہ انبیاء بعثت سے قبل بھی معصوم ہوتے ہیں اور بعثت کے بعد بھی۔
اہل سنت کہتے ہیں کہ جہاں تک کلام اللہ کی تبلیغ کا تعلق ہے، انبیاء بے شک معصوم
ہیں لیکن دوسرے معاملات میں وہ عام انسانوں کی طرح ہیں۔ اس بارے میں حدیث
کی کتابوں میں متعدد روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے کئی
موقعوں پر غلط فیصلہ کیا اور صحابہ نے آپ کی اصلاح کی۔ جیسا کہ جنگ بدر کے قیدیوں
کے معاملے میں ہوا جہاں اللہ کے رسول کی رلے درست نہیں تھی اور عمر کی راتے
صحیح تھی۔

اسی طرح جب رسول اللہ مدینہ آئے تو آپ نے وہاں لوگوں کو دیکھا کہ
کھجور کے درخت میں گامبھا دے رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: گامبھا دینے کی ضرورت
نہیں، ایسے بھی کھجوریں لگیں گی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ لوگوں نے آپ سے آکر شکایت
کی تو آپ نے کہا: تم اپنے دنیا کے کاموں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ ایک اور روایت
میں ہے کہ آپ نے کہا: میں بھی انسان ہوں، جب میں تمہیں دین کی کوئی بات
بتاؤں تو اس پر ضرور عمل کرو۔ مگر جب میں کسی دنیاوی معاملے میں اپنی رلے دوں

تو میں محض انسان ہوں۔

یہ بھی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ پر جادو کیا گیا، جادو کے اثر سے آپ
کو یہ نہیں پتہ چلتا تھا کہ آپ نے کیا کیا۔ بعض دفعہ یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ نے ازواج
سے صحبت کی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا تھا یا کسی اور کام کے متعلق خیال
ہوتا تھا کہ یہ کام کیا ہے مگر دراصل وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا یا اہل سنت کی
ایک اور روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ کو نماز میں سہو ہو گیا۔ یہ یاد نہیں رہا کہ کتنی
رکعتیں پڑھی ہیں یا ایک دفعہ آپ نماز میں بے خبر سو گئے، یہاں تک کہ لوگوں نے
آپ کے خڑے کی آواز سنی، پھر جاگ گئے اور وضو کی تجدید کے بغیر نماز پوری کی۔
اہل سنت یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ بعض دفعہ کسی پر بلا وجہ ناراض ہو جاتے،
اسے برا بھلا کہتے اور اس کو لعنت ملامت کرتے تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا: یا الہی!
میں انسان ہوں، اگر میں کسی مسلمان کو لعنت ملامت کروں یا برا بھلا کہوں تو تو اسے
اُس کے لیے رحمت بنا دے۔

اہل سنت کی ایک اور روایت ہے کہ ایک دن آپ حضرت عائشہ کے گھر
میں لیٹے ہوئے تھے اور آپ کی ران کھلی ہوئی تھی، اتنے میں ابوبکر آئے، آپ
اسی طرح لیٹے ہوئے ان سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد عمر آئے تو آپ ان سے
بھی اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ جب عثمان نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو آپ اٹھ کر
بیٹھ گئے اور کپڑے ٹھیک کر لیے۔ جب عائشہ نے اس بارے میں پوچھا تو آپ نے
کہا: میں کیوں نہ اُس شخص سے جاکردں جس سے ملا نہ کہ بھی شرماتے ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم کتاب الفضائل جلد ۷ صفحہ ۹۵۔ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۱۶۲ صفحہ ۱۵۲۔

۲۔ صحیح بخاری جلد ۷ صفحہ ۲۹۔

۳۔ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۶۸۔

۴۔ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۲۳۔

۵۔ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۳۷ و صفحہ ۴۴ و صفحہ ۱۷۱۔

۶۔ سنن دارمی کتاب الرقاق۔ ۷۔ صحیح مسلم باب فضائل عثمان جلد ۷ صفحہ ۱۱۷۔

اہل سنت کے ہاں ایک روایت یہ بھی ہے کہ رَمَضان المبارک میں آپ
جُنُب ہوتے تھے اور صبح ہو جاتی تھی اور آپ کی نماز فوت ہو جاتی تھی لیہ
اسی طرح اور جھوٹ ہیں جن کو نہ عقل قبول کرتی ہے، نہ دین اور نہ شرف
اس کا مقصد رسول اللہ کی توہین کرنا اور آپ کی شان میں گستاخی کے سوا اور کیا
ہو سکتا ہے۔ اہل سنت ایسی باتیں رسول اللہ سے منسوب کرتے ہیں جو خود اپنے سے
منسوب کرنا پسند نہیں کرتے۔

اس کے برخلاف شیعہ ائمہ اہلبیت کے اقوال سے استدلال کرتے ہوئے انبیاء
کو ان تمام لغویات سے پاک قرار دیتے ہیں خصوصاً ہمارے نبی محمد علیہ افضل الصلوة
وَاٰزكى السَّلام کو۔

شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرت تمام خطاؤں، لغزشوں اور گناہوں سے پاک ہیں
چاہے وہ گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اس طرح آپ پاک ہیں ہر غلطی اور جھوٹ چوک
سے، جادو کے اثر سے اور ہر اس چیز سے جس سے عقل متاثر ہوتی ہو۔ آپ پاک ہیں
ہر اس چیز سے جو شرافت اور اخلاق حمیدہ کے مُنافی ہو جیسے راستے میں کچھ کھانا یا
ٹھٹھا مارنا یا ایسا مذاق کرنا جس میں جھوٹ کی آمیزش ہو۔ آپ پاک ہیں ہر اس
فعل سے جو عقلاء کے نزدیک ناپسندیدہ ہو یا عُرف عام میں اچھا نہ سمجھا جاتا ہو۔
چہ جائیکہ آپ دُوسروں کے سامنے اپنا رخصسار بوی کے رخصسار پر رکھیں اور اس کے ساتھ
حبشیوں کا ناچ دیکھیں یا بوی کو کسی جگہ کے موقع ساتھ لے کر جائیں اور وہاں
اس کے ساتھ دوڑ لگائیں کہ کبھی وہ آگے نکل جاتے اور کبھی آپ اور اس پر آپ
کہیں کہ ”یہ اُس کے بدلے میں“

شیعہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی ساری روایات جو عصمتِ انبیاء سے متناقض
ہیں اُمویوں اور ان کے حامیوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ مقصد ان کے دو ہیں :

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۳۲-۲۳۳ (نوٹ: یہ اور ایسی بے شمار روایتیں راجحہ اور غلط
رشتہ ملعون کو SATANIC VERSES اور مشرقین کو تنگ رسول کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں۔) (ناشر)
۲۔ صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۲۲۸ - ۲۲۹ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۷۵

ایک تو رسول اللہ کی عزت و توقیر کو کم کرنا تاکہ اہل بیت کی وقعت کو گھٹایا
جاسکے۔ دُوسرے اپنے ان افعالِ بد کے لیے وجہ جواز تلاش کرنا جن کا ذکر تاریخ میں ہے۔
اب اگر رسول اللہ بھی غلطیاں کرتے تھے اور خواہشاتِ نفسانی سے متاثر ہوتے تھے
جیسا کہ اس قصے میں بیان کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب زینب بنت جحش ابھی
زید بن حارثہ کے نکاح میں تھیں، آپ انھیں بالوں میں گنگھی کرتے ہوئے دیکھ کر ان
پر زلیفہ ہونگے تھے، اس وقت آپ کی زبان سے نکلا تھا : سُبْحَانَ اللَّهِ مُقَدِّسًا
الْقُلُوبِ

ایک اور سنی روایت کے مطابق آپ کی طبیعت کا زیادہ جھکاؤ حضرت
عائشہ کی طرف تھا اور بقیہ ازواج کے ساتھ ویسا سلوک نہیں تھا۔ چنانچہ ازواج نے
ایک دفعہ حضرت فاطمہ زہرا کو اور ایک دفعہ زینب بنت جحش کو عدل کا مطالبہ
کرنے کے لیے آپ کے پاس اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا

اگر خود رسول اللہ کی یہ حالت ہو تو معاویہ بن ابی سفیان، مروان بن حکم، عمرو
بن عاص، یزید بن معاویہ اور ان تمام اُموی حکمرانوں کو کیا الزام دیا جاسکتا ہے جنہوں
نے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا اور بے گناہوں کو قتل کیا۔ بقول شخصے، اگر گھر کا مالک ہی
طلہ بجا رہا ہو تو اگر نیچے ناپچنے لگیں تو اُن کا کیا قصور !

ائمہ اہلبیت جو شیعوں کے ائمہ ہیں وہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم
کی عصمت کے قائل ہیں اور ظاہر ہے کہ گھر والوں سے زیادہ گھر کا حال کون جان سکتا
ہے، اسی لیے وہ ان تمام آیاتِ قرآنی کی تاویل کرتے ہیں جن سے بظاہر یہ سمجھ میں
آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو عتاب کر رہا ہے جیسے عَبَسَ وَتَوَلَّى یا جن سے گناہوں
کے اقرار کا مفہوم نکلتا ہے جیسے لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ
یا ایک دُوسری آیت لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ يَا عِزَّةُ اللَّهِ عَنْكَ لِمَ
أَذْنَتْ لَهُمْ

۱۔ تفسیر جلالین وَتُخْفَى فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ کی تفسیر کی ذیل میں۔

۲۔ صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۱۳۶ باب فضائل عائشہ۔

ان تمام آیات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت مجروح نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ بعض آیات آپ سے متعلق ہی نہیں ہیں اور بعض آیات ظاہری الفاظ پر محمول نہیں ہیں بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے مجازاً کہا گیا ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے: "اے پڑوسن سن لے یہ بات تیرے لیے ہے۔" مجاز کا استعمال عربی زبان میں کثرت سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس کا استعمال قرآن مجید میں کیا ہے۔

جو شخص تفصیل معلوم کرنا اور حقیقت حال سے آگاہی حاصل کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ شیعہ تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کرے جیسے علامہ طباطبائی کی المیزان، آیت اللہ خوئی کی البیان، محمد جواد مغنیہ کی الکاشف، علامہ طبرسی کی المصباح، وغیرہ وغیرہ۔

میں اختصار سے کام لے رہا ہوں کیونکہ میرا مقصد صرف عمومی طور پر یقین کا عقیدہ بیان کرنا ہے۔ اس کتاب سے میرا مقصد صرف ان امور کا بیان کرنا ہے جن سے مجھے ذاتی طور پر اطمینان نصیب ہوا اور انبیاء اور ان کے بعد اوصیاء کی عصمت کا مجھے یقین ہو گیا۔ میرا شک اور حیرت یقین میں بدل گئے اور ان شیطانی وسوسوں کا ازالہ ہو گیا جن کی وجہ سے کبھی کبھی میری خطائیں، میرے گناہ اور میرے غلط اعمال مجھے اچھے، صحیح اور درست معلوم ہوتے تھے۔ کبھی تو مجھے افعال و اقوال رسولؐ میں بھی شک ہونے لگتا تھا اور آپ کے بتلاتے ہوئے احکام پر بھی اطمینان نہیں ہوتا تھا بلکہ توبت یہاں تک آگئی تھی کہ بعض دفعہ اللہ کے اس قول میں بھی شک ہونے لگتا تھا کہ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا رسولؐ تمہیں جو بتلائیں اس پر عمل کرو اور جس سے منع کریں اس سے رُک جاؤ۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کلام اللہ نہ ہو رسولؐ کا اپنا ہی کلام ہو! سنیوں کا یہ کہنا کہ رسول اللہؐ صرف اللہ کے کلام کی تبلیغ کی حد تک معصوم ہیں بالکل بیکار بات ہے۔ اس لیے کہ اس کی کوئی پہچان نہیں کہ اس قسم کا کلام تو اللہ کی طرف سے ہے اور اس طرح کا کلام تو خود آپ کی اپنی طرف سے، تاکہ یہ کہا جاسکے کہ اس کلام میں تو آپ معصوم ہیں اور اس میں معصوم نہیں، اس لیے یہاں غلطی کا

احتمال ہے۔

اللہ کی پناہ اس متضاد قول سے! اس سے رسول اللہؐ کی شان تقدس میں شک پیدا ہوتا ہے اور آپ کی شان میں طعن کی گنجائش نکلتی ہے۔

اس پر مجھے وہ گفتگو یاد آگئی جو میرے شیعہ ہوجانے کے بعد میرے اور چند دوستوں کے درمیان ہوئی تھی۔ میں انھیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ رسول اللہؐ ہر بات میں معصوم ہیں اور وہ مجھے سمجھا رہے تھے کہ آپ صرف قرآن کی تبلیغ کی حد تک معصوم ہیں۔ ان میں ایک توزر کے پروفیسر تھے۔ توزر منطقہ جریڈ کا ایک شہر ہے۔ یہاں کے لوگ علم و فن، ذہانت و فطانت اور لطیف گوئی کے لیے مشہور ہیں۔ یہ پروفیسر صاحب ذرا دیر سوچتے رہے، پھر کہنے لگے: حضرات! اس مسئلے میں میری بھی ایک رائے ہے۔ ہم سب نے کہا: تو پھر فرمائیے۔ کہنے لگے: بھائی تیجانی شیعوں کی طرف سے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے، ہمارے لیے یہی ضروری ہے کہ رسول اللہؐ کے علی الاطلاق معصوم ہونے کا عقیدہ رکھیں ورنہ تو خود قرآن میں شک پڑ جائے گا۔ سب نے کہا: وہ کیسے؟ پروفیسر صاحب نے فوراً جواب دیا: کیا تم نے دیکھا ہے کہ کسی سورت کے نیچے اللہ تعالیٰ کے دستخط ہوں۔ دستخط سے ان کی مراد وہ مہر تھی جو دستاویزات اور مراسلات کے آخر میں اس لیے لگائی جاتی ہے تاکہ یہ شناخت ہو سکے کہ یہ کس کی طرف سے ہے۔ سب لوگ اس لطیفے پر ہنسنے لگے مگر یہ لطیفہ بڑا سنی خیز ہے، کوئی بھی غیر متعصب انسان اگر اپنی عقل استعمال کر کے غور کرے گا تو حقیقت واضح طور پر سامنے آئے گی کہ قرآن کو کلام الہی تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صاحب وحی کی عصمت مطلقہ کا بھی عقیدہ بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے رکھا جائے کیونکہ یہ تو کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کو بولتے ہوئے سنا ہے یا جبریلؑ کو وحی لاتے ہوئے دیکھا ہے۔

۱۔ منطقہ جریڈ تیونس کے جنوب میں قفصہ سے ۹۲ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ عربی کے مشہور شاعر ابوالقاسم شبلی اور خضر حسین کا جائے ولادت ہے۔ خضر حسین جامعہ ازہر کے شیخ الجامعہ تھے۔ تیونس کے علماء میں سے بہت سے علماء اسی علاقے میں پیدا ہوئے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عصمتِ انبیاءؑ کے بارے میں شیعہ عقیدہ ہی وہ حکم اور مضبوط عقیدہ ہے جس سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور تمام نفسانی و شیطانی وسوسوں کی جڑ کٹ جاتی ہے اور مفسدوں خصوصاً یہودیوں، عیسائیوں اور دشمنانِ دین کا راستہ بند ہو جاتا ہے جو ہر وقت اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کہیں سے راستہ ملے تو اندر گھس کر ہمارے معتقدات کو جھک سے اڑا دیں اور ہمارے دین میں عیب نکالیں۔ ایسے راستے انھیں صرف اہل سنت ہی کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر و بیشتر ہمارے خلاف ان ہی اقوال و افعال سے دلیل لاتے ہیں جو بخاری و مسلم میں غلط طور پر رسول اللہ ﷺ سے منسوب کیے گئے ہیں۔

اب ہم انھیں کیسے یقین دلائیں کہ بخاری و مسلم میں بعض غلط روایات بھی ہیں۔ یہ بات قدرتی طور پر خطرناک ہے کیونکہ اہل سنت و الجماعت اسے کبھی نہیں مانیں گے۔ ان کے نزدیک تو بخاری کتابِ باری کے بعد صحیح ترین کتاب ہے اور اسی طرح مسلم بھی۔

فریقین کے نزدیک امامت کا عقیدہ

اس بحث میں امامت سے مراد مسلمانوں کی امامتِ گہری ہے، یعنی خلافت، حکومت، قیادت اور ولایت کا مجموعہ۔ امامت سے مراد محض نماز کی امامت نہیں جیسا کہ آج کل اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ چونکہ میری کتاب میں بحث کا مدار مذہبِ تسنن اور مذہبِ تشیع کے

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ باب شہادۃ الاغنیٰ میں عبید بن قیس کی سند سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں ایک نابینا شخص کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: اللہ اس پر رحم کرے اس نے مجھے فلاں سورت کی فلاں آیتیں یاد دلادیں جو میں بھول گیا تھا۔

آپ یہ روایت پڑھیے اور حیرت کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ آیات بھول گئے اور اگر یہ نابینا شخص وہ آیات یاد نہ دلاتا تو وہ آیات غائب ہی ہو گئی ہوتیں۔ حد ہے اس لغویت کی!

تقابل پر ہے، اس لیے میرے لیے ضروری ہے کہ میں یہ ظاہر کر دوں کہ امامت کے اصول کی فریقین کے نزدیک کیا نوعیت ہے تاکہ قارئین کو یہ علم ہو سکے کہ فریقین کے نقطہ نظر کی بنیاد کیا ہے اور ضمناً یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کس یقین اور اطمینان نے مجھے اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔

شیعوں کے نزدیک امامت اپنی زبردست اہمیت کے باعث اصولِ دین میں شامل ہے۔ امامت خیرِ الامم کو قیادت فراہم کرتی ہے۔ اس قیادت کے متعدد فضائل ہیں اور اس کی خصوصیات میں سے قابل ذکر ہیں: علم، حلم، شجاعت، نزاہت، عفت، زہد، تقویٰ وغیرہ وغیرہ

شیعوں کا اعتقاد ہے کہ امامت ایک خدائی منصب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے جسے منتخب کرتا ہے، اسے عطا کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنا اہم کردار ادا کرے اور یہ کردار نبی کے بعد دنیا کی قیادت ہے۔

اسی اصول کی بنیاد پر امام علی بن ابی طالبؑ مسلمانوں کے امام تھے، انھیں اللہ نے منتخب کیا تھا اور اس نے بذریعہ وحی اپنے رسولؐ سے کہا تھا کہ علیؑ کا منصب امامت پر تقرر کر دیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا تقرر کیا اور حجۃ الوداع کے بعد غدیر خم کے مقام پر امت کو اس تقرر کی اطلاع دی، اس پر لوگوں نے امام علیؑ کی بیعت کر لی۔ ”یہ شیعہ کہتے ہیں۔“

جہاں تک اہل سنت کا تعلق ہے وہ بھی امت کی قیادت کے لیے امامت کے ضروری ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کے مطابق امت کو حق ہے کہ وہ جس کو چاہے اپنا امام اور قائد بنالے چنانچہ مسلمانوں نے رسول اللہ کی وفات کے بعد ابو بکر بن ابی قحافہ کو امام منتخب کیا تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے خلافت کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا تھا بلکہ اس کا فیصلہ شوریٰ پر چھوڑ دیا تھا۔ ”یہ اہل سنت و الجماعت کہتے ہیں۔“

حقیقت کیا ہے؟ تحقیق کرنے والا اگر غیر جانبداری کے ساتھ فریقین کے دلائل پر غور کرے تو یقیناً وہ حقیقت تک رسائی حاصل کر لے گا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے چونکہ

یہ کتاب میرے ہدایت پانے اور مذہب بدلنے کا قصہ بیان کرتی ہے اس لیے میرے لیے ضروری ہے کہ میں قارئین کرام کے سامنے اپنا نقطہ نظر اور اپنا عقیدہ واضح کر دوں۔ اب یہ قارئین پر ہے کہ وہ اسے قبول کریں یا رد کر دیں کیونکہ آزادی فکر ہر دوسری چیز سے زیادہ اہم ہے۔ قرآن کہتا ہے :

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وُزْرَ أُخْرَىٰ .

کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (سورۃ فاطر - آیت ۱۸)

اور
كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ .
ہر شخص کا دار و مدار اس کے اعمال پر ہے۔

(سورۃ مدثر - آیت ۲۸)

شرع کتاب سے ہی میں نے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کی ہے کہ میں قرآن اور متفق بنین الفریقین احادیث سے تجاوز نہیں کروں گا اور اس سائے عمل میں کوئی خلاف عقل بات تسلیم نہیں کروں گا کیونکہ عقل سلیم متضاد اور متناقض باتوں کو نہیں مانتی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَوْ كَانْ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا .

اگر قرآن غیر اللہ کے پاس سے آیا ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پالتے۔ (سورۃ نساء - آیت ۸۲)

امامت قرآن کی رو سے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيْمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ .
قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي .
قَالَ لَا يَنْبَالُ عَهْدِي بِالْظَالِمِيْنَ .

جب ابراہیمؑ کو اُن کے رب نے کچھ باتوں سے جانچا اور

ابراہیمؑ نے ان کو پورا کر دیا تو اللہ نے کہا : میں تمہیں لوگوں کا امام بنادیا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا : اور میری اولاد میں سے ؟
اللہ تعالیٰ نے کہا : میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچتا۔

(سورۃ بقرہ - آیت ۱۲۴)

یہ آیت کریمہ ہمیں بتلاتی ہے کہ امامت ایک خدائی منصب ہے اور خدا یہ منصب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے کیونکہ وہ خود کہتا ہے :

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا .
میں تمہیں لوگوں کا امام بنادیا ہوں۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امامت اللہ کی طرف سے ایک عہد ہے جو صرف اللہ کے ان نیک بندوں تک پہنچتا ہے جنہیں وہ خاص طور پر اس مقصد کے لیے چُن لیتا ہے کیونکہ یہ صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ظالم اللہ کے اس عہد کے مستحق نہیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَجَعَلْنَا هُمْ أُمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ
فَعَلِ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ وَكَانُوا
لَنَا عَابِدِيْنَ .

ہم نے ان میں سے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کو فحی بھیجی کہ نیک کام کریں، نماز قائم کریں اور زکات دیں۔ اور وہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

(سورۃ انبیاء - آیت ۷۳)

ایک اور آیت ہے :

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أُمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا
وَكَانُوا بآيَاتِنَا يَوْقُوْنَ .

ہم نے ان میں سے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے کیونکہ وہ صابر تھے اور ہماری نشانیوں پر یقین

(سورۃ سجدہ - آیت ۲۴)

رکھتے تھے۔

ایک اور آیت ہے :

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضِعِفُوا فِي
الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ.

ہم چاہتے ہیں کہ ان پر احسان کریں جنہیں دنیا میں کمزور
سمجھ لیا گیا ہے، ان کو امام بنائیں اور انہیں (زمین کا)
وارث بنائیں۔ (سورۃ قصص - آیت ۱۵)

ممکن ہے کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیات قرآن سے یہ مفہوم
نکلتا ہے کہ یہاں امامت سے مراد نبوت ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ امامت کا مفہوم
زیادہ عام ہے، ہر رسول اور نبی امام ہوتا ہے لیکن ہر امام رسول یا نبی نہیں ہوتا۔
اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں واضح کر دیا ہے کہ اس کے نیک
بندے اس منصب کے لیے اس سے دعا کر سکتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کی ہدایت کا شرف
حاصل کر سکیں اور اس طرح آخر عظیم کے مستحق ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ
مَرُّوا كِرَامًا. وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يُخْرِجُوا
عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْنَانًا. وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا
مِنْ أَدْوَارِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ
إِمَامًا.

وہ لوگ جو جھوٹ گواہی نہیں دیتے، جب انہیں بیہودہ چیزوں
کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بزرگانہ انداز سے گزرتے
ہیں۔ اور جب انہیں ان کے پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو
ان پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ غور سے سنتے ہیں) اور وہ
لوگ جو ہم سے دعا کرتے ہیں کہ لے پروردگار ہمیں ہماری بیویوں
اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو
پرہیزگاروں کا امام بنا۔ (سورۃ فرقان - آیات ۷۲ تا ۷۴)

اسی طرح قرآن کریم میں ائمہ کا لفظ ان ظالم سرداروں اور حکمرانوں کے لیے
بھی استعمال ہوا ہے جو اپنے پیروکاروں اور اپنی قوموں کو گمراہ کرتے، نساہ پھیلاتے
میں ان کی رہنمائی کرتے اور دنیا و آخرت کے عذاب کی انہیں دعوت دیتے ہیں۔
فرعون اور اس کے شکریوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے :

فَاخَذْنَا مِنْهُ وَجُودَهُ فَنَبَذْنَاهُ فِي الْيَمِّ فَانْظُرْ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ. وَجَعَلْنَا هُمُ أَيْمَةً
يَذْعُونَ إِلَى النَّارِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنصَرُونَ. وَ
اتَّبَعْنَاهُمْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُمْ
مِنَ الْمَقْبُوحِينَ.

ہم نے اُسے اور اس کے شکریوں کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا۔
پھر دیکھو باطلوں کا کیا انجام ہوا۔ ہم نے انہیں ایسے امام بنایا
جو جہنم کی دعوت دیتے تھے اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد
نہیں کی جائے گی۔ اس کے بعد ہم نے اس دنیا میں ان پر لعنت
بھیجی اور قیامت میں وہ ان میں سے ہوں گے جن کا ہولناک
انجام ہوگا۔ (سورۃ قصص - آیت ۲۰)

اس بنیاد پر شیعہ جو کچھ کہتے ہیں وہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا
ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ امامت ایک من جانب اللہ منصب ہے
جو اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، وہ اللہ کا عہد ہے جس کا اطلاق ظالموں پر
نہیں ہوتا۔ چونکہ ابوبکر، عمر اور عثمان کی عمروں کا بڑا حصہ بشرک کی حالت میں گزرا
کیونکہ وہ بتوں کو بوجھتے رہے تھے اس لیے وہ اس کے مستحق نہیں۔ اس طرح
شیعوں کا یہ قول درست ہے کہ تمام صحابہ میں صرف امام علی بن ابی طالب ہی امامت
کے مستحق ہیں اور امامت کے متعلق اللہ کے دعوے کا اطلاق صرف انہی پر ہوتا
ہے کیونکہ وہ کبھی بتوں کے آگے سجدہ ریز نہیں ہوتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام
لانے کے بعد اس سے پہلے کے سب گناہ بخود ہو جاتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ یہ واقعی
صحیح ہے، لیکن پھر بھی بڑا فرق ہے اس شخص میں جو پہلے مشرک تھا بعد میں اس

نے تو یہ کر لی اور اس شخص میں جس کا دامن شروع سے شرک کی آلائش سے پاک صاف رہا اور جس نے بجز اللہ کے کبھی کسی کے سامنے جبینِ نیاز خم نہیں کی۔

امامتِ سنتِ نبوی کی رو سے

امامت کے بارے میں رسول اللہ کے متعدد اقوال ہیں جن کو شیعوں اور سُنیوں دونوں نے اپنی احادیث کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ رسول اللہ نے کہیں اسے امامت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور کہیں خلافت کے لفظ سے، کہیں ولایت کے لفظ سے اور کہیں امارت کے لفظ سے۔

امامت کے بارے میں ایک حدیثِ نبوی ہے:

خِيَارُ اِمْتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَ
تُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ. وَشِرَارُ اِمْتِكُمُ
الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَ
يَلْعَنُوْنَكُمْ. قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَازِلُهُمْ بِالسَّيْفِ
فَقَالَ لَا مَا اَقَامُوا فِيْكُمْ الصَّلٰوةَ.

تمہارے اماموں میں سب سے بہتر وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم ان کے لیے دعا کرو، وہ تمہارے لیے دعا کریں۔ اور بدترین ائمہ وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں، جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔ صحابہ نے پوچھا: تو کیا ہم تلوار سے ان کا مقابلہ نہ کریں رسول اللہ نے فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں۔

رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے:

يَكُوْنُ بَعْدِيْ اِمَّةٌ لَا يَهْتَدُوْنَ بِهَدَايَ وَلَا يَسْتَوْنَ
بِسُنَّتِيْ وَسَيَقُوْمُ فِيْهِمْ رِجَالٌ قُلُوْبُهُمْ لِقُلُوْبِ الشَّيَاطِيْنِ

۱۷ صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۲۴ باب خیارِ الامۃ وشرارہم۔

فِيْ جُشَمَانِ اِنْسٍ .

میرے بعد کچھ ایسے امام ہوں گے جو نہ میری روش پر چلیں گے اور نہ میری سنت کا اتباع کریں گے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے جسم تو انسانوں کے سے ہوں گے مگر دل شیطانوں کے سے۔

خلافت کے بارے میں حدیثِ نبوی ہے:

لَا يَزَالُ الدِّيْنُ قَائِمًا حَتَّى تَقُوْمَ السَّاعَةُ اَوْ يَكُوْنَ
عَلَيْكُمْ اَنَّا عَشْرَ خَلِيْفَةٍ كُلُّهُمْ مِّنْ قُرَيْشٍ .

دین اس وقت تک قائم رہے گا جب تک قیامت نہ آجائے یا بارہ خلیفہ نہ ہو جائیں جو سب قریش میں سے ہوں گے۔

جابر بن سمرہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو سنا، کہ آپ فرماتے تھے:

لَا يَزَالُ الْاِسْلَامُ عَزِيْزًا اِلَى اثْنَيْ عَشَرَ خَلِيْفَةٍ ،
ثُمَّ قَالَ كَلِمَةً لَمْ اَفْهَمْهَا فَقُلْتُ لِاَبِيْ مَا قَالَ ؟
فَقَالَ : كُلُّهُمْ مِّنْ قُرَيْشٍ .

بارہ خلفاء تک اسلام کی عزت باقی رہے گی۔ پھر کچھ فرمایا جو میں نہیں سن سکا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ کیا فرمایا تھا؟ انہوں نے کہا کہ یہ فرمایا تھا کہ وہ سب خلفاء قریش میں سے ہوں گے۔

امارت کے بارے میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

سَتَكُوْنُ اُمَرَاءٌ فَتَعْرِقُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ فَمَنْ عَرَفَ

۱۷ صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۲۰ باب الامر بزوج الجماعة عند ظهور الفتن .

۱۸ صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۴۷ باب الناس تبع قریش والجلالة فی قریش .

۱۹ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۰۵ - اور صفحہ ۱۲۸ - صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۳ .

بَرِّئَ وَمَنْ أَنْكَرَ سَلِمَ وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَأَنَعَ، قَالُوا
أَفَلَا نَفَاتِلُهُمْ قَالَ لَا مَا صَلُّوا .

جلد ہی کچھ اُمراء ہوں گے جن کو تم میں سے کچھ پہچانیں گے،
کچھ نہیں۔ جس نے پہچانا بیچ گیا، جس نے نہیں پہچانا محفوظ رہا
مگر جس نے خوشی سے ان کا اتباع کیا لوگوں نے پوچھا کیا
ہم ان سے قتال نہ کریں؟ آپ نے فرمایا: جب تک وہ نماز پڑھتے
رہیں اس وقت تک نہیں یہ

امارت سے متعلق ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

يَكُونُ اثْنَا عَشَرَ أَمِيرًا كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ .

میرے بعد بارہ امیر ہوں گے جو سب قریش میں سے
ہوں گے یہ

آپ نے اپنے اصحاب کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

سَتَخْرِصُونَ عَلَى الْإِمَارَةِ وَتَسْتَكُونُونَ نَدَامَةً يَوْمَ
الْقِيَامَةِ فَنِعْمَ الْمُرْضِعَةُ وَيَسْتِ الْقَاطِمَةُ .

تمہیں جلد امارت حاصل کرنے کا لالچ ہوگا لیکن امارت

قیامت کے دن باعثِ ندامت ہوگی۔ امارت دودھ پلانے والی

تو اچھی ہے مگر دودھ چھڑانے والی اچھی نہیں ہے

ولایت کا لفظ بھی حدیث میں آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے فرمایا:

مَا مِنْ وَالٍ يَلِي رِعِيَّةً مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَيَمُوتُ وَهُوَ
غَاشٌّ لَهُمْ إِلَّا حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ .

۱۔ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۳ باب دُجُوبُ الْإِنْكَارِ عَلَى الْأَمْرَاءِ -

۲۔ صحیح بخاری جلد ۴ کتاب الاحکام -

۳۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۲۷ باب الاستِغْلَاف -

جس مُسلمان وَالِی نے مُسلمان رعایا پر حکومت کی لیکن وہ انھیں
دھوکا دیتا رہا تو مرنے کے بعد اُس پر جنت حرام ہے یہ

ایک اور حدیث میں آپ فرماتے ہیں:

لَا يَزَالُ أَمْرُ النَّاسِ مَا ضَيَا مَا قَرِئَتْهُمُ اثْنَا عَشَرَ
رَجُلًا كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ .

لوگوں کا کام اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک ان کے

والی بارہ اشخاص ہوں گے جو سب قریش میں سے ہوں گے یہ

امامت اور خلافت کے مفہوم کا یہ مختصر سا جائزہ میں نے قرآن و سنت سے

بغیر کسی تشبیہ اور توضیح کے پیش کیا ہے بلکہ میں نے سب احادیث کے لیے

اہل سنت کی صحاح پر اعتماد کیا ہے اور شیعہ کتابوں سے کوئی روایت نہیں لی،

کیونکہ شیعوں کے نزدیک تو یہ بات یعنی بارہ خلفاء کی خلافت جو سب قریش میں

سے ہوں گے مُسلمات میں سے ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں اور جس کے متعلق

دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ بعض اہل سنت والجماعت علماء کہتے ہیں کہ رسول اللہ

نے یہ بھی فرمایا ہے کہ

يَكُونُ بَعْدِي اثْنَا عَشَرَ خَلِيفَةً كُلُّهُمْ مِنْ

بَنِي هَاشِمٍ .

میرے بعد بارہ خلیفہ ہوں گے جو سب بنی ہاشم میں سے

ہوں گے۔ (بیئار الخوذة جلد ۳ صفحہ ۱۰۴)

۱۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۰۴ باب مَا يَكُونُ مِنَ الْوَصْفِ عَلَى الْإِمَارَةِ - ۲۔ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۳ باب الْخِلَافَةُ فِي قُرَيْشٍ -

۳۔ امام علی علیہ السلام بیئار البلاغ میں فرماتے ہیں:

إِنَّ الْأَيُّمَةَ مِنْ قُرَيْشٍ عُرِضُوا فِي هَذَا الْبَطْنِ مِنْ هَاشِمٍ لَا تَصْلُحُ عَلَى سِوَاهُمْ

وَلَا تَصْلُحُ الْوَلَاةُ مِنْ غَيْرِهِمْ -

بلاشبہ امام قریش میں سے ہوں گے جو اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی ہاشم کی کشت زار سے اُہل گئے

نہ امامت کسی اور کو زیب دیتی ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی اس کا اہل ہو سکتا ہے۔ (ناشر)

شعبی سے روایت ہے کہ مسروق نے کہا: ایک دن ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے انھیں اپنے مَصَاحِف دکھائے تھے کہ اتنے میں ایک نوجوان نے ان سے پوچھا: کیا آپ کے نبی نے آپ کو کچھ بتلایا ہے کہ ان کے بعد کتنے خلیفہ ہوں گے ابن مسعود نے اس شخص سے کہا: تم ہو تو عمر، لیکن تم نے بات ایسی پوچھی ہے جو تم سے پہلے کسی نے مجھ سے نہیں پوچھی۔ ہاں! ہم نے نبی سے وعدہ کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے نقیبوں کی تعداد کے برابر ان کے بھی بارہ خلفاء ہوں گے یہ اب ہم اس مسئلے سے متعلق فریقین کے اقوال پر غور کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ جن صریح نصوص کو دونوں فریق تسلیم کرتے ہیں، وہ کس طرح ان کی تشریح و توضیح کرتے ہیں، کیونکہ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جو اُس دن سے جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی آج تک مسلمانوں میں نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ اسی مسئلے سے مسلمانوں میں وہ اختلاف پیدا ہوتے جن کی وجہ سے وہ مختلف فرقوں اور اعتقادی و فکری بتانوں میں تقسیم ہو گئے حالانکہ اس سے پہلے وہ ایک اُمت تھے۔

ہر اختلاف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا خواہ وہ فقہ کے بارے میں ہو، قرآن کی تفسیر کے بارے میں ہو یا سُنَّتِ نبوی کو سمجھنے کے بارے میں ہو، اس کا منشا اور اس کا سبب مسئلہ خلافت ہی ہے۔

آپ مسئلہ خلافت کو کیا سمجھتے ہیں؟
سقیفہ کے بعد خلافت ایک ”امر واقعہ“ بن گئی اور اس کی وجہ سے بہت سی صحیح احادیث اور صریح آیات رد کی جانے لگیں اور ایسی احادیث گھڑی جانے لگیں، جن کی صحیح سُنَّتِ نبوی میں کوئی بنیاد نہیں تھی۔

اس پر مجھے اسرائیل اور ”امر واقعہ“ کا قصہ یاد آگیا۔ عرب بادشاہوں اور سربراہوں کا اجلاس ہوا اور اس میں اتفاق رائے سے طے پایا کہ اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا،

اس کے ساتھ مذاکرات نہیں کیے جائیں گے، صلح نہیں ہوگی کیونکہ جس چیز پر طاقت کے زور سے قبضہ کر لیا گیا ہے وہ طاقت استعمال کیے بغیر واپس نہیں مل سکتی۔ چند سال بعد ایک اور اجلاس ہوا، اس میں فیصلہ ہوا کہ مصر سے تعلقات منقطع کر لیے جائیں کیونکہ اس نے صہیونی ریاست کو تسلیم کر لیا ہے۔ چند سال اور گزر گئے۔ عرب سربراہانِ مملکت پھر جمع ہوئے۔ اس بار انھوں نے مصر سے پھر تعلقات قائم کر لیے۔ اور سب نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لیا۔ حالانکہ اسرائیل نے فلسطینی قوم کے حق کو تسلیم نہیں کیا تھا اور نہ اپنے موقف میں کوئی تبدیلی پیدا کی تھی بلکہ اس کی ہٹ دھرمی بڑھ گئی تھی اور فلسطینی قوم کو کچلنے کی کارروائیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس طرح تاریخ اپنے آپ کو دہرائے ہے۔ امر واقعہ کو تسلیم کر لینا عربوں کی عادت ہے۔

خلافت کے بارے میں اہل سُنَّت کی رائے

اس بارے میں اہل سُنَّت کی رائے سب کو معلوم ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کسی کو خلافت کے لیے نامزد نہیں کیا۔ لیکن صحابہ میں سے اہل حلّ و عقد سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور انھوں نے ابوبکر صدیق کو اپنا خلیفہ چن لیا کیونکہ ایک تو ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت نزدیک تھے، دوسرے انھی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفا میں نماز پڑھانے کے لیے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اہل سُنَّت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو ہمارے دین کے کام کے لیے پسند کیا تو ہم انھیں اپنے دنیا کے کام کے لیے کیوں پسند نہ کریں۔

اہل سُنَّت کے نقطہ نظر کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

- (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو نامزد نہیں کیا۔ اس سلسلے میں کوئی نص نہیں۔
- (۲) خلیفہ کا تعین صرف شوری سے ہوتا ہے۔
- (۳) ابوبکر کو کبار صحابہ نے خلیفہ منتخب کیا تھا۔

یہی میری نوڈ اپنی رائے تھی اس وقت جب کہ میں مالکی تھا۔ اس رائے کا دفاع میں پوری طاقت سے کیا کرتا تھا اور جن آیات میں شوری کا ذکر ہے انھیں میں

اپنی رائے کے ثبوت میں پیش کرتا۔ میں جہاں تک ہو سکتا تھا، فخر یہ کہا کرتا تھا کہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو جمہوری نظام حکومت کا قائل ہے۔ اسلام نے اس انسانی اصول کو جس پر دنیا کی ترقی یافتہ اور مہذب قومیں فخر کرتی ہیں اوروں سے پیسے اپنالیا تھا۔ مغرب میں جو جمہوری نظام انیسویں صدی میں متعارف ہوا اسلام

اس سے چھٹی صدی ہی میں واقف ہو چکا تھا۔ لیکن شیعہ علماء سے ملاقات کرنے، ان کی کتابیں پڑھنے اور ان کے اطمینان بخش دلائل معلوم کرنے کے بعد میں نے اپنی پہلی رائے بدل دی۔ اب حقیقت ظاہر ہو چکی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ اللہ سبحانہ کی شان کے مناسب نہیں کہ وہ کسی بھی امت کو بغیر امام کے چھوڑ دے جب کہ وہ خود فرماتا ہے :

إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ
آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک

(سورۃ رعد - آیت ۷)

ہدایت دینے والا ہے۔ اسی طرح کیا رسول اللہ صلی رحمۃ ورافت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ اپنی امت کو بغیر کسی سرپرست کے چھوڑ دیں خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ آپ کو خود اپنی امت میں تفرقہ کا اندیشہ تھا۔ یہ اور یہ ڈرتھا کہ کہیں لوگ اٹھ پٹوں نہ پھر جائیں۔ یہ دنیا کے حصول میں ایک دوسرے پر بازاری لیجانے کی کوشش نہ کرنے لگیں۔ ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگیں۔ یہ اور یہ دونوں نصاریٰ کے طور طریقوں کی پیروی نہ کرنے لگیں۔ یہ بھی یاد ہے کہ جب عمر بن الخطاب زخمی ہو گئے تو اہل المؤمنین عائشہ نے آدمی

۱۔ جامع ترمذی - سنن ابوداؤد - سنن ابن ماجہ - مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۳۲ -

۲۔ صحیح بخاری جلد ۵ صفحہ ۹۰۲ باب الخوض اور جلد ۵ صفحہ ۱۹۲ -

۳۔ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۶۳ -

۴۔ صحیح بخاری جلد ۵ صفحہ ۱۱۲ -

بھیج کر انھیں کہلوا دیا تھا کہ : اپنے بعد امت محمدیہ کا کوئی خلیفہ مقرر کر دیجیے اور اسے اپنے بعد بے یار و مددگار نہ چھوڑیے، کیونکہ مجھے فتنے کا اندیشہ ہے۔ یہ اسی طرح حضرت عمر کے زخمی ہو جانے کے بعد عبداللہ بن عمر نے بھی اپنے والد سے کہا تھا کہ : لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کریں گے۔ لیکن اگر آپ کا کوئی اُونٹ یا بھیڑ چرانے والا ہو اور وہ گلے کو چھوڑ کر آپ کے پاس چلا آئے تو کیا آپ یہ نہیں سمجھیں گے کہ اس نے گلے کو کھودیا۔ انسانوں کی دیکھ بھال تو اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

حضرت ابوبکر نے جن کو مسلمانوں نے شوریٰ کے ذریعے خلیفہ بنایا تھا خود ہی اس اصول کو توڑ دیا تاکہ اس طرح مسلمانوں میں اختلاف، تفرقہ اور فتنے کے امکان کا سد باب کیا جاسکے۔ یہ توجیہ اس صورت میں ہوگی جب ہم حسن ظن سے کام لیں ورنہ امام علیؑ نے جو اس قضیے میں تمام پہلوؤں سے سب سے زیادہ واقف تھے، پہلے ہی پیشین گوئی کر دی تھی کہ ابوبکر کے بعد خلافت عمر بن الخطاب ہی کے پاس جائے گی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب عمر نے امام علیؑ پر ابوبکر کی بیعت کرنے کے لیے زور ڈالا تھا۔ امام علیؑ نے کہا تھا :

إِحْلِبْ حَلْبًا لَّكَ شَطْرَهُ وَاشْدُدْ لَهُ الْيَوْمَ يَرِدُّهُ
عَلَيْكَ عَدَاۗءُ

آج دودھ دوہ لو، کل تمھیں اس کا آدھا حصہ مل جائے گا۔
آج تم اس کی حیثیت مضبوط کر دو، کل وہ تمھیں واپس لوٹا دے گا۔
میں کہتا ہوں کہ جب ابوبکر ہی کو شوریٰ کے اصول پر یقین نہیں تھا تو ہم کیسے مان لیں کہ رسول اللہؐ نے یہ معاملہ کسی کو خلیفہ نامزد کیے بغیر ایسے ہی چھوڑ دیا ہوگا۔
کیا آپ کو اس مصالحت کا علم نہیں تھا جس کا علم ابوبکر، عائشہ اور عبداللہ بن عمر کو

۱۔ ابن قتیبہ، الامامة والسياسة جلد ۱ صفحہ ۲۸ -

۲۔ ابن قتیبہ، الامامة والسياسة جلد ۱ صفحہ ۱۸ اور ما بعد -

۳۔ صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۵ باب الاستخلاف وترک -

تھا اور جس سے سب لوگ صاف طور پر واقف تھے کہ اگر انتخاب کا اختیار عوام کو دیدیا جائے گا تو اس کا نتیجہ اختلاف کی شکل میں ظاہر ہو گا خاص کر جب معاملہ حکومت اور خلافت کا ہو۔ خود حضرت ابوبکر کے انتخاب کے موقع پر سقیفہ میں ایسا ہوبھی چکا تھا۔ انصار کے سردار سعد بن عبادہ، ان کے بیٹے قیس بن سعد، علی بن ابی طالب، امیر ابن العوام، عباس بن عبد المطلب اور دوسرے بنی ہاشم اور بعض دوسرے صحابہ نے جو خلافت کو علی کا حق سمجھتے تھے، مخالفت کی تھی اور وہ علی کے مکان پر جمع ہو گئے تھے جہاں ان کو جلا دیے جانے کی دھمکی دی گئی تھی۔

اس کے علاوہ ہم نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ نے اپنی پوری عملی زندگی میں کبھی ایک دفعہ بھی کسی غزوہ یا سریہ کے کمانڈر کے تعین کے وقت اپنے اصحاب سے مشورہ کیا ہو۔

اسی طرح مدینہ سے باہر جاتے وقت کسی سے مشورہ کیے بغیر جس کو مٹا سمجھتے تھے اپنا جانشین مقرر کرتے تھے۔ جب آپ کے پاس وفود آتے تھے اور اپنے اسلام کا اعلان کرتے تھے اس وقت بھی ان سے مشورہ کیے بغیر ان میں سے جس کو چاہتے تھے ان کا سربراہ مقرر کر دیتے تھے۔

آپ نے اپنے اس طریق کار کو اس وقت مزید واضح کر دیا جب آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں انسامہ بن زید کو لشکر کا امیر مقرر کیا حالانکہ ان کی نو عمری اور صغر سنی کی وجہ سے کچھ لوگوں نے اعتراض بھی کیا مگر آپ نے اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے ان لوگوں پر لعنت کی جو اس لشکر میں شامل ہونے سے گریز کریں تھے اور واضح کر دیا کہ امارت، ولایت اور خلافت میں لوگوں کی مرضی داخل نہیں، یہ معاملہ رسول کے حکم سے طے ہوتا ہے اور رسول کا حکم اللہ کا حکم ہے۔

جب صورت یہ ہو تو ہم کیوں نہ دوسرے فریق کے دلائل پر بھی غور کریں دوسرے

۱۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۶ باب رجم الجلی من الزنا۔

۲۔ سنن ابن قتیبہ، الایمان والسیاسة جلد اول صفحہ ۱۸ اور مابعد۔

۳۔ الملل والنحل، شہرستانی۔

فریق سے میری مراد شیعہ ہیں جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ رسول اللہ نے امامت کو خلیفہ مقرر کیا تھا اور مختلف موقعوں پر اس کی تصریح بھی کر دی تھی جن میں سب سے مشہور غدریخیم کا جلسہ ہے۔

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اختلاف کی صورت میں آپ اپنے مخالف کی رائے اور دلیل کو نہیں، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ مخالف ایسے حقائق سے استدلال کر رہا ہو جن کو آپ بھی تسلیم کرتے ہوں۔

شیعوں کی دلیل میں کوئی واہی یا کمزور بات نہیں جسے آسانی سے نظر انداز کیا جاسکے۔ بلکہ معاملہ قرآنی آیات کا ہے جو اس بارے میں نازل ہوئی ہیں جن کو خود رسول اللہ نے جو اہمیت دی وہ اس قدر مشہور و معروف اور زبان زد خاص عام ہے کہ حدیث اور تاریخ کی کتابیں اس سے بھری ہوئی ہیں اور راوی اسے نسلاً بعد نسل نقل کرتے چلے آئے ہیں۔

(۱) ولایت علی قرآن کریم میں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ

تمہارے ولی تو بس اللہ اور اس کا رسول اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ کی حالت میں زکوٰۃ دیتے

۱۔ قرآن کریم بھی ہمیں انصاف سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے:

لَا يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِيمَانِ وَالنُّبُوَّةِ..... لوگوں کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف

(سورہ مائدہ - آیت ۸)

کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔

واضح ہے کہ شیعوں کی کوئی دلیل ایسی نہیں جس کی اصل اہل سنت کی کتابوں میں موجود نہ ہو۔

ہیں۔ جو کوئی اللہ، اس کے رسول اور ان مومنوں کی ولایت قبول کرے گا (وہ اللہ کی جماعت میں داخل ہوگا) بے شک اللہ ہی کی جماعت غلبہ پانے والی ہے۔ (سورۃ مائدہ - آیت ۵۵-۵۶)

جماعتِ ثلثیہ کے لئے ہے۔
ابو اسحاق ثلثی نے اپنی تفسیر کبیر میں اپنی آئندہ سے ابوذر غفاری سے یہ روایت بیان کی ہے۔ ابوذر کہتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ان کانوں سے سنا، نہ سنا ہو تو یہ کان نہیٹ بہرے ہو جائیں اور اپنی ان آنکھوں سے دیکھا، نہ دیکھا ہو تو یہ آنکھیں پٹم اندھی ہو جائیں۔ آپؐ فرماتے تھے کہ ”علیٰ نیکیوں کو رواج دینے والے اور کفر کو مٹانے والے ہیں۔ کامیاب ہے وہ جو ان کی مدد کرے گا اور ناکام ہے وہ جو ان کی مدد چھوڑ دے گا۔ ایک دن میں رسول اللہ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک مانگنے والا مسجد میں آ گیا، اسے کسی نے کچھ نہیں دیا۔ علیؑ نماز پڑھ رہے تھے، انھوں نے اپنی چھوٹی انگلی سے انگوٹھی اتار لی۔ اس پر رسول اللہؐ نے عاجزی سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور کہا: یا اہلی! میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے دعا کی تھی اور کہا تھا: اے میرے پروردگار! میرا سینہ کھول دے اور میرا کام آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ لیں، اور میرے اپنوں میں سے میرے بھائی ہارونؑ کو میرا مددگار بنادے تاکہ میں تقویت حاصل کر سکوں ادا انھیں میرا شریک کار بنادے تاکہ ہم کثرت سے تیری تسبیح کریں اور بکثرت تجھے یاد کیا کریں۔“ تب تو نے انھیں وحی بھیجی کہ اے موسیٰ! تمھاری دعا قبول ہو گئی۔ اے اللہ! میں تیرا بندہ اور نبی ہوں، میرا بھائی سینہ کھول دے، میرا کام بھی آسان کر دے اور میرے اپنوں میں سے علیؑ کو میرا مددگار بنادے تاکہ میں اسے اپنی کمر مضبوط کر سکوں۔“ ابوذر کہتے ہیں کہ ابھی رسول اللہؐ نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ جبریل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے: اِنَّمَا وُكِّلْتُكَ اللّٰهُ وَرَسُولُكَ ۙ

۱۔ ابراہیم بن محمد بن محمد بن ابراہیم بنیساپوری، ثعلبی المتوفی ۳۲۷ھ۔ ابن خلیکان کہتے ہیں کہ علم تفسیر

۲۲ الحیۃ القصار، السنن، نسائی، مسند امام احمد بن حنبل، صواعق محرقة ابن حجر، مشکوٰۃ - شرح بیج البلاغ -

شیعوں میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت امام علی بن ابی طالبؑ کی شان میں اُتری ہے۔ اس کی توثیق ائمہ اہل بیتؑ کی روایت سے ہوتی ہے جو شیعوں کے نزدیک قطعاً مستم الثبوت روایت ہے اور ان کی متعدد معتبر کتبوں میں موجود ہے جیسے :

(۱) اثبات الہدایۃ - علامہ محمد بن حسن عاصمی رحمۃ اللہ علیہ

(۲) بَخَارُ الْاَنْوَارِ - علامہ محمد باقر مجلسی رحمۃ اللہ علیہ

(۳) تفسیر المیزان - علامہ محمد حسین طباطبائی ۱۴۰۲ھ

(۷) تفسیر الکاشف - علامہ محمد حواد مغنیہ

(۵) الغدير - علامہ عبدالحسین احمد امینیؒ ۱۳۹۰ھ

ان میں سے فقط علمائے تفسیر کا ذکر کرتا ہوں :

ان میں سے فقط علمائے تفسیر کا ذکر کرتا ہوں :
(۱) تفسیر کشف عن حقائق التنزیل - ج ۱ اللہ محمود بن عمر مخشری ۵۳۸ھ جلد ۱

(۲) تفسیر جامع البیان - حافظ محمد بن جریر طبری ۳۱۰ھ جلد ۶ صفحہ ۲۸۸

(۳) تفسیر زاد المفسر فی علم التفسیر - سبط ابن جوزی ۶۵۲ھ جلد ۲ صفحہ ۳۸۳

(۲۱) تفسیر الجامع لاحکام القرآن - محمد بن احمد قرطبی ۶۷۱ھ جلد ۲ صفحہ ۲۱۹

(۵۱) تفسیر کبیر - امام فخر الدین رازی شافعی رحمہ اللہ جلد ۲ صفحہ ۲۶

(۵) تفسیر سبیر - امام محمد بن ابی اسحاق
 (۶) تفسیر القرآن العظیم - اسماعیل بن عمر المعروف ابن کثیر رحمہ اللہ جلد ۲ صفحہ ۷

(٤) تفسیر القرآن الکریم۔ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی شافعی جلد ۱ صفحہ ۲۸۹

(١) تفسیر شواهد التزیل لقواعد التفصیل والتأویل - حافظ حاکم حسکانی جلد ١ صفحہ ٩١

(۹) تفسیر درمنثور - حافظ جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ جلد ۲ صفحہ ۲۹۳

۱۷۔ اہل سنت میں راویانِ حدیث کے القاب کی درجہ بندی مندرجہ ذیل ہے :

۱- محدث : جسے درایت حدیث پر عبور ہو
۲- حافظ : جسے ایک لاکھ حدیثیں یاد ہوں

۳۔ حُجَّت : جسے تین لاکھ حدیثیں یاد ہوں
۴۔ حَاکِم : جسے سب حدیثیں یاد ہوں۔ (ناشر)

(۱۰) اسباب النزول - امام ابو الحسن واسدی نیشاپوری ۶۸ھ صفحہ ۱۲۸

(۱۱) احکام القرآن - ابوبکر احمد بن علی الجصاص حنفی ۳۷۰ھ جلد ۴ صفحہ ۱۰۳

(۱۲) التسهيل للعلوم التنزيل - حافظ کبیری غرناطوی ۸۱۰ھ جلد ۱ صفحہ ۱۸۱

علمائے اہل سنت میں سے جن کے نام میں نے لیے ہیں، ان سے زیادہ وہ ہیں جن کے نام میں نے نہیں لیے لیکن وہ علمائے شیعہ سے اس پر متفق ہیں کہ یہ آیت ولایت علی بن ابی طالب کی بابت نازل ہوئی ہے۔

(۲) آیہ تبلیغ کا تعلق بھی ولایت علیؑ سے ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ
وَأِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ
مِنَ النَّاسِ .

اے رسول! جو حکم تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس آیا ہے اُسے پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تمھیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ (سورہ مائدہ - آیت ۶۷)

بعض اہل سنت مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت بعثت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ قتل اور ہلاکت کے خوف سے اپنے ساتھ محافظ رکھتے تھے جب آیت نازل ہوئی کہ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تو آپ نے اپنے محافظوں سے کہا: تم جاؤ، اب اللہ نے میری حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔

ابن جریر اور ابن مردؤیہ نے عبد اللہ بن شقیق سے روایت بیان کی ہے کہ کچھ صحابہ رسول اللہ کے ساتھ سائے کی طرح رہتے تھے۔ جب آیت نازل ہوئی وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تو آپ نے باہر نکل کر فرمایا: لوگو! اپنے گھردالوں کے پاس چلے جاؤ، اللہ نے میری حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔

(تفسیر درمثور، سیوطی جلد ۳ صفحہ ۱۱۹)

ابن حبان اور ابن مردؤیہ نے ابو ہریرہ سے روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جب ہم کسی سفر میں رسول اللہ کے ساتھ ہوتے تھے تو سب سے بڑا اور سادار درخت ہم آپ کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ آپ اسی کے نیچے اُترتے تھے۔ ایک دن آپ ایک درخت کے نیچے اُترے اور اس پر اپنی تلوار بٹکا دی۔ ایک شخص آیا اور اس نے وہ تلوار اٹھالی۔ کہنے لگا: محمد! بتاؤ اب تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ نے فرمایا: اللہ بچائے گا تو تلوار رکھ دے۔ اُس نے تلوار رکھ دی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ .

ترمذی، حاکم اور ابونعیم نے عائشہ سے روایت کی ہے حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھ محافظ رہتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ تو آپ نے قبۃ سے سرنکال کر کہا: تم لوگ چلے جاؤ، اللہ نے میری حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔

طبرانی، ابونعیم، ابن مردؤیہ اور ابن عساکر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ کے ساتھ محافظ رہتے تھے۔ آپ کے چچا ابوطالب ہر روز بنی ہاشم میں سے کسی شخص کو آپ کے ساتھ رہنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ پھر آپ نے ان سے کہہ دیا: چچا جان! اللہ نے میری حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے اب کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

جب ہم ان احادیث پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مضمون آیت کریمہ کے ساتھ میل نہیں کھاتا اور نہ اس کے سیاق و سباق کے ساتھ ٹھیک بیٹھتا ہے۔ ان سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بعثت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ ایک روایت میں تو تصریح ہے کہ یہ ائمہ ابوطالب کی زندگی کا ہے یعنی ہجرت سے کئی سال قبل کا۔ خصوصاً ابو ہریرہ تو یہ تک کہتے ہیں کہ جب ہم سفر میں رسول اللہ کے ہمراہ ہوتے تھے تو ان کے لیے سب سے بڑا درخت چھوڑ دیتے تھے ظاہر ہے کہ یہ روایت موضوع ہے کیونکہ ابو ہریرہ جیسا کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں

لہ تفسیر درمثور، سیوطی

سہ ہجری سے قبل اسلام اور رسول اللہ کو جانتے بھی نہیں تھے لے عائشہ اُس وقت تک یا تو پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں یا ان کی عمر دو سال سے زیادہ نہیں تھی کیونکہ یہ معلوم ہے کہ ان کا نکاح رسول اللہ سے ہجرت کے بعد ہوا اور اس وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ باختلاف روایت گیارہ سال تھی۔ پھر یہ روایتیں کیسے صحیح ہو سکتی ہیں؟ تمام سُنتی اور شیعہ مُفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ سورۃ مائدہ مدنی سورت ہے اور یہ قرآن کی سب سے آخری سورت ہے جو نازل ہوئی۔

احمد اور ابو عبیدہ اپنی کتاب فضائل میں، نحاس اپنی کتاب ناسخ میں، نسائی، ابن منذر، حاکم، ابن مردؤیہ اور بیہقی اپنی سُنن میں جبیر بن نفیر سے روایت کرتے ہیں کہ جبیر نے کہا: میں حج کرنے گیا تو حضرت عائشہ سے بھی ملنے گیا۔ انھوں نے کہا: جبیر! تم نے سورۃ مائدہ پڑھی ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگیں کہ یہ آخری سورت ہے جو نازل ہوئی۔ اس میں تم جس چیز کو حلال پاؤ اُسے حلال سمجھو اور جسے حرام پاؤ اُسے حرام سمجھو۔

احمد اور ترمذی نے روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح اور حسن کہا ہے ابن مردؤیہ اور بیہقی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن عمر نے نزول کے اعتبار سے سورۃ مائدہ کو آخری سورت بتایا ہے۔

ابو عبیدہ نے محمد بن کعب قرظی کے حوالے سے روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سورۃ مائدہ رسول اللہ پر حجۃ الوداع میں اُتری۔ اُس وقت آپ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک اُونٹنی پر سوار تھے، وحی کے بوجھ سے اُونٹنی کا کندھا ٹوٹ گیا تو آپ اُتر گئے۔

ابن جریر نے ربیع بن انس سے روایت کی ہے کہ جب سورۃ مائدہ رسول اللہ پر نازل ہوئی اس وقت آپ اپنی سواری پر سوار تھے۔ وحی کے بوجھ سے اُونٹنی بیٹھ گئی۔

لے فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۱ - البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۰۲ - سیر اعلام النبلاء جلد ۱ ص ۱۰۲

الإصابہ، ابن حجر جلد ۳ صفحہ ۲۸۷ -

۲۷ تائے تفسیر درمنثور، سیوطی جلد ۳ صفحہ ۳ -

تھی لے

ابو عبیدہ نے ضمیر بن حبیب اور عطیہ بن قیس سے روایت کی ہے، وہ دونوں کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: نزول کے اعتبار سے مائدہ آخری سورت ہے جو اس میں حلال ہے اُسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام ہے، اُسے حرام سمجھو۔

اب ان تمام روایات کی موجودگی میں کوئی انصاف پسند سمجھ دار شخص کیسے یہ دعویٰ تسلیم کر سکتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت بعثت رسول کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی۔ جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے ان میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ نزول کے اعتبار سے سورۃ مائدہ قرآن کی آخری سورت ہے اور خاص کر آیہ تبلیغ حجۃ الوداع کے بعد ۸ ذی الحجہ کو امام علی کے منصبِ امامت پر تقرر سے پہلے غدیر خم میں نازل ہوئی۔ اُس دن جمعات تھی، پانچ ساعت دن گزر جانے کے بعد جبریلؑ نازل ہوئے اور آنحضرت سے بولے: اے محمد! اللہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَ
إِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ
مِنَ النَّاسِ .

اللہ تعالیٰ کا ورنہ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ کہنا واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ یا تو رسالت کا کام ختم ہو چکا ہے یا ختم ہونے کے قریب ہے اور صرف ایک اہم کام باقی رہ گیا ہے جس کے بغیر دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

اس آیت کریمہ سے یہ بھی تاثر ملتا ہے کہ رسول اللہ کو یہ اندیشہ تھا کہ جب وہ اس اہم کام کی طرف لوگوں کو بلاتیں گے تو لوگ اُن کو جھٹلائیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو تاخیر کی اجازت نہیں دی کیونکہ وقتِ توحید نزدیک تھا اور یہ اس کام کے لیے بہترین موقع تھا۔ آپ کے رشتہ ایک رشتہ سے زیادہ محبوب موجود تھے جنھوں نے ابھی ایک ہفتہ پہلے آپ کے ساتھ حج کیا تھا، ابھی تک ان کے قلوب مرسومۃ کے نور سے معمور تھے، انھیں یہ بھی یاد تھا کہ رسول اللہ نے انھیں اپنی وفات کے قریب

لے و تے سیوطی، تفسیر درمنثور جلد ۳ صفحہ ۳ -

ہونے کی خبر دی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا :
لَعَلِّي لَا أَلْقَاكُمْ بَعْدَ عَامِي هَذَا وَيُوشِكُ أَنْ
يَأْتِيَ رَسُولٌ رِئِّي وَأَدْعَى فَأَجِيبَ .

شاید اس سال کے بعد میں تم سے نہ مل سکوں۔ وہ وقت
قریب ہے جب میرے پروردگار کا بلوا آجائے گا اور مجھے جانا ہوگا۔

اب وہ وقت بھی قریب تھا جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لیے منتشر ہونے والے
تھے۔ شاید پھر اتنے بڑے مجمع سے ملاقات کا موقع نہ مل سکے۔ غدیر خم کئی راستوں کے
سنگم پر واقع تھا۔ رسول اللہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی طرح بھی ایسے سنہری
موقع کو ہاتھ سے جانے دیں۔ اور کیسے جانے دے سکتے تھے جب وحی آپ کی تھی جس
میں ایک طرح کی تنبیہ بھی تھی اور کہا گیا تھا کہ آپ کی رسالت کا دار و مدار اسی بچا
کو پہنچانے پر ہے۔ اللہ سبحانہ نے آپ کو لوگوں کے ستر سے بچانے کی ضمانت بھی دیدی
تھی اور کہہ دیا تھا کہ تکذیب سے خوف کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ آپ سے پہلے بھی کتنے
ہی رسول جھٹلائے جا چکے ہیں لیکن اس کی وجہ سے جو پیغام ان کو دیا گیا تھا وہ اس
کو پہنچانے سے باز نہیں ہے، اس لیے کہ رسول کا فرض یہی پہنچانا ہے۔ مَا عَلَيَّ
الرَّسُولُ إِلَّا الْبَلَاغُ۔ گو اللہ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اکثر لوگ حق کو پسند نہیں
کرتے لیکن جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے : گو اللہ کو معلوم ہے کہ ان میں جھٹلا
والے ہیں مگر جب بھی اللہ انھیں حجت قائم کیے بغیر چھوڑنے والا نہیں۔ لِيَلْذَكُونَ
لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۔
اس کے علاوہ آپ کے سامنے ان رسولوں کی مثال تھی جن کو ان کی قوموں
نے جھٹلایا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَ
عَادٌ وَثَمُودٌ وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ
مَدْيَنَ وَكَذَّبَ مُوسَى فَأَمَلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ

۱۔ سورہ زخرف - آیت ۷۸ ۲۔ سورہ الحاد - آیت ۲۹ ۳۔ سورہ نساء - آیت ۱۶۵۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ .

اگر یہ لوگ تم کو جھٹلاتے ہیں تو کیا ہوا، ان سے پہلے قوم نوح
اور عاد و ثمود اور قوم ابراہیم، قوم لوط اور اہل مدین بھی تو اپنے
اپنے پیغمبروں کو جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰ بھی تو جھٹلائے جا چکے
ہیں۔ چنانچہ پہلے تو میں کافروں کو قہمت دیتا رہا پھر میں نے انھیں
پکڑ لیا۔ سو دیکھو میرا عذاب کیسا ہوا۔ (سورہ حج - آیت ۲۲ تا ۲۴)

اگر ہم تعصب اور اپنے مذہب کی جیت سے محبت کا خیال چھوڑ دیں تو یہ
تشریح زیادہ سمجھ میں آنے والی ہے اور اس آیت کے نزول سے پہلے اور بعد
میں جو واقعات پیش آئے ان سے بھی زیادہ ہم آہنگ ہے۔

علمائے اہل سنت کی ایک بڑی تعداد نے اس آیت کے امام علی کے تقرر
کے بارے میں غدیر خم کے مقام پر نازل ہونے کی روایت بیان کی ہیں اور ان کو
صحیح کہا ہے اور اس طرح اپنے شیعہ بھائیوں کے ساتھ اتفاق رائے کا مظاہرہ کیا
ہے۔ ہم مثال کے طور پر ذیل میں چند علمائے اہل سنت کا ذکر کرتے ہیں :

- (۱) حافظ ابو نعیم اصفہانی متوفی ۳۳۰ھ نزول القرآن
- (۲) امام ابو الحسن واحدی نیشاپوری متوفی ۴۶۸ھ اسباب النزول صفحہ ۱۵۰
- (۳) امام ابواسحاق ثعلبی نیشاپوری، متوفی ۴۳۰ھ تفسیر الکشف والبيان
- (۴) حافظ حاکم حسانی حنفی شواہد التنزیل لقواعد التفصیل السوایل جلد ۱ صفحہ ۱۸۷
- (۵) امام فخر الدین رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ تفسیر کبیر جلد ۱۲ صفحہ ۵۰
- (۶) حافظ جلال الدین سیوطی شافعی ۹۱۱ھ تفسیر الدر المنثور جلد ۳ صفحہ ۱۱۷
- (۷) مفتی شیخ محمد عبدالعزیز ۱۳۲۳ھ تفسیر المنار جلد ۲ صفحہ ۸۶ جلد ۶ صفحہ ۲۶۳
- (۸) حافظ ابوالقاسم ابن عساکر شافعی ۵۷۱ھ تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۸۶
- (۹) قاضی محمد بن علی شوکانی ۱۲۵۰ھ تفسیر فتح القدیر جلد ۲ صفحہ ۶۰
- (۱۰) ابن طلحہ شافعی ۶۵۲ھ مطالب السؤل جلد ۱ صفحہ ۲۴
- (۱۱) حافظ سلیمان قندوزی حنفی ۱۲۹۴ھ ینایع المودۃ صفحہ ۱۲۰
- (۱۲) محمد عبدالکریم شہرستان شافعی ۵۴۸ھ الملل والنحل جلد ۱ صفحہ ۱۶۳

(۱۳) نور الدین ابن الصبار مالکی ۵۵۵ھ الفصول المرحمہ صفحہ ۲۵

(۱۴) حافظ محمد بن جریر طبری ۳۲۰ھ کتاب الولایہ

(۱۵) حافظ ابوسعید سجستانی ۴۲۰ھ کتاب الولایہ

(۱۶) بدر الدین ابن عینی حنفی ۸۵۵ھ عمدة القاری فی شرح البخاری جلد ۵ صفحہ ۵۸۴

(۱۷) سید عبدالوہاب البخاری ۹۳۲ھ تفسیر القرآن

(۱۸) سید شہاب الدین آلوسی شافعی ۱۲۴۰ھ روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۳۸۴

(۱۹) شیخ الاسلام محمد بن ابراہیم حنفی ۷۲۲ھ فرائد السمطين جلد ۱ صفحہ ۱۸۵

(۲۰) سید صدیق حسن خان فتح البیان فی مقاصد القرآن جلد ۳ صفحہ ۶۳ - ۷۱

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب رسول اللہ کو حکم دیا گیا کہ جو کچھ آپ پر اترا ہے

اسے لوگوں تک پہنچا دیجیے تو اس پر آپ نے کیا کیا ؟

شیعہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے لوگوں کو ایک جگہ غدیر خم کے مقام پر جمع کیا

اور ایک طویل اور نہایت بلخ خطبہ دیا۔ آپ کے گواہی مانگنے پر لوگوں نے گواہی دی

کہ آپ کا ان پر خود ان سے زیادہ حق ہے۔ اس پر آپ نے علی بن ابی طالب کا ہاتھ

بلند کر کے کہا :

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا عَلَى مَوْلَاهُ اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ

وَالَاهُ وَعِمَادٍ مَنْ عَادَاهُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ وَاخْذُلْ

مَنْ خَذَلَهُ وَادِرِ الْحَقِّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ ۝

میں جس کا مولا ہوں یہ علی بھی اس کے مولا ہیں۔ خداوند!

جو علی سے دوستی رکھے اُس سے تو بھی دوستی رکھ اور جو اُن

سے دشمنی رکھے تو بھی اُس سے دشمنی رکھ۔ جو ان کی مدد کرے تو

بھی اس کی مدد کر اور جو ان کا ساتھ چھوڑ دے تو بھی اس کا ساتھ

۱۷ میں نے یہاں کچھ علماء کا ذکر کیا ہے جبکہ علامہ امینی نے اپنی کتاب الغدير میں تفصیل سے

عمرائے اہل سنت کا ذکر کیا ہے۔

۱۸ یہ حدیث حدیث غدیر کے نام سے موسوم ہے شیعہ اور سنی علماء نے اسے اپنی کتابوں میں منسوخ کیا ہے۔

پھوڑ دے۔ جس طرف علی کا رخ ہو اسی طرف حق کا رخ پھیرے۔

اس کے بعد آپ نے حضرت علیؑ کو عمامہ پہنایا اور اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ علیؑ کو

امیر المومنین ہو جانے کی مبارکباد دیں۔ چنانچہ سب نے مبارکباد دی۔ ابوبکر اور عمرؓ نے

بھی تبریک و تہنیت پیش کی اور کہا : اے فرزند ابوطالب ! تمہیں اُمت کی پیشوائی

مبارک ہو۔ آج سے تم ہر مومن اور مومنہ کے مولا بن گئے۔

اس تقریب کے اختتام پر یہ آیت نازل ہوئی :

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ

نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔

آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی

نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت

سے پسند کر لیا۔ (سورہ مادہ - آیت ۳)

یہ شیعوں کا نظریہ ہے جو ان کے نزدیک سُنَّات میں سے ہے اور جس کے

متعلق ان کے یہاں دو رائے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس واقعہ کا ذکر

اہل سنت کے یہاں بھی موجود ہے ؟

ہم نہیں چاہتے کہ جانبداری سے کام لیں اور شیعوں کی باتوں میں آجائیں۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تنبیہ کی ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جب وہ دنیاوی غرض سے باتیں کرتے

ہیں تو ان کی باتیں آپ کو اچھی معلوم ہوتی ہیں اور جو ان کے دل

میں ہے وہ اللہ کو اس پر گواہ لاتے ہیں مگر (درحقیقت) وہ سخت

جھگڑالو ہیں۔ (سورہ بقرہ - آیت ۲۰۴)

۱۷ مسند امام احمد بن حنبل - تفسیر جامع البیان، طبری - تفسیر کبیر رازی - صواعق محرقة، ابن جریر دمشقی -

دارقطنی - بیہقی - خطیب بغدادی اور شہرستانی وغیرہ نے بھی یہ واقعہ اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ لے
یہ حدیث مستم نے بھی اپنی صحیح میں اپنی سند سے زید بن ارقم ہی کے حوالے
سے بیان کی ہے لیکن مختصر کر کے۔ زید بن ارقم نے کہا:
ایک دن رسول اللہؐ نے اس تالاب کے قریب خطبہ دیا جسے خم کہا جاتا ہے
اور جو مکے اور مدینے کے درمیان واقع ہے۔ آپؐ نے حمد و ثنا اور وعظ و نصیحت کے
بعد فرمایا کہ: لوگو! میں بھی انسان ہوں، وہ وقت قریب ہے جب میرے پروردگار
کا بلاوا آجائے اور میں چلا جاؤں۔ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ پہلی
چیز کتاب اللہ ہے جس میں ہدایت اور نور ہے۔ کتاب اللہ کا دامن پکڑ لو اور اس سے
چمچے رہو۔ آپؐ نے کتاب اللہ سے تعلق پر لوگوں کو اکسایا اور رغبت دلائی۔ پھر کہا:
دوسرے میرے اہل بیت۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ کو یاد دلاتا
ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں، میں اپنے
اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔ (آپؐ نے زیادہ تاکید کے لیے
تین بار کہا) علیہ

اگرچہ امام مسلم نے واقعہ کو مختصر کر کے بیان کیا ہے اور پورا واقعہ بیان نہیں کیا
لیکن بحمد اللہ اتنا بھی کافی و شافی ہے۔ اختصار شاید زید بن ارقم نے خود کیا ہے، کیونکہ
وہ سیاسی حالات کی وجہ سے "حدیث غدیر" کو چھپانے پر مجبور تھے۔ یہ بات سیاق حدیث
سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ راوی کہتا ہے کہ میں، حصین بن سبرہ اور عمر بن مسلم ہم
تینوں زید بن ارقم کے پاس گئے۔ جب ہم بیٹھ گئے تو حصین نے زید سے کہا: آپ
نے بڑے اچھے دن دیکھے ہیں، آپؐ نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے، آپؐ کی باتیں سنیں،
آپؐ کے ساتھ غزوات میں شرکت کی، آپؐ کے پیچھے نماز پڑھی، ہمیں بھی کچھ سنائیے
جو آپؐ نے رسول اللہؐ سے سنا ہو۔ زید نے کہا: بھتیجے! میں بڑھا ہو گیا ہوں اور

میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، رسول اللہؐ کی بعض باتیں جو مجھے یاد تھیں، اب بھول گیا ہوں
اس لیے میں جو کچھ سناؤں، وہ سن لو اور جو نہ سناؤں تو مجھے اس کے سننے کی تکلیف
نہ دو۔ اس کے بعد کہا: ایک دن رسول اللہؐ نے ہمیں اس تالاب کے قریب خطبہ دیا،
جسے خم کہا جاتا ہے۔ الخ

اس سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ حصین نے زید بن ارقم سے غدیر کے
واقعہ کے بارے میں دریافت کیا تھا اور یہ سوال دوسرے لوگوں کی موجودگی میں پوچھ
کر زید کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زید کو معلوم تھا کہ اس
سوال کا صاف جواب ایسی حکومت کے ہوتے ہوئے انھیں مشکلات میں مبتلا کر سکتا
تھا جو لوگوں سے یہ کہتی ہو کہ علی بن ابی طالبؑ پر لعنت کریں۔ اسی لیے انھوں نے
سائل سے معذرت کر لی تھی کہ ان کی عمر زیادہ ہو گئی ہے اور وہ بہت کچھ بھول گئے
ہیں۔ پھر انھوں نے حاضرین سے مزید کہا کہ جو کچھ میں سناؤں وہ سن لو اور جو نہ سناؤ
چاہوں اس کے سننے کی تکلیف نہ دو۔

اگرچہ خوف کے مارے زید بن ارقم نے واقعہ کو بہت مختصر کر کے بیان کیا ہے
پھر بھی، اللہ انھیں جزائے خیر دے انھوں نے بہت سے حقائق بیان کر دیے اور
نامیہ بغیر "حدیث غدیر" کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہؐ نے
ہمیں خطبہ دیا اس تالاب کے نزدیک جسے خم کہا جاتا ہے اور جو مکے اور مدینے کے درمیان
واقع ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کی فضیلت بیان کی اور بتلایا کہ علیؑ حدیث نقلین
کی رو سے کتاب اللہ کے ساتھ شریک ہیں، لیکن یہاں بھی علیؑ کا نام نہیں لیا اور
یہ لوگوں کی ذہانت پر چھوڑ دیا کہ وہ خود نتیجہ نکال لیں۔ کیونکہ یہ سب مسلمانوں کو
معلوم ہے کہ علیؑ ہی اہل بیت نبوت کے سردار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں
کہ خود امام مسلم نے بھی حدیث کا وہی مطلب سمجھا جو ہم نے سمجھا ہے کیونکہ انھوں
نے یہ حدیث باب فضائل علی بن ابی طالبؑ میں بیان کی ہے حالانکہ حدیث میں
علی بن ابی طالبؑ کا نام تک نہیں۔

طبرانی نے صحیح سند سے معجم کبیر میں زید بن ارقم اور حذیفہ بن ُاسید غفاری
سے روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے غدیر خم میں درختوں کے نیچے

خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا: اب وقت آگیا ہے کہ میرا بلاوا آجائے اور میں چلا جاؤں۔ میری بھی ذمہ داری ہے اور تمھاری بھی ذمہ داری ہے۔ اب تم کیا کہتے ہو؟ سب نے کہا: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا اور کنش کی ادھیں نصیحت کی، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، موت حق ہے اور موت کے بعد زندہ ہونا برحق ہے۔ قیامت ضرور آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ قبر کے مردوں کو ضرور زندہ کرے گا۔ حاضرین نے کہا: جی ہاں! ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے اللہ تو اس کا گواہ رہنا۔ پھر فرمایا: لوگو! اللہ میرا مولا ہے اور میں مومنین کا مولیٰ ہوں۔ میرا ان پر خود ان سے زیادہ حق ہے۔ پس جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ (علیؑ) بھی مولا ہیں۔ اے اللہ! جو ان سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ کر صغاء تک دوستی رکھ اور جو ان سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔ پھر فرمایا: میں تم سے آگے جا رہا ہوں، تم حوض پر ضرور آؤ گے، حوض یہاں سے لے کر صغاء تک کے فاصلے سے چوڑا ہے۔ اس میں اتنے چاندی کے پیالے ہیں جتنے آسمان پر ستارے۔ جب تم میرے پاس آؤ گے تو میں تم سے ثقین کے بارے میں پوچھوں گا کہ تم نے میرے بعد ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ ثقل اکبر کتاب اللہ ہے۔ یہ ایک ڈوری ہے جس کا ایک سر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سر تمھارے ہاتھ میں۔ اس لیے اسے مضبوط پکڑے رہنا۔ نہ مگر اہی اختیار کرنا اور نہ اپنی روش بدلنا۔ ثقل اصغر میری عزت میرے اہل بیت ہیں۔ خدائے لطیف و خبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ وہ دونوں ختم نہیں ہوں گے جب تک میرے پاس حوض پر نہ آجائیں۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل نے براء بن عازب سے دو طریقوں سے یہ روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ تھے۔ جب ہم غدیر پر آئے تو

۱۔ یہ روایت ابن حجر نے صحیح ترمذی میں طبرانی اور ترمذی سے نقل کی ہے۔

مؤذن رسولؐ نے پکار کر کہا: اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ۔ رسول اللہ نے بے درختوں کے نیچے جگہ صاف کر دی گئی۔ آپ نے ظہر کی نماز پڑھا، پھر علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ میرا مومنین پر خود ان سے زیادہ حق ہے۔ سب نے کہا: جی ہاں معلوم ہے۔ آپ نے دوبارہ دریافت کیا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ میرا ہر مومن پر خود اس سے زیادہ حق ہے۔ سب نے اقرار کیا تب آپ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَاِلٰی مَنْ وَاِلَاہُ وَعَادٍ مَنْ عَادَاہُ۔

جس کا میں مولا ہوں، علیؑ بھی اُس کے مولا ہیں۔ اے اللہ! جو اُن سے دوستی رکھے تو بھی اُس سے دوستی رکھ اور جو اُن سے دشمنی رکھے تو بھی اُن سے دشمنی رکھ۔

اس کے بعد عمرؓ جب علیؑ سے ملے تو بولے: ابن ابی طالب مبارک ہو تم ہر مومن اور مومنہ کے مولا بن گئے۔ خلاصہ یہ کہ جن محدثین کا ہم نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ اور بھی سبب آورہ علمائے اہل سنت نے حدیث غدیر کی روایت اپنی کتابوں میں بیان کی ہے، جیسے ترمذی، ابن ماجہ، ابن عساکر، ابن صبان، مالکی، ابن اثیر، ابن مغازی، ابن حجر، ابونعیم، سیوطی، خوارزمی، ہیثمی، سلیمان قندوزی، حموی، حاکم حسکانی اور امام غزالی۔ امام بخاری نے یہ روایت اپنی تاریخ میں بیان کی ہے۔ مختلف مسلک و مذاہب کے پہلی صدی سے چودھویں صدی ہجری تک کے ان علماء کی تعداد جنہوں نے اپنی کتابوں میں یہ روایت بیان کی ہے تین سو ساٹھ سے

۱۔ جب کہیں رسول اللہؐ صحابہ کرام کو کوئی اہم حکم دینا چاہتے تھے تو انھیں نماز جماعت میں شمولیت کی دعوت دیتے تھے اس نماز میں حاضر ہونا ان کے لیے نماز جو کہ طرح فرض ہوتا تھا۔ اس اجتماعی نماز کے لیے نادی الصلاۃ جامعہ پکارتا تھا۔ نیز نماز استسقاء اور نماز آیات وغیرہ میں بھی اسی شمار سے لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ (ناشر) ۲۔ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۸۱۔ کنز العمال جلد ۱۵ صفحہ ۱۱۷۔ فضائل الخمسة من الصحاح جلد ۱ صفحہ ۳۵۰۔

سے اوپر ہے۔ جو شخص مزید تحقیق کرنا چاہے وہ علامہ امینی کی کتاب الغدیر کا مطالعہ کرے یہ

کیا اس پر بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ”حدیث غدیر“ شیعوں کی گھڑی ہوئی ہے؟

عجیب و غریب بات یہ ہے کہ جب حدیث غدیر کا ذکر کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نے اس کا نام بھی نہیں سنا۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس حدیث کے بعد بھی جس کی صحت پر سب کا اتفاق ہے علمائے اہل سنت یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا اور معاملہ شور مچی پر چھوڑ دیا تھا۔ اللہ کے بندو! کیا خلافت سے متعلق اس سے بھی زیادہ صاف اور صریح

کوئی حدیث ہو سکتی ہے؟

یہاں میں اپنی اس بحث کا ذکر کروں گا جو ایک دفعہ تیونس کی جامعہ بیتونہ کے ایک عالم سے ہوئی تھی۔ جب میں نے اُن صاحب سے خلافت علیؑ کے ثبوت میں حدیث غدیر کا ذکر کیا تو انھوں نے اس حدیث کے صحیح ہونے کا تو اعتراف کیا لیکن ایک پیوند لگا دیا۔ انھوں نے مجھے اپنی لکھی ہوئی قرآن کی تفسیر دکھائی، جس میں ”حدیث غدیر“ کا ذکر تھا اور اس کو صحیح بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے لکھا تھا:

شیعوں کا خیال ہے کہ یہ حدیث سیدنا علیؑ کرم اللہ وجہہ کی خلافت پر نص ہے لیکن اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ یہ دعویٰ سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان ذوالنورین کی خلافت کے منافی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حدیث میں جو لفظ مولا آیا ہے اس کے معنی محبت و مددگار

علامہ امینی کی کتاب الغدیر گیارہ جلدوں میں ہے۔ یہ بڑی نفیس کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے برسوں تحقیق کے بعد غدیر سے متعلق سب مواد اہل سنت کی کتابوں سے جمع کیا ہے۔

کے لیے جائیں، جیسا کہ یہ لفظ ان معنوں میں قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی اس لفظ کے یہی معنی سمجھے ہیں۔ تابعین اور مسلمان علمائے ان سے یہی معنی سیکھے ہیں، اس لیے زوافض جو اس حدیث کی دلیل کرتے ہیں اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ خلفاء کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور صحابہ رسول پر لعن طعن کرتے ہیں۔ صرف یہی بات ان کے جھوٹے اور غلط دعوؤں کے بطلان کے لیے کافی ہے۔ میں نے ان عالم سے پوچھا: یہ بتلائیے کہ کیا واقعی یہ قصہ غدیر خم میں پیش

آیا تھا؟ انھوں نے جواب دیا: اگر پیش نہ آتا تو علماء اور محدثین اسے کیوں بیان کرتے۔

میں نے کہا: کیا یہ بات رسول اللہ کے شایان شان ہے کہ وہ جنتی ہوئی دھڑ میں اپنے اصحاب کو جمع کر کے ایک طویل خطبہ صرف یہ کہنے کے لیے دیں کہ علیؑ تمہارا محبت و ناصر ہے۔ یہ تشریح آپ کی سمجھ میں آتی ہے؟ کہنے لگے کہ بعض صحابہ نے علیؑ کی شکایت کی تھی، ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو علیؑ سے بغض اور اختلاف رکھتے تھے۔ رسول اللہ نے اس بغض کے ازالے کے لیے فرمایا: علیؑ تو تمہارا محبت و ناصر ہے۔ مطلب یہ تھا کہ علیؑ سے محبت رکھو، بغض و عناد نہ رکھو۔

میں نے کہا: اتنی سی بات کے لیے سب کو روکنے، ان کے ساتھ نماز پڑھنے اور خطبے کو ان الفاظ سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ: ”کیا میرا تم پر تم سے زیادہ حق نہیں؟“ یہ آپ نے مولا کے معنی کی وضاحت کے لیے ہی تو کہا تھا۔ اگر جو آپ کہتے ہیں وہی صحیح ہے تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جن لوگوں کو علیؑ سے شکایت تھی آپ ان کو بلا کر کہہ دیتے کہ علیؑ تو تمہارا دوست اور مددگار ہے۔ بات ختم ہو جاتی۔ ایک لاکھ سے زیادہ جمع کو دھوپ میں روکنے کی جس میں بڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں، کیا ضرورت تھی؟ کوئی ہوشمند تو یہ بات کبھی مان نہیں سکتا!

کہنے لگے : تو کیا کوئی ہوشناریہ مان سکتا ہے کہ جو بات تم اور شیعہ سمجھ گئے وہ ایک لاکھ صحابہ نہ سمجھ سکے ؟

میں نے کہا : پہلی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے صرف تھوڑے سے لوگ تھے جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔ دوسرے ، وہ بھی بالکل وہی سمجھے جو میں اور شیعہ سمجھے ہیں۔ جب ہی تو علماء راوی ہیں کہ ابوبکر اور عمر یہ کہہ کر علی کو تبریک پیش کر رہے تھے کہ مبارک ہو ابن ابی طالب ! اب تم ہر مومن اور مومنہ کے مولا ہو گئے ہو !

کہنے لگے : پھر رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انھوں نے علیؑ کی بیعت کیوں نہیں کی ؟ کیا وہ نعوذ باللہ رسول اللہؐ کے حکم کی مخالفت اور حکم عدول کر رہے تھے۔

میں نے کہا : علمائے اہل سنت اپنی کتابوں میں خود تسلیم کرتے ہیں کہ بعض صحابہؓ تو خود آپؐ کی زندگی اور آپؐ کی موجودگی ہی میں آپؐ کے احکام کی مخالفت کیا کرتے تھے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر انھوں نے آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے احکام پر عمل نہیں کیا۔ پھر جب صحابہؓ کی اکثریت اسامہ بن زید کو امیر لشکر بنائے جانے پر ان کی کم عمری کی وجہ سے معترض تھے حالانکہ وہ محض محدود نوعیت کی تئیل المدت، مہم تھی تو وہ علیؑ کا زعمی کے باوجود مدت العمر کے لیے خلیفہ اور حکمران بنایا جانا کیسے قبول کر سکتے تھے ؟ آپؐ خود کہہ رہے ہیں کہ بعض صحابہؓ علیؑ سے انقبض اور کینہ رکھتے تھے۔

گھبرا کر کہنے لگے : اگر علیؑ کر اللہ وجہہ و رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوتا کہ رسول اللہؐ نے انھیں خلیفہ نامزد کیا ہے تو وہ کبھی اپنا حق نہیں چھوڑ سکتے تھے اور نہ خاموشی اختیار کر سکتے تھے۔ وہ تو اتنے دلیر اور بہادر تھے کہ سب صحابہؓ ان سے ڈرتے تھے مگر وہ کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے۔

میں نے کہا : حضرت ! یہ ایک موضوع ہے، میں اس میں الجھنا نہیں چاہتا کیونکہ آپؐ صحیح احادیث نبویؐ ہی کو نہیں مانتے بلکہ ناموس صحابہؓ کے تحفظ کے لیے ان کی اولیٰ کرتے اور ان کے کچھ کے کچھ معنی بیان کرتے ہیں۔ میں ایسے میں کیسے آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ امام علیؑ نے کیوں خاموشی اختیار کی اور خلافت پر اپنے حق کے لیے احتجاج نہیں کیا۔ وہ صاحبِ منکر لائے اور کہا : میں تو خود سیدنا علیؑ کو سب سے افضل سمجھتا ہوں اور اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں صحابہؓ میں سے کسی کو بھی ان پر ترجیح نہ دیتا،

کیونکہ وہ شہرِ علم کا دروازہ تھے، شیرِ نڈا تھے لیکن اللہ سبحانہ کی مشیت جس کو چاہتی ہے آگے بڑھاتی ہے اور جس کو چاہتی ہے پیچھے ہٹاتی ہے۔ لَا يُسْتَلَّ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُونَ۔ (اللہ سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ کیا کرتا ہے یا اللہ سب سے جواب طلب کر سکتا ہے)۔

بُکرانے کی میری باری تھی۔ میں نے کہا : یہ بھی ایک دوسرا موضوع ہے اگر اس پر گفتگو شروع ہوئی تو تھدیر کی بحث چھڑ جائیگی جس پر ہم پہلے بات چیت کر چکے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں اپنی اپنی راستے پر قائم رہے۔

جناب والا ! مجھے تعجب اس پر ہے کہ جب بھی میری گفتگو کسی سنی عالم سے ہوتی ہے اور میں اسے لاجواب کر دیتا ہوں، وہ فوراً ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہے اور اصل بات نیچ میں ہی رہ جاتی ہے۔ وہ صاحبِ بولے : میں تو اپنی رائے پر قائم ہوں، میں نے تو بات نہیں بدلی بہر حال میں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا اور دیر تک سوچتا رہا کہ کیا وجہ ہے کہ مجھے اپنے علماء میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ملتا جو اس مٹر گشت میں آخر تک میرا ساتھ دے اور ہمارے یہاں کے محاورے کے مطابق دروازے کو اس کی ٹانگ پر کھڑا رکھے۔

بعض سنی بات تو شروع کرتے ہیں لیکن جب اپنے اقوال کی دلیں پیش نہیں کر سکتے تو یہ کہہ کر فریج نکلنے کی کوشش کرتے ہیں کہ

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ۔

وہ لوگ تھے جو گزر گئے۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ، تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔

بعض لوگ کہتے ہیں : ہمیں گڑے مڑے اکھیڑنے اور جھگڑے کھڑے کرنے سے کیا؟ اہم بات یہ ہے کہ شیعہ اور سنی دونوں ایک خدا کو مانتے ہیں، ایک رسولؐ کو مانتے ہیں، اتنا ہی کافی ہے۔

بعض تو مختصر بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں : صحابہؓ کے معاملے میں خدا سے

ڈرو۔“ اب ایسے لوگوں کے ساتھ کس علمی بحث کی گنجائش کہاں۔ اور رجوع الی الحق کی کیا صورت۔ حق سے ہٹ کر تو گمراہی ہی ہے۔ ان لوگوں کو اس قرآنی اسلوب کی کیا خبر جس میں دلیل پیش کرنے کو کہا گیا ہے۔ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ)۔

اکمال دین کی آیت کا تعلق بھی خلافت سے ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِيْنًا .

شیعوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت امام علیؑ کے خلیفہ المسلمین کی حیثیت سے تقرر کے بعد غدیر خم کے مقام پر نازل ہوئی۔ یہ روایت ائمہ اہل بیت کی ہے۔ اور اسی بنا پر شیعہ امامت کو اصول دین میں شمار کرتے ہیں۔ جن سنی علما نے یہ روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت غدیر خم میں امام علیؑ کے تقرر کے بعد نازل ہوئی، ان کی تعداد تو بہت ہے۔ ہم مثال کے طور پر چند ناموں کا تذکرہ کرتے ہیں :

(۱) ابن مغالہ شافعی مناقب علی بن ابی طالبؑ صفحہ ۱۹۔ متوفی ۳۸۳ھ

(۲) خطیب بغدادی تاریخ بغداد جلد ۸ صفحہ ۵۹۲۔ متوفی ۶۶۳ھ

(۳) ابن عساکر تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۷۵

(۴) حافظ سیوطی تفسیر الانفاق جلد ۱ صفحہ ۱۳

(۵) حافظ سیوطی تفسیر الدر المنثور جلد ۳ صفحہ ۱۹

(۶) خوارزمی حنفی مناقب امیر المومنین صفحہ ۸۰۔ متوفی ۵۶۸ھ

(۷) سبط ابن جوزی تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۰۔ متوفی ۶۵۷ھ

(۸) حافظ ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم جلد ۲ صفحہ ۱۴۔ متوفی ۷۴۷ھ

(۹) حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۲۱۳

(۱۰) آلوسی تفسیر روح المعانی جلد ۶ صفحہ ۵۵

(۱۱) حافظ قدوزی حنفی تنایع المودۃ صفحہ ۱۱۵

(۱۲) حافظ حسکانی حنفی تفسیر سوانح التنزیل جلد ۱ صفحہ ۱۵۔ متوفی ۱۱۹۷ھ

اس سب کے باوجود علمائے اہل سنت نے ”عظمت صحابہ“ کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا ہے کہ اس آیت کا نزول کسی اور موقع پر دکھایا جائے۔ کیونکہ اگر علمائے اہل سنت یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم میں نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے ضمنی طور پر اس کا بھی اعتراف کر لیا کہ علی بن ابی طالبؑ کی ولایت ہی وہ چیز تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کیا اور مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام کی۔ اعتراف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت علیؑ سے پہلے تین خلفاء کی خلافت ہو ابن کر اڑ جائے گی، صحابہ کی عدالت کی بنیاد ہل جائے گی۔ دبستان خلافت منہدم ہو جائیگا اور بہت سی احادیث اس طرح گچھل جائیں گی جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔ اصحاب مذاہب غبار بن کر اڑ جائیں گے، بہت سے راز افشا ہوں گے اور غیب کھل جائیں گے۔ لیکن یہ ہونا ناممکن ہے کیونکہ معاملہ ایک بہت بڑے گروہ کے عقیدے کا ہے جس کی اپنی تاریخ ہے، اپنے علماء ہیں اور اپنے سربراہان و درجہ حضرات ہیں اس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ بخاری و مسلم جیسے لوگوں کی تکذیب کریں جن کی روایت کے مطابق یہ آیت عرفہ کی شام کو جمعہ کے دن نازل ہوئی۔

اس طرح پہلی روایات محض شیعوں کی خرافات بن جاتی ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں اور شیعوں کو مطعون کرنا صحابہ کو مطعون کرنے سے بہتر بن جاتا ہے، کیونکہ صحابہ تو معصوم عن الخطا ہیں۔ اور کسی کو یہ حق نہیں کہ ان کے افعال و اقوال پر نکتہ چینی کرے۔ یہ شیعہ! وہ تو مجوسی ہیں، کافر ہیں، زندیق ہیں، ملحد ہیں، ان کے مذہب کا بانی عبداللہ بن سباؑ ہے جو یہودی تھا اور اسلام اور مسلمانوں

لے اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی اقتدار کو گئے ہدایت پاؤ گے۔ ابن عبداللہ بن سباؑ کا کوئی وجود نہیں۔ دیکھیے کتاب عبداللہ بن سباؑ مؤلفہ علامہ ترمذی عسکری، کتاب الفتنہ مؤلفہ طحاہین اور کتاب الصلۃ بین التصوف والتشیع مؤلفہ ڈاکٹر مصطفیٰ کامل شیبی۔ آخر الذکر کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن سباؑ سیدنا عمار بن یاسرؓ کو کہا گیا ہے، دل چاہے تو کتاب کا مطالعہ کیجیے!

ہم دیکھتے ہیں کہ شورعی تحریک کے لیڈر ابوبکر نے جو شورعی کے ذریعے منصب خلافت تک پہنچے تھے، خود ہی دو سال بعد اس اصول کو توڑ دیا تھا جب انھوں نے اپنے مرض الموت میں عمر بن خطاب کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ کیونکہ انھیں اپنے زمانہ حکومت میں احساس ہو گیا تھا کہ خلافت کے امیدوار بہت ہیں اور لوگ خلافت کو لپاچا رہی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں، اس لیے ایسے فتنے کا اندیشہ ہے جو امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ یہ اس صورت میں ہے جب ہم ابوبکر کے بارے میں حسن ظن سے کام لیں۔ لیکن اگر انھیں خود معلوم تھا کہ دراصل خلافت کا فیصلہ نص سے ہوتا ہے، تو پھر یہ ایک دوسرا معاملہ ہے۔

ادھر عمر بن خطاب جو سقیفہ کے موقع پر ابوبکر کی خلافت کے محرک اور معمار تھے اپنے دور خلافت میں علانیہ کہتے تھے کہ

ابوبکر کی بیعت بلا مشورہ اور اچانک ہو گئی تھی، لیکن اللہ نے مسلمانوں کو اس کے بُرے نتائج سے محفوظ رکھا ہے

اس کے بعد جب عمر ابولؤلؤ فیروز کے وار سے زخمی ہو گئے اور انھیں اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تاکہ وہ خلافت کے لیے اپنے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے۔ لیکن انھیں یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چند لوگ بھی اس کے باوجود کہ انھیں رسول اللہ کی صحبت کا شرف حاصل تھا، وہ سابقین اولین میں سے تھے اور زہد و تقویٰ میں ممتاز تھے، انسانی جذبات سے ضرور متاثر ہوں گے۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے اور اس سے صرف معصوم ہی مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، اس لیے اختلاف کی صورت میں فیصلے کے لیے انھوں نے عبدالرحمن بن عوف کا پلہ جھکا دیا اور کہا کہ اختلاف کی صورت میں اس فریق کے حق میں فیصلہ ہو گا جس کے ساتھ عبدالرحمن بن عوف ہوں گے۔ اس کے بعد اس کمیٹی نے خلافت کے لیے امام علیؑ کا انتخاب کر دیا لیکن شرط یہ رکھی کہ وہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہؐ اور سنت شیخین یعنی ابوبکر اور عمر کی سنت کے مطابق حکومت کریں گے۔ علیؑ نے کتاب اللہ

اور سنت رسول اللہؐ کی بات تو تسلیم کر لی لیکن سنت شیخین کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا یہ عثمان نے یہ شرائط منظور کر لیں، چنانچہ ان کی بیعت کر لی گئی۔ علیؑ نے اس موقع پر کہا تھا:

فَيَا لِلَّهِ وَاللَّشُّورِي! مَتَى اعْتَرَضَ الرَّيْبُ فِتْ
مَعَ الْأَوَّلِ مِنْهُمْ، حَتَّى صِرْتُ أَقْرَبُ إِلَى هَٰذِهِ
النَّظَائِرِ! لَكِنِّي أَسْفَعْتُ إِذْ أَسْفَعُوا وَطَرْتُ إِذْ
طَارُوا، فَصَعَا رَجُلٌ مِنْهُمْ لِيُضْعِفَهُ وَمَالَ الْأَحَرَّ
لِيُصْهِرَهُ مَعَ هَيْنَ وَهَيْنٍ.

قسم بخدا! کہاں علی اور کہاں یہ نام نہاد شورعی۔ ان لوگوں میں کے پہلے حضرت (ابوبکر) کی نسبت میری فضیلت میں شک ہی کب تھا جو اب ان لوگوں نے مجھے اپنے جیسا سمجھ لیا ہے؟ (لیکن میں جی کڑا کر کے شورعی میں حاضر ہو گیا) اور نشیب و فراز میں ان کے ساتھ ساتھ چلا مگر ان میں سے ایک نے بغض و حسد کے مارے میرا ساتھ نہ دیا اور دوسرا دامادی اور ناگفتہ بہ باتوں کی باعث ادھر جھک گیا۔ (بیج اسلاف - خطبہ ششقیہ)

جب یہ ان لوگوں کا حال تھا جو مسلمانوں میں منتخب اور آخِص الخواص تھے کہ وہ بھی جذبات کی رو میں بہ جالتے تھے اور بغض و حسد اور عصبیت سے متاثر ہوتے تھے تو پھر عام دنیا داروں کا تو ذکر ہی کیا۔ بعد میں عبدالرحمن اپنے اس انتخاب پر پچھتائے بھی۔ اور جب عثمان کے دور میں وہ واقعات پیش آئے جو معلوم ہیں تو وہ عثمان پر بگڑے بھی کہ انھوں نے اپنے عہد کا پاس نہیں کیا۔ اور جب کبار صحابہ نے ان سے آکر کہا کہ عبدالرحمن یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے، تو انھوں نے کہا کہ مجھے عثمان سے یہ

لہ طبری، تاریخ الامم والملوکہ۔ ابن اثیر، الكامل فی التاريخ

۱۰ سعد بن ابی وقاص کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے حضرت عثمان کے بعد بھی حضرت علیؑ کی بیعت نہیں کی۔

۱۱ عبدالرحمن بن عوف کی طرف اشارہ ہے۔ یہ حضرت عثمان کی سوتیل بہن کے شوہر تھے۔ (ناشر)

توقع نہیں تھی، مگر اب میں نے قسم کھالی ہے کہ عثمان سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ کچھ دن بعد عبدالرحمن کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک بھی ان کی عثمان سے بول چال بند تھی۔ بلکہ کہتے ہیں کہ ان کی بیماری میں عثمان ان کی عیادت کے لیے گئے تو عبدالرحمن نے دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ بات نہیں کی۔

پھر جو ہونا تھا وہ ہوا۔ عثمان کے خلاف شورش بھڑک اٹھی اور آخر وہ قتل ہو گئے۔ امت ایک بار پھر انتخاب کے مرحلے سے گزری۔ خلافت کے امیدواروں میں : طلیق بن طلیق، معاویہ بن ابی سفیان، عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، مروان بن حکم وغیرہ شامل تھے، مگر اس بار علیؑ کو چنا گیا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ اسلامی مملکت میں انتشار پھیل گیا۔ اور وہ منافقوں، مملکت کے دشمنوں، مستکبروں اور ان لاکھوں کی جولا نگاہ بن گئی جو ہر قیمت پر مسند خلافت پر متمکن ہونے کے خواہاں تھے۔ چاہے اس کے لیے کوئی طریقہ بھی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے اور کتنے ہی بیگناہوں کا خون کیوں نہ بہانا پڑے۔ اور یہ کہ اس ۲۵ سالہ مدت میں خدا و رسولؐ کے احکام میں تحریف بھی کی گئی۔ پس امام علیؑ ایک ایسے بحران میں پھنس گئے جس کے ہر طرف بھری ہوئی موجیں تھیں، ماحول تیرہ و تار یک تھا، منہ زور خواہشات کا زور تھا۔ امام علیؑ کا عہد خلافت ایسی نگوں ریز جنگوں میں گزرا جو باغیوں، ظالموں اور منحذروں نے ان پر مسلط کر دی تھیں۔ وہ اس بحران سے جام شہادت نوش کر کے ہی نکل سکے۔ اور امت محمدیہ کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے اس دنیا سے چلے گئے۔ فَلَئِمَّا اللَّهُ عَلَيْهِ۔ یہ سب شوری اور انتخاب کے تصور کا شاخصانہ تھا۔

اس کے بعد امت محمدیہ خون کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اس کی قسمت کے فیصلے احقوں اور ذیلیوں کے ہاتھ میں آ گئے۔ پھر شوری کٹ کھنی بادشاہت میں بد گئی اور اس نے قیصری اور کسروی کی شکل اختیار کر لی۔ معاویہ کے عہد سے خلافت

لے طبری، تاریخ الامم والملوک۔ ابن اثیر الكامل فی الساریج، مسندہ کے واقعات۔ شیخ محمد عبدہ شرح نہج البلاغہ جلد ۱۔

۲۵ اس شخص کو رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے دن واجب القتل قرار دیا تھا۔

موروث ہو گئی اور بیٹا باپ کا جانشین ہونے لگا۔

وہ دور ختم ہو گیا جسے خلافت راشدہ کہا جاتا ہے اور جس دور کے چار خلفاء۔ خلفائے راشدین کہلاتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ان چار میں سے بھی صرف ابو بکر اور علیؑ انتخاب اور شوری کے ذریعہ سے خلیفہ ہوئے تھے۔ ان میں سے اگر ہم ابو بکر کو چھوڑ دیں کیونکہ ان کی بیعت اچانک ہوئی تھی اور اس میں آج کل کی اصطلاح میں حربہ اختلاف نے شرکت نہیں کی تھی جو علیؑ، ان کے حامی صحابہ اور بنی ہاشم پر مشتمل تھی، تو صرف علی بن ابی طالب ہی رہ جاتے ہیں جن کی بیعت واقعی شوری اور آزادی رسلے کے اصول کے تحت منعقد ہوئی۔ اور علیؑ کے انکار کے باوجود مسلمانوں نے ان سے بیعت کی لاکھوں بعض صحابہ نے بیعت سے پہلو تہی ضرور کی لیکن ان پر زبردستی نہیں کی گئی اور نہ انھیں کوئی دھمکی دی گئی۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ علی بن ابی طالبؑ نص قطعی کے ذریعے سے بھی خلیفہ ہوں اور مسلمان ان کا انتخاب بھی کریں۔ اب علیؑ کی خلافت پر کیا سنی، کیا شیعہ پوری امت مسلمہ کا اجماع ہے اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے، دوسرے خلفاء کے بارے میں اختلاف ہے۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس نعمت خداوندی کی قدر نہیں کی۔ اگر قدر کرتے تو ان پر آسمانی برکتوں کے دروازے کھل جاتے۔ روزی کی ہرگز تنگی نہ ہوتی آج مسلمان ساری دنیا کے قائد اور سردار ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :
وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ إِنَّ كُنْتُمْ مَوْحِينَ

تم ہی سب سے سر بلند ہو گے بشرطیکہ تم سچے مومن ہو۔

لیکن ابلیس لعین تو ہمارا کھلا دشمن ہے، اس نے اللہ رب العزت سے کہہ دیا تھا کہ :

لے مثلاً اسامہ بن زید، زبیر بن العوام، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد بن اسود، عمار بن یاسر، حذیفہ بن یان، خزیمہ بن ثابت، ابو بکر اسلمی، براء بن عازب، فضل بن عباس، ابی بن کعب، سہیل بن حنیف، سعد بن عبادہ، قیس بن سعد، خالد بن سعید، ابو ایوب انصاری جابر بن عبد اللہ انصاری وغیرہ۔ (ناشر)

اور اس کی مکمل اطاعت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ
الْخَيْرَةُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ.
وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ وَهُوَ
اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَى وَالْآخِرَةِ
وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ.

تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے
پسند کرتا ہے۔ لوگوں کو پسند کا کوئی حق نہیں۔ یہ لوگ جو شرک کرتے
ہیں اللہ اس سے پاک اور برتر ہے۔ اور ان کے دلوں میں جو کچھ
پوشیدہ ہے اور جو کچھ یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں تمہارا پروردگار اس
کو جانتا ہے۔ اللہ وہی ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سب
تعریف اُسی کی ہے دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور حکومت
بھی اُسی کی ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

(سورۃ قصص - آیات ۶۸ تا ۷۰)

ان تمام باتوں سے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ رسول اللہؐ نے یوم غدیر کو عید کا
دن قرار دیا تھا۔ امام علیؑ کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کے بعد جب آپؐ پر یہ آیت
نازل ہوئی اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ تو آپؐ نے کہا : اللہ کا شکر ہے کہ
دین مکمل ہو گیا اور نعمت پوری ہو گئی۔ اللہ نے میری رسالت اور میرے بعد علی بن
ابی طالبؑ کی ولایت کو پسند کیا یہ پھر آپؐ نے علیؑ کے لیے تقریب تبریک منعقد کی
خود رسول اللہؐ ایک خیمہ میں رونق افروز ہوئے اور علیؑ کو اپنے برابر بٹھایا اور سب
مسلمانوں کو حکم دیا، ان میں آپؐ کی ازواجِ اہلبائت المؤمنین بھی شامل تھیں کہ گروہ
درگروہ علیؑ کے پاس جا کر انھیں امامت کی مبارکباد دیں اور امیر المؤمنین کی حیثیت سے
انھیں سلام کریں۔ چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا۔ اس موقع پر امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ

لے تاکم حسانی برایت ابو سعید خدریؓ اپنی تفسیر میں اور حافظ ابن قیمؒ صغہانی ما تزل معہ القرآن فی علیؑ میں۔

کو مبارکباد دینے والوں میں ابوبکر اور عمرؓ بھی شامل تھے، وہ یہ کہتے ہوئے آئے :

بَيْعَ بَيْحٍ لَكَ يَا ابْنَ أَبِي طَالِبٍ أَصْبَحْتَ وَأَمْسَيْتَ
مَوْلَانَا وَمَوْلَى كُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ. لے

جب شاعر رسولِ حسان بن ثابتؓ نے دیکھا کہ رسول اللہؐ اس موقع پر بہت
خوش اور شاداں و فرحان ہیں تو انھوں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا : یا رسول اللہؐ !
میں آپ کی اجازت سے اس موقع پر چند اشعار عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے
فرمایا : ضرور سُناؤ۔ حسان بن ثابتؓ نے جب تک تم زبان سے ہماری مدد کرتے رہو گے تمھیں
روح القدس کی تائید حاصل رہے گی۔

حسانؓ نے شعر سننے شروع کیے۔

يُنَادِيهِمْ يَوْمَ الْغَدِيرِ نَبِيُّهُمْ

يَخُصِّمُ فَاسْمَعِ يَا رَسُولَ مَنَادِيَا

(غدیر کے دن ختم کے مقام پر مسلمانوں کے پیغمبر مسلمانوں کو

پکار رہے ہیں، سنو! رسولؐ کیا کہہ رہے ہیں)

اس کے علاوہ اور بھی متعدد اشعار تھے جن کو مؤرخین نے نقل کیا ہے یہ
اس سب کے باوجود قریش نے چاہا کہ خلافت ان کے پاس ہے اور بنی ہاشم
کے یہاں خلافت اور نبوت دونوں جمع نہ ہونے پائیں تاکہ بنی ہاشم کو شیخی بگھانے
کا موقع نہ مل سکے۔ اس کی تصریح خود حضرت عمرؓ نے عبد اللہ بن عباسؓ سے ایک
دفعہ گفتگو کرتے ہوئے کی ہے۔

اس لیے پھر کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ پہلی تقریب کے بعد جو رسول اللہؐ

لے یہ قصہ امام ابو حامد غزالیؒ نے اپنی کتاب برسر العالمین صفحہ ۶ پر بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام احمد بن
حنبلؒ نے اپنی مسند جلد ۴ کے صفحہ ۲۸۱ پر اور طبریؒ نے اپنی تفسیر کی جلد ۳ کے صفحہ ۴۲۸ پر اس کا ذکر
کیا ہے۔ نیز بیہقی، شعبی، دارقطنی، فخر رازی اور ابن کثیر وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

لے جلال الدین سیوطیؒ، الآذین وھما فیما عقدہ الشُّعْرَاءُ مِنَ الْأَشْعَارِ۔

۳۱ طبریؒ، تاریخ الامم والملوک جلد ۵ صفحہ ۳۔ ابن اثیرؒ، الکامل فی التاريخ جلد ۳۱۔ شرح بیح البلاغ۔

نے خود منقذ کی تھی، کوئی عید غدیر کا جشن منائے۔

جب لوگ نصِ خلافت ہی کو بھول گئے جسے ابھی دو ہی مہینے ہوئے تھے تو غدیر کے واقعہ کی یاد کون مٹاتا جسے ایک سال ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ یہ عید تو نصِ خلافت سے منسلک تھی۔ جب وہ نص ہی باقی نہ رہی تو عید منانے کی وجہ ہی ختم ہو گئی۔

اسی طرح سالہا سال گزر گئے، یہاں تک کہ رُبِ عرصی کے بعد امام علیؑ نے اسے دوبارہ اس وقت زندہ کیا جب آپ نے اپنے عہدِ خلافت میں ان صحابہ سے جو غدیرِ خم میں موجود تھے، کہا کہ وہ کھڑے ہو کر سب کے سامنے بیعتِ خلافت کی گواہی دیں، ان میں صحابیوں نے گواہی دی جن میں سے سولہ بدری صحابہ تھے۔ یہ ایک آنس بن مالک نے کہا کہ ”مجھے یاد نہیں“ انھیں برص کی بیماری ہو گئی۔ وہ روتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے عندِ صراح علی بن ابی طالبؑ کی بددعا لگ گئی یہ

یہ عبد الصاع علی بن ابی طالب کی بدعا تھی۔
 اس طرح امام علیؑ نے اس اُنت پر محبت قائم کر دی۔ اس وقت سے آج تک
 شیعہ یوم غدیر کی یاد مناتے رہتے ہیں اور تاقیام قیامت مناتے رہیں گے۔ یہ دن
 شیعوں کے نزدیک عید اکبر ہے اور کیوں نہ ہو! جب اُس دن اللہ نے دین کو ہمارے
 لیے کامل کیا اور اس دن ہم پر نعمت تمام کی اور اسلام کو بطور ایک دین کے ہمارے
 لیے پسند کیا۔ یہ اللہ، اس کے رسول اور مومنین کی نظر میں ایک عظیم الشان دن ہے۔
 بعض علمائے اہل سنت نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ ص
 نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاَهُ فَعَلَيْ مَوْلَاهِ اَللّٰهُ تَوَالَّفَ بِهٖ اٰیٰتُ نَزَلِ
 كِ الْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنََكُمْ اَللّٰهُ ابُوْهُرَيْرَةَ کہتے ہیں کہ یہ ۱۸ ذی الحجہ کا دن
 تھا اور جس نے اس دن روزہ رکھا، اس کے لیے ساٹھ مہینوں کے روزوں کا ثواب لکھا
 جائے گا۔

جہاں تک شیعہ روایات کا تعلق ہے تو وہ ائمہ اہل بیتؑ سے اس دن کے فضائل کے بارے میں اتنی ہیں کہ بس بیان کیے جائیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ہدایت دی کہ ہم امیر المومنینؑ کی ولایت کو مانیں اور یوم غدیرہ کو عید منائیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ حدیث غدیر صیح معنی میں ایک بہت بڑا تاریخی واقعہ ہے جسے نقل کرنے پر ائمہ محمدیہ نے اتفاق کیا ہے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں تین سو ساٹھ سنی علماء نے اس حدیث کو بیان کیا ہے اور شیعہ علماء کی تعداد تو اس سے بھی زیادہ ہے۔

ان حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ امتِ اسلامیہ دو فریقوں میں تقسیم ہوگئی ہے: ایک اہل سنت، دوسرے اہل تشیع۔

اہل سنت، سقیفہ بنی ساعدہ کے شوری کے اصول پر جمے ہوئے ہیں، وہ صریح نصوص کی تائید کرتے ہیں اور حدیث غدیر وغیرہ جس پر سب راویوں کا اتفاق ہے، اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

دوسرا فریق ان نصوص پر قائم ہے اور انھیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اس فریق نے ائمہ اہل بیت کی بیعت کی ہے اور ان ہی کو مانتا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ میں جب اہل سنت کے مذہب کو گریڈتا ہوں تو مجھے اس میں کوئی اطمینان بخش چیز نظر نہیں آتی۔ خصوصاً خلافت کے معاملے میں۔ ان کے سب دلائل ظنی و اجتہاد پر مبنی ہیں۔ کیونکہ انتخاب کا قاعدہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ آج جس شخص کو ہم پسند کرتے ہیں وہ ضرور سب دوسروں سے افضل ہے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ کس کے دل میں کیا ہے۔ خود ہمارے اندر ذاتی جذبات و تعصبات چھپے ہوئے ہیں اور جب بھی متعدد اشخاص میں سے ایک شخص کو پسند کرنے کا موقع ہوتا ہے، یہ عوامل ہمارے فیصلے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ کوئی خیالی مفروضہ نہیں اور نہ اس معاملے میں کچھ مُبالغہ ہے کہ جو شخص بھی اس طرز فکر یعنی خلیفہ کے انتخاب کے تصور کا تاریخی نقطہ نظر سے مُطالعہ کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ اُصول جس کے اتنے دُشمن پھیٹ جلتے ہیں نہ کبھی کامیاب ہو سکتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کبھی کامیاب ہو۔

کے خلاف سازش کے مقصد سے حضرت عثمان کے عہد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اس طرح کی باتیں کر کے ان لوگوں کو دھوکا دینا بہت آسان ہے جن کی بچپن سے تربیت ہی تقدس صحابہ کے ماحول میں ہوتی ہو۔ (خواہ کسی صحابی نے رسول اللہ کو صرف ایک دفعہ ہی دیکھا ہو)۔

ہم کیسے لوگوں کو یقین دلائیں کہ شیعوں روایات محض شیعوں کی خرافات نہیں، بلکہ ان ائمہ اثنا عشر کی احادیث ہیں جن کی امامت نص رسول سے ثابت ہے۔ بات یہ ہے کہ قرن اول کی حکومتوں نے امام علی اور ان کی اولاد کے خلاف امت میں نفرت پھیلائی، یہاں تک کہ ان پر منبروں سے لعنت کی گئی اور شیعیان علی کو قتل کیا گیا اور ان کو گھروں سے نکال دیا گیا۔ شیعوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے دس انفارمیشن سبیل قائم کیا گیا اور طرح طرح کی افواہیں پھیلائی گئیں شیعوں سے بے بنیاد قصے اور غلط عقائد منسوب کیے گئے۔ آج کل کی اصطلاح میں اس دقت شیعہ ”جذب مخالف“ تھے، اس لیے اس وقت کی حکومتیں شیعوں کو ختم کرنے اور الگ تھلگ کرنے میں کوشاں تھیں۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کے مصنفین اور مؤرخین بھی شیعوں کو رافضی کہتے ہیں، ان کی تکفیر کرتے ہیں اور حکمرانوں کو خوش کرنے کے لیے شیعوں کا خون کرنا حلال قرار دیتے ہیں۔

جب اموی حکومت ختم ہو گئی اور عباسی حکومت برسرِ اقتدار آئی تو بعض مؤرخین اپنی ڈگر پر چلتے رہے جبکہ بعض نے اہل بیت کی حقیقت کو پہچاننا اور انھیں کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی کا شمار بھی ”خلفائے راشدین“ میں کر لیا گیا لیکن کسی کو یہ اعلان کرنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ خلافت پر سب سے زیادہ حق علی کا تھا۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اہل سنت کی صحاح میں بہت ہی کم فضائل علی

لے وجہ یہ ہے کہ ائمہ اہلبیت نے اپنے اخلاق، اپنے علوم، اپنے زہد و تقویٰ اور اپنی ان کرامات سے جو اللہ نے ان کو عطا کی تھیں، اپنے آپ کو منوالیا تھا۔

کی روایات آتی ہیں اور جو آتی ہیں وہ بھی صرف وہی ہیں جو علی سے پہلے کے خلفاء کی خلافت سے کسی طرح متصادم نہیں ہیں۔ بعض نے تو کثیر تعداد میں ایسی روایات وضع کی ہیں جن میں خود علی کی زبان سے ابوبکر، عمر، اور عثمان کے فضائل بیان کیے گئے ہیں مقصد یہ کہ بزرگم خویش کوشش یہ کی گئی ہے کہ شیعوں کا راستہ بند کر دیا جائے جو علی کی افضلیت کے قائل ہیں۔

اپنی تحقیق کے دوران مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ لوگوں کی شہرت اور عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا تھا کہ وہ علی بن ابی طالب کے ساتھ کس قدر بغض رکھتے ہیں۔ امویوں اور عباسیوں کی سرکار میں وہی مقرب تھے اور ان ہی کو بڑھایا جاتا تھا جنہوں نے امام علی کے خلاف یا توجہ کی تھی یا تلوار یا زبان سے ان کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ بعض صحابہ کا درجہ بڑھایا جاتا تھا، بعض کا گھٹایا جاتا تھا۔ بعض شعراء پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی تھی اور بعض کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ شاید ائمہ المؤمنین عائشہ کی بھی یہ قدر و منزلت نہ ہوتی اگر انھیں علی سے بغض نہ ہوتا اور انھوں نے علی کے خلاف ”جنگ جمل“ نہ لڑی ہوتی۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ عباسیوں نے بخاری، مسلم اور امام مالک کو شہرت دی کیونکہ انھوں نے اپنی کتابوں میں فضائل علی کی احادیث بہت کم نقل کی ہیں بلکہ ان کتابوں میں تو یہ تصریح بھی ہے کہ علی بن ابی طالب کو کوئی فضیلت اور فوقیت حاصل ہی نہیں تھی۔ بخاری نے تو اپنی صحیح میں ابن عمر سے روایت نقل کی ہے کہ: رسول اللہ کے زمانے میں ہم ابوبکر کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے، پھر عمر کا درجہ تھا پھر عثمان کا، پھر باقی صحابہ میں ہم کسی کو دوسروں پر فوقیت نہیں دیتے تھے لہٰذا گویا بخاری

لے صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۹۱ اور صفحہ ۲۰۱۔ باب مناقب عثمان۔

بخاری نے جلد ۴ صفحہ ۱۹۵ پر حضرت علی کے فرزند محمد بن حنفیہ سے ایک روایت منسوب کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسول اللہ کے بعد سب سے بہترین شخص کون ہے؟ انھوں نے کہا: ابوبکر۔ میں نے پوچھا: ان کے بعد؟ کہا: عمر۔ میں ڈرا کہ کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ ان کے بعد عثمان۔ اس لیے میں نے کہا: اُن کے بعد آپ؟ کہا: میں تو فقط ایک مسلمان ہوں۔

کے نزدیک علیؑ بھی دوسرے عام لوگوں کے برابر تھے۔ (پڑھیے اور سر دھینیے!)
 اسی طرح امت مسلمہ میں اور بھی فرقے ہیں جیسے معتزلہ اور خوارج وغیرہ۔
 یہ بھی وہ نہیں کہتے جو شیعہ کہتے ہیں۔ کیونکہ علیؑ اور اولاد علیؑ کی امامت کی وجہ سے ان
 لوگوں کے لیے خلافت تک پہنچنے، عوام کی گردنوں پر سوار ہونے اور ان کی قسمت اور
 املاک سے کھیلنے کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ بنی امیہ اور بنی عباس نے عہد صحابہ تابعین
 میں کیا کُل نہیں بھلائے اور آج تک حکمران کیا نہیں کرتے آرہے ہیں؟ اسی لیے
 حکمرانوں کو خواہ وہ دراشت کے ذریعے اقتدار تک پہنچے ہوں جیسے بادشاہ، خواہ وہ صدور
 ہوں جنہیں ان کی قوم نے منتخب کیا ہو، انہیں خلافت اہل بیت کا عقیدہ ایک انگٹھ
 نہیں بھاتا اور وہ اسے THEOCRACY یا ملاؤں کی حکومت کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے
 ہیں جس کا شیعہوں کے علاوہ کوئی قائل نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ شیعہ اپنی حماقت
 سے جہدِ منتظر کی امامت کے بھی قائل ہیں، جو عنقریب زمین کو عدل و انصاف سے
 اسی طرح بھر دیں گے جیسے وہ ظلم و جور سے بھری ہوئی ہے۔

اب ہم دوبارہ شکون اور غیر جانبداری کے ساتھ فریقین کے اقوال پر غور کرتے
 ہیں تاکہ یہ تصفیہ ہو سکے کہ آیت اکمال کس موقع پر نازل ہوئی تھی اور اس کی شانِ نزول
 کیا ہے تاکہ حق واضح ہو جائے اور ہم اس کی پروا کیے بغیر کہ کون خوش ہوتا ہے اور کون
 ناراض، حق کا اتباع کر سکیں۔ اصل اور سب سے ضروری بات رضائے الہی کا حصول
 ہے تاکہ اس کے عذاب سے اس دن بچ سکیں جب نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔
 کام آئے گا تو قلبِ سلیم۔

یہ دعویٰ کہ آیت اکمال عرفہ کے دن نازل ہوئی

صحیح بخاری میں طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ کچھ یہودی کہتے تھے
 کہ اگر یہ آیت ہماری قوم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو اپنی عید بنا لیتے۔ عمرؓ
 نے پوچھا کون سی آیت؟ ان لوگوں نے کہا: الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ اَللّٰهُ

عمرؓ نے کہا: میں خوب جانتا ہوں کہ یہ آیت کہاں نازل ہوئی تھی۔ یہ آیت اس وقت
 نازل ہوئی تھی جب رسول اللہؐ عرفہ کے دن دُتوف فرما رہے تھے۔

ابن جریر نے عیسیٰ بن حارثہ انصاری سے روایت کی ہے کہ ہم دیوان میں
 بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عیسائی نے ہم سے کہا: مسلمانو! تم پر ایک ایسی آیت
 نازل ہوئی ہے کہ اگر ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن اور اس ساعت کو عید
 بنا لیتے اور جب تک کوئی دو عیسائی بھی باقی رہتے ہمیشہ عید منایا کرتے۔ یہ آیت
 الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ ہے۔ ہم میں سے کسی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا
 بعد میں جب میں محمد بن کعب قرظی سے ملا تو ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا
 انہوں نے کہا: کیا تم نے اس عیسائی کی بات کا جواب نہیں دیا؟ پھر اسی سلسلے
 میں کہا کہ عمر بن خطابؓ کہتے تھے کہ جب یہ آیت رسول اللہؐ پر اُتری وہ عرفہ کے
 دن جبلِ عرفات پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ دن تو مسلمانوں کی عید رہیگا ہی جب
 تک کوئی ایک بھی مسلمان باقی ہے۔

رادی کہتا ہے کہ ہم میں سے کسی نے اسے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کی وجہ
 یہی ہو سکتی ہے کہ نہ کسی کو وہ تاریخ یاد تھی کہ جس تاریخ کو یہ آیت اُتری اور
 نہ اس دن کی عظمت سے واقف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رادی کو خود بھی اس
 پر حیرت ہوئی تھی کہ کیا بات ہے کہ مسلمان ایسے ہم دن کو نہیں مناتے۔ اسی لیے
 وہ جاکر محمد بن کعب قرظی سے ملتا ہے اور ان سے دریافت کرتا ہے۔ محمد بن کعب
 قرظی اسے بتلاتے ہیں کہ عمر بن خطابؓ کہتے تھے کہ ”یہ آیت اس وقت اُتری جب
 عرفہ کے دن رسول اللہؐ جبلِ عرفات پر کھڑے ہوئے تھے۔“ تو اگر وہ دن بطور عید
 کے مسلمانوں میں معروف ہوتا تو یہ رادی حضرات خواہ وہ صحابہ میں سے تھے یا
 تابعین میں سے اس سے ناواقف کیوں ہوتے۔ ان کے نزدیک مسلم اور مشہور
 بات یہی تھی کہ مسلمانوں کی عیدیں دو ہیں: ایک عید الفطر اور دوسری عید الاضحیٰ۔
 ہم دیکھتے ہیں کہ بخاری و مسلم جیسے علماء اور محدثین نے بھی اپنی کتبوں میں

كِتَابُ الْعِيدَيْنِ ، صَلَوةُ الْعِيدَيْنِ اور خُطْبَةُ الْعِيدَيْنِ وغیرہ کے عنوان باند ہیں۔ خاص وعام سب کے نزدیک مُسَلَّم امر یہی ہے کہ تیسری عید کا وجود نہیں۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یومِ عَرَفہ ان کے نزدیک عید نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان روایات سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کا علم نہیں تھا کہ یہ آیت کب نازل ہوئی اور وہ اس دن کو نہیں مناتے تھے اس لیے ایک دفعہ یہودیوں کو اور دوسری دفعہ عیسائیوں کو یہ خیال آیا کہ وہ مسلمانوں سے کہیں کہ اگر یہ آیت ہمارے یہاں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو عید قرار دیتے۔ اس پر عمر بن خطاب نے پوچھا کہ کونسی آیت؟ جب ان کو بتایا گیا کہ اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ والی آیت، تو انھوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ آیت کہاں نازل ہوئی، جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ عرَفہ کے دن میدانِ عرفات میں تھے۔ ہمیں اس روایت میں مُعَالَطَہ دینے کی بُو آتی ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے امام جُحَارِی کے زمانے میں عمر بن خطاب کی زبانی یہ روایت وضع کی وہ یہود و نصاریٰ کی اس رُلتے کے درمیان کہ ایسے عظیم دن کو عید کی طرح منانا چاہیے اور اپنے اس عمل کے درمیان کہ انھیں اس آیت کے نُزول کی تاریخ بھی معلوم نہیں تھی، ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے یہاں دو ہی عیدیں تھیں: پہلی عید الفطر جو ماہ رمضان کے اختتام پر یکم شوال کو ہوتی ہے اور دوسری عید الاضحیٰ جو دہم ذوالحجہ کو ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ حَاجَّ بَيْتِ اللہ الحرام اس وقت تک احرام نہیں کھولتے جب تک جمرہ عقبہ کی رُخی، قربانی اور سرسُڑانے کے بعد طوافِ افاضہ نہ کر لیں۔ اور یہ سب کام دس ذی الحجہ کو ہوتے ہیں۔ دس تاریخ ہی کو وہ عید کی ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں۔ حج میں احرام ایسا ہی ہے جیسے رمضان، جس میں روزہ دار پر متعدد چیزیں حرام ہو جاتی ہیں اور وہ چیزیں عید الفطر ہی سے حلال ہوتی ہیں۔ اسی طرح حج میں مُحَرَّم دس ذی الحجہ کو طوافِ افاضہ کے بعد ہی احرام کھولتا ہے اور اس سے پہلے اس کے لیے جہار، خوشبو، زینت، سِلے ہونے کپڑے، شکار اور ناخن اور بال کاٹنے میں سے کوئی چیز حلال نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ یومِ عَرَفہ جو ذی الحجہ کی نویں تاریخ ہے، عید کا دن نہیں

ہے۔ عید کا دن دسویں ذی الحجہ ہے اور اسی دن مسلمان ساری دنیا میں عید مناتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول کہ آیتِ اِکمالِ عَرَفہ کے دن نازل ہوئی تھی ناقابلِ فہم اور ناقابلِ تسلیم ہے۔

طُرُقِ غالب یہ ہے کہ جو لوگ خلافت میں شُورِی کے اُصول کے بانی اور اس نظریہ کے قائل تھے، انھوں نے ہی اس آیت کے نُزول کی تاریخ بھی بدل دی جو دراصل غدیرِ خم میں امام علیؑ کی ولایت کے اعلان کے فوراً بعد تھی، اس تاریخ کو یومِ عَرَفہ سے بدل دینا زیادہ آسان تھا، کیونکہ غدیر کے دن بھی ایک لاکھ یا اس سے کچھ اوپر حاجی ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔

یومِ عَرَفہ اور یومِ غدیر میں ایک خاص مُناسَبَت ہے کیونکہ حَجَّہ الْوَدَاع کے زمانے میں ان ہی دو موقعوں پر اتنے حاجی ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ایامِ حج میں حاجی متفرق طور پر ادھر ادھر رہتے ہیں، صرف عَرَفہ ہی کا دن ایسا ہوتا ہے کہ جب حاجی ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ یہ آیت عَرَفہ کے دن نازل ہوئی وہ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہؐ کے اس مشہور خطبے کے فوراً بعد نازل ہوئی جسے محدثین نے خطبہ حَجَّہ الْوَدَاع کے عنوان سے نقل کیا ہے۔

یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اس آیت کے نُزول کی تاریخ خود عمرؓ ہی نے یومِ عَرَفہ قرار دی ہو کیونکہ خلافتِ علیؑ کے سب سے بڑے مخالف وہی تھے اور انھوں نے ہی سقیفہ میں ابوبکر کی بیعت کی بنیاد قائم کی تھی۔

اس خیال کی صحت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن جریر نے قُبَيْصَہ بن ابی ذؤب سے روایت کی ہے۔ قبصہ کہتے ہیں کہ کُتُب نے کہا تھا اگر اگر یہ آیت کسی اور اُمت پر نازل ہوئی ہوتی تو وہ اس دن کو جب یہ نازل ہوئی تھی یاد رکھتے اور عید قرار دے لیتے اور اس دن سب جمع ہوا کرتے۔ عمرؓ نے سنا تو کُتُب سے پوچھا: کون سی آیت؟ کُتُب نے کہا: اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ۔ عمرؓ نے کہا: مجھے معلوم ہے، یہ آیت کب نازل ہوئی تھی اور وہ جگہ بھی معلوم ہے جہاں یہ نازل ہوئی تھی۔ یہ جُحہ کے دن نازل ہوئی تھی اور اس دن عَرَفہ تھا۔ یہ

دونوں دن اللہ کے فضل سے ہمارے لیے عید ہیں۔
 دوسری بات یہ ہے کہ یہ کہنا کہ آیہ اِکمال عرفہ کے دن نازل ہوئی، یہ تبلیغ
 يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ کے منافی ہے۔ آیہ تبلیغ میں
 رسول اللہ کو ایک ایسا اہم پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا جس کے بغیر کار رسالت
 مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس آیت کے بارے میں بحث گزر چکی اور بتایا جا چکا کہ یہ آیت
 حَجَّةُ الْوُدَّاع کے بعد مکے اور مدینے کے درمیان راستے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ روایت
 ایک سو بیس سے زیادہ صحابہ اور تین سو ساٹھ سے زیادہ علمائے اہل سنت نے
 بیان کی ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل اور نعمت کو تمام
 تو کر دیا ہو بروز عرفہ اور پھر ایک ہفتے کے بعد اپنے نبی کو جب وہ مدینے جا رہے
 تھے کسی ایسی اہم بات کو پہنچا دینے کا حکم دیا ہو جس کے بغیر رسالت ناتمام رہتی
 ہو۔ لے ارباب عقل و دانش ذرا سوچو یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے!
 تیسری بات یہ ہے، اگر کوئی جو یائے تحقیق اس خطبے کو جو رسول اللہ نے
 عرفہ کے دن دیا، غور سے دیکھے گا تو اسے اس خطبے میں کوئی نئی چیز نہیں ملے گی،
 جس سے مسلمان اس سے پیشتر ناواقف تھے اور جس کے متعلق خیال کیا جاسکے کہ
 اس سے اللہ نے دین کو کامل اور نعمت کو تمام کر دیا۔ اس خطبے میں وہی نصیحتیں
 ہیں جن کو قرآن کریم یا رسول اللہ مختلف موقعوں پر پہلے بھی بیان کر چکے تھے اور عرفہ
 کے دن ان پر مزید زور دیا گیا تھا۔ اس خطبے میں جو کچھ آیا ہے اور جسے راویوں نے
 محفوظ کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

- اللہ نے تمہاری جانوں اور تمہارے اموال کو اسی طرح محترم قرار دیا ہے جیسا کہ
 اس مہینے اور آج کے دن کو۔

- اللہ سے ڈرو! لوگوں کو اُن کے واجبات ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرو اور زمین
 میں ازراہ مثرارت فساد نہ پھیلاؤ۔ جس کے پاس کوئی امانت ہو، وہ حسب
 امانت کو لوٹا دے۔

لے سوطی، تفسیر دمشق آیات الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ کی تفسیر میں۔

- اسلام میں سب برابر ہیں۔ عربی کو عجمی پر بجز تقویٰ کے کوئی فضیلت نہیں۔
 جاہلیت میں جو خون ہوا اب وہ میرے پاؤں تلے اور جاہلیت کا جو سود کھا
 وہ بھی میرے پاؤں تلے (یعنی زمانہ جاہلیت میں جو خون ہوا اس کا انتقام
 نہیں لیا جائے گا اور جو قرض دیا گیا ہے اس پر سود کا مطالبہ نہیں کیا
 جائے گا)۔

- لوگو! نوند لے کا رواج کفر کو بڑھانا ہے آج زمانہ پھر وہیں پہنچ گیا ہے جہاں سے
 چلا تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔

- اللہ کے نزدیک، اس کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے جن میں سے چار
 حرام ہیں۔

- میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ عورتوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا۔ تم نے
 ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے اور تم نے کتاب اللہ کے حکم کے مطابق
 ان کی شرنگاہیں اپنے لیے حلال کی ہیں۔

- میں تمہیں تمہارے ملوک غلام، باندیوں کے بارے میں نصیحت کرتا ہوں،
 جو خود کھاؤ اُسی میں سے ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو اُسی میں سے ان کو
 پہناؤ۔

- مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ اسے دھوکا نہ دے، اس سے دغا نہ کرے،
 اس کی غیبت نہ کرے۔ کسی مسلمان کا خون اور اس کے مال میں سے کچھ بھی
 دوسرے مسلمان کے لیے حلال نہیں۔

- آج کے بعد شیطان اس سے ناامید ہو گیا ہے کہ اس کی پوجا کی جائے گی،
 لیکن اپنے دوسرے معاملات میں جنہیں تم معمولی سمجھتے ہو اس کی بات

لے خدا کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ ان میں سے چار مہینوں: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم
 اور رجب کو خدا نے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن جو قبیلے ان حرام مہینوں میں جنگ کرنا چاہتے تھے، کہہ کے
 موتی ان سے پیسے لے کر حرام مہینوں کو بدل دیتے تھے۔ وہ ان مہینوں کی جگہ دوسرے مہینوں کو حرام قرار
 دیتے تھے۔ (ناشر)

مانی جائے گی۔

اللہ کا بدترین دشمن وہ ہے جو اس کو قتل کرے جس نے اسے قتل نہ کیا ہو اور اسے مارے جس نے اسے مارا نہ ہو۔ جس نے آقا کا کفران کیا اس نے گویا جو اللہ نے محمد پر اتارا ہے اس کو ماننے سے انکار کیا۔ جس نے اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی اور سے اپنے آپ کو منسوب کیا تو اس پر لعنت اللہ کی فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔

مجھے لوگوں سے اس وقت تک قتال کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ نہ تسلیم کریں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر وہ یہ کہہ دیں تو میری طرف سے ان کی جان اور ان کا مال محفوظ ہوں گے سوائے اس کے کہ جو اللہ کے قانون کے مطابق ہو۔ اور ان کا فیصلہ اللہ پر ہے۔

میرے بعد دوبارہ کافر اور گمراہ نہ ہو جانا۔ ایسا نہ ہو کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

یہ ہے وہ سب کچھ جو حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ عرفہ میں کہا گیا تھا۔ میں نے اس کے مختلف ٹکڑے تمام قابل اعتماد مآخذ سے جمع کیے ہیں تاکہ کچھ چھوٹ نہ جائے میں نے رسول اللہ کی وہ سب ہدایات جن کا محدثین نے ذکر کیا ہے جو ان کی توں نقل کر دی ہیں۔ اب دیکھیے! کیا ان میں صحابہ کے لیے کوئی نئی بات ہے؟ بالکل نہیں۔ کیونکہ جو کچھ اس خطبے میں ہے، وہ قرآن و سنت میں پہلے ہی مذکور ہے۔ رسول اللہ کی پوری عمر وحی کے مطابق ہر چھوٹی بڑی بات کی تعلیم لوگوں کو دیتے گزری تھی۔ ان ہدایات کے بعد جن کو مسلمان پہلے سے جانتے تھے، آیہ اكمال الدین کے نزول کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ان ہدایات کا اعادہ تو محض تاکید کے لیے تھا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان اتنی بڑی تعداد میں رسول اللہ کی خدمت میں جمع ہوئے تھے۔ رسول اللہ نے حج کے لیے نکلنے سے پہلے ان کو بتلادیا تھا کہ یہ حجۃ الوداع ہے۔ اس لیے آنحضرت کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ یہ ہدایات سب مسلمانوں کو سنادیں۔

لیکن اگر ہم دوسرے قول کو قبول کر لیں جس کے مطابق یہ آیت غیر مجرم کے

دن اس وقت نازل ہوئی جب امام علیؑ کو خلیفہ رسول اور امیر المومنین مقرر کر دیا گیا تھا تو اس صورت میں معنی بالکل صحیح ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کا فیصلہ کہ رسول اللہ کے بعد ان کا خلیفہ اور جانشین کون ہوگا، نہایت اہم معاملہ تھا اور یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یوں ہی چھوڑ دے۔ اور نہ یہ رسول اللہ کی شان کے مناسب تھا کہ وہ کسی کو اپنا خلیفہ مقرر کیے بغیر دنیا سے چلے جائیں اور اپنی امت کو بغیر کسی نگران کے چھوڑ جائیں جب کہ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی آپ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے، کسی صحابی کو اپنا جانشین مقرر کر کے جاتے تھے۔ پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور آپ نے خلافت کے بارے میں کچھ نہیں سوچا؟

جب کہ ہمارے زمانے میں بے دین بھی اس قاعدے کو تسلیم کرتے ہیں اور سربراہ مملکت کا جانشین اس کی زندگی ہی میں مقرر کر دیتے ہیں تاکہ حکومت کا انتظام چلتا رہے اور لوگ ایک دن بھی سربراہ کے بغیر نہ رہیں۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دین اسلام جو سب ادیان میں کامل ترین اور سب سے جامع ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام شریعتوں کو ختم کیا ہے اور جس سے زیادہ ترقی یافتہ، جس سے کامل تر، جس سے عظیم تر اور جس سے خوب تر کوئی دین نہیں ہے، اتنے اہم معاملے کی طرف توجہ نہ دے۔

ہم یہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عائشہ، ابن عمر اور ان سے پہلے خود ابو بکر اور عمر بھی یہ محسوس کر چکے تھے کہ فتنہ و فساد کو روکنے کے لیے خلیفہ کا تعین ضروری ہے۔ اسی مصلحت کی وجہ سے ان کے بعد آنے والے سب خلفاء بھی اپنا جانشین مقرر کرتے رہے۔ پھر یہ مصامت اللہ اور اس کے رسولؐ سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی؟

اسی کے مطابق یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو جب وہ حجۃ الوداع سے واپس آ رہے تھے، آیہ تبلیغ کے ذریعے وحی بھیجی تھی کہ علیؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْوَحْدَانِ

اس سے معلوم ہوا، دین کی تکمیل امامت یعنی ولایت پر موقوف ہے جو

فَبِمَا أَغْوَيْنٰنِ لَا قُحْدَنَ لَهُمْ صِرَاطُكَ الْمُسْتَقِيْمَ
ثُمَّ لَا تَنبِتْهُمْ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ
اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ
چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے، میں بھی اس سیدھی راہ پر بیٹھ
کر رہوں گا جو تو نے ان کے لیے تجویز کی ہے، پھر آؤں گا ان کے پاس
ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے، ان کے دائیں سے اور ان
کے بائیں سے۔ اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا۔
(سورہ اعراف - آیت ۱۶-۱۷)

آج اہل نظر دنیا میں مسلمانوں کی حالت دیکھیں خصوصاً تیسری دنیا میں،
جہاں کے مسلمان پسماندہ ہیں، جاہل ہیں، ان کی قسمت کا فیصلہ افیاء کے ہاتھ میں
ہے، وہ ذلیل ہیں، کچھ نہیں کر سکتے۔ ان ممالک کے پیچھے دوڑتے ہیں جو اسرائیل کو تسلیم
کرتے ہیں حالانکہ اسرائیل مسلمان حکومتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ مسلمانوں کو یروشلم میں
گھسنے تک نہیں دیتا جسے اس نے اپنا دارالسلطنت بنالیا ہے۔ آج مسلمان ممالک
امریکہ اور روس کے رحم و کرم پر ہیں۔ مسلمان قومیں جہالت، جھوک اور بیماری کے
عقریت کے چنگل میں بری طرح پھنسی ہوئی ہیں۔ یورپ کے تو کتے بھی انواع و اقسام
کے گوشت اور مچھلیاں کھاتے ہیں، جب کہ مسلمانوں کے بچے جھوک سے دم توڑ دیتے
ہیں۔ بعض اسلامی ملکوں میں تو انھیں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نصیب نہیں ہوتا اور
وہ کوڑے کے ڈھیر سے اپنی غذا تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ فَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ
إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

سَيِّدَةُ النَّسَارِ فَاطِمَةُ الزَّهْرَاءُ سَلَامُ اللّٰهِ عَلَيْهَا کا بیعت ابوبکر کے بعد، جب
ابوبکر سے جھگڑا ہوا تھا تو انھوں نے مہاجرین و انصار کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:
”..... معلوم نہیں لوگوں کو علی کی کیا بات ناپسند ہے کہ انھوں

نے ان کی حمایت چھوڑ دی ہے؟ بخدا! لوگ علی کی احکام الہی
کے بارے میں سختی، ان کی ثابت قدمی اور ان کی شمشیر خاراشت
کو پسند نہیں کرتے مگر انھوں نے خود اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ علی

کی حکومت میں انھیں ظلم و ستم سے واسطہ نہ پڑتا۔ وہ تو انھیں
علم و دانش اور عدل و انصاف کے چشموں سے سیراب کرتے۔
اس کے بعد انھوں نے ایک پیشین گوئی کی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر
کے آخر میں اس امت کے انجام کی خبر دیتے ہوئے کہا تھا:

”جو کام ان لوگوں نے کیا ہے وہ گا بھن اُونٹنی کی طرح ہے۔

بچہ ہونے دو پھر تم پیالہ بھر کے دودھ کی بجائے خون اور زہر
دوہو گے۔ اس وقت باطل پرست خسارہ میں رہیں گے اور یہ
کہ آئندہ آنے والی نسلیں اپنے بچھلوں کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتیں
گی اور یقین رکھو کہ تم فتنہ و فساد میں ڈوب جاؤ گے اور یقین رکھو
کہ تلوار چلے گی، ظلم و ستم ہوگا، افراتفری ہوگی، ظالموں کی مطلق
الengan حکومت ہوگی جو تمھیں پیسے کے رکھ دے گی۔ تم کس خیال
میں ہو؟ تمھیں کیوں سمجھ نہیں آتی؟ کیا ہم زبردستی وہ چیز
تمھارے سر منڈھ دیں جو تمھیں پسند ہی نہیں؟“

ذخیرہ رسولؐ اور گوہرِ کارِ نبوت صدیقہ طاہرہؑ نے جو کچھ کہا وہ اس اُمت کی
تاریخ میں حرف بحرف سچ ثابت ہوا اور کون جانے ابھی پردہ غیب میں کیا ہے شاید
مستقبل میں جو کچھ پیش آئے وہ ماضی سے بھی زیادہ بھیانک ہو۔ کیوں کہ اللہ نے
جو احکام نازل کیے وہ انھیں ناپسند ہوئے۔ پھر اللہ نے بھی ان کے اعمال غارت
کر دیئے۔

اس بحث کا ایک اہم جزو

اس بحث کے سلسلے میں ایک خاص بات جو توجہ اور تحقیق کی مستحق ہے اور
یہ وہ واحد اعتراض ہے جو اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب مُستحک دلائل کے سامنے
مخالفین کے لیے فرار کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور انھیں نصوصِ صریحہ کا اعتراف کرنا پڑتا

ہے تو وہ بالآخر انکار اور تعجب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ”یہ کیسے ممکن ہے کہ امام علیؑ کے امامت پر تقرر کے وقت ایک لاکھ صحابہ موجود ہوں اور پھر وہ سب کے سب اس تقرر کی مخالفت کرنے اور اسے نظر انداز کرنے پر اتفاق کر لیں، جب کہ ان میں بہترین صحابہ اور اُمت کے افضل ترین اشخاص شامل تھے۔“

یہ صورت خود میرے ساتھ اس وقت پیش آئی جب میں نے اس موضوع پر تحقیق شروع کی۔ مجھے یقین نہیں آتا اور کسی کو بھی یقین نہیں آئیگا اگر معاملے کو اس صورت میں پیش کیا جائے۔

لیکن جب ہم اس معاملے کا تمام پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہیں تو پھر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں رہتی۔ کیونکہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے جس طرح ہم سمجھتے ہیں یا جس طرح اہلسنت پیش کرتے ہیں۔ بات ان کی بھی معقول ہے۔ حاشا وکلا! یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک لاکھ صحابہ فرمان رسولؐ کی مخالفت کریں۔

پھر یہ واقعہ کس طرح پیش آیا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ بیعت غدیر کے موقع پر موجود تھے وہ سب مدینہ منورہ کے رہنے والے نہیں تھے۔ ان میں زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار مدینے کے باشندے ہوں گے۔ پھر ان میں بہت سے آزاد شدہ غلام تھے، غلام بھی تھے اور وہ کمزور لوگ بھی تھے جو مختلف اطراف و اکناف سے آکر رسول اللہؐ کی خدمت میں جمع ہو گئے تھے، ان کا مدینہ میں اپنا کوئی کٹم قبیلہ نہیں تھا جیسے : ”اصحاب صفہ“ اگر ان سب کو نکال دیا جائے تو ہمارے پاس آدھی تعداد بچتی ہے یعنی زیادہ سے زیادہ دو ہزار۔ یہ لوگ بھی قبائلی نظام کے تحت قبیلے کے سرداروں کے تابع تھے۔ رسول اللہؐ نے اس نظام کو باقی رہنے دیا تھا۔ جب رسول اللہؐ کے پاس کوئی وفد آتا تھا تو آپ اس کے سردار کو اس کا انچارج مقرر کر دیتے تھے۔ اسی لیے اسلام میں ان زعماء اور سرداروں کے لیے اہل صل و عقد کی اصطلاح رائج پاگئی۔ جب ہم سقیفہ کانفرنس پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے شرکاء کی تعداد جنہوں نے حضرت ابوبکر کو منتخب کیا تھا ایک سو سے ہرگز متجاوز نہیں تھی، اس لیے کہ انصار میں سے۔ جو مدینے کے اصل باشندے تھے۔ صرف سرداروں نے

شرکت کی تھی اور مہاجرین میں سے جو دراصل مکے کے رہنے والے تھے اور رسول اللہؐ کے ساتھ ہجرت کر کے آئے تھے صرف تین یا چار اشخاص ہی شریک تھے جو قریش کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ ہم یہ اندازہ لگائیں کہ سقیفہ کتنا بڑا ہوگا۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ سقیفہ کیا ہوتا ہے۔ یہ مکان کے بڑی دروازے سے ملحق ایک کمرہ ہوتا ہے جس میں لوگ بیٹھک جھاتے ہیں۔ یہ کوئی آڈیٹوریئم یا کانفرنس ہال نہیں تھا۔ اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ”سقیفہ بنی ساعدہ“ میں سو آدمی موجود ہوں گے تو درحقیقت ہم مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ تحقیق کرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہاں وہ ایک لاکھ آدمی نہیں تھے جو ”غدير خم“ کے موقع پر موجود تھے، بلکہ انھیں تو یہ معلوم بھی کافی عرصے کے بعد ہوا ہوگا کہ سقیفہ میں کیا کارروائی ہوئی، کیونکہ ان دنوں نہ فضائی رابطہ تھا نہ ٹیلیفون تھے اور نہ ہی مصنوعی سیارے تھے۔ جب وہاں موجود زعماء کا ابوبکر کے تقرر پر انصار کے سردار سعد بن عبادہ اور ان کے بیٹے قیس کی مخالفت کے باوجود، اتفاق ہو گیا اور غالب اکثریت سے معاملہ طے پا گیا اس وقت مسلمانوں کی بڑی تعداد سقیفہ میں موجود نہیں تھی۔ کچھ لوگ رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے، کچھ رسول اللہؐ کی وفات کی خبر سے حواس باختہ تھے۔ عمرؓ نے انھیں یہ کہہ کر اور بھی خوف زدہ کر دیا تھا کہ خبردار کوئی یہ بات زبان سے نہ نکالے کہ رسول اللہؐ وفات پا گئے ہیں یہ

اس کے علاوہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد کو رسول اللہؐ نے سپاہ اُسامہ میں بھرتی کر لیا تھا اور یہ لوگ زیادہ تر جُرف میں مقیم تھے۔ لہذا یہ لوگ رسول اللہؐ کی وفات کے وقت نہ تو مدینے میں موجود تھے اور نہ ہی سقیفہ کی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد بھی کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کسی قبیلے کے افراد اپنے سردار کی مخالفت کرتے اور اس نے جو فیصلہ کر دیا تھا اسے نہ مانتے۔ خصوصاً جب کہ فیصلہ ان کے لیے ایک بڑا اعزاز تھا جس کو حاصل کرنے کی ہر قبیلہ کوشش کرتا تھا۔ کون جانتا ہے کہ کسی دن ان کے ہی قبیلہ یا خاندان کو تمام خلافت حاصل ہو جائے جب کہ اس کا

شرعی حق دار تو راستے سے ہٹا ہی دیا گیا تھا اور معاملہ شوریٰ پر منحصر ہو گیا تھا۔ اس صورت میں باری باری سب کے لیے موقع تھا۔ ایسی حالت میں وہ اس فیصلے سے کیوں نہ خوش ہوتے اور کیسے نہ اس کی تائید کرتے ؟

دوسری بات یہ ہے کہ جب مدینے کے رہنے والے اہل حل و عقد نے ایک بات طے کر دی تھی تو جزیرہ نمائے عرب کے دور افتادہ باشندوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں کیا ہو رہا ہے جب کہ اس دور میں وسائل رسل و رسائل بالکل ابتدائی حالت میں تھے۔

اس کے علاوہ یہ بھی سوچتے تھے کہ اہل مدینہ رسول اللہ کے پڑوسی ہیں وہ احکام ربانی اور وحی آسمانی سے جو کسی وقت اور کسی دن بھی نازل ہو سکتی تھی زیادہ واقف ہیں۔

پھر یہ کہ صدر مقام سے دور رہنے والے قبیلے کے سردار کو خلافت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے اس سے کیا کہ ابوبکر خلیفہ ہوں یا علیؑ یا کوئی اور گھر کا حال گھر والے جانیں۔ اس کے لیے تو اہم بات صرف یہ تھی کہ اس کی سرداری برقرار ہے۔ اسے کوئی چھیننے کی کوشش نہ کرے۔

کون جانتا ہے، شاید کسی نے معاملے کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کی بھی ہو۔ اور حقیقت حال جلنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن حکومت کے کارندوں نے خواہ ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر اسے خاموش کر دیا ہو۔ شاید مالک بن نویرہ کے قصے کے متعلق۔ جس نے ابوبکر کو زکات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ شیعوں ہی کی بات صحیح ہو۔ حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ لیکن جو شخص مالک بن نویرہ کے ساتھ جنگ کے دوران میں پیش آنیوالے واقعات کا بغور مطالعہ کرے گا اسے بہت سے ایسے تضادات ملیں گے جن کے متعلق بعض مؤرخین کی پیش کی ہوئی صفائی سے اطمینان نہیں ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس واقعہ کے اچانک پیش آجانے کا بھی اس کو بطور امر واقعی FAIT ACCOMPLI تسلیم کر لیے جانے میں بڑا دخل رہا ہے سقیفہ کا نفرنس اس وقت اچانک منعقد ہوئی تھی جب بہت سے صحابہ رسول اللہ کی تجبیز

ونکفین میں مشغول تھے، ان میں امام علیؑ، عباسؓ، دوسرے بنی ہاشم، مقداد سنان ابوذرؓ، عمار اور دوسرے بہت سے اصحاب شامل تھے۔ جب تک سقیفہ کے شرکار ابوبکر کو مسجد میں لے کر گئے اور انھوں نے عام بیعت کی دعوت دی جس پر لوگ بادلِ خواستہ و ناخواستہ بیعت کے لیے اُمنڈ پڑے، اس وقت تک علیؑ اور ان کے پیروکار اپنے شرعی اور اخلاقی فریضہ سے فارغ نہیں ہوئے تھے اور ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ رسول اللہؐ کو بغیر غسل اور بغیر کفن دفن کے چھوڑ کر سقیفہ میں خلافت کے واسطے دوڑ پڑتے اور جب تک وہ اس فریضہ سے فارغ ہوئے، اس وقت تک معاملہ ابوبکر کے حق میں فیصل بھی ہو چکا تھا۔ اب جو کوئی ابوبکر کی بیعت سے پیچھے ہٹتا اس کا شمار مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والے ان فتنہ برداروں میں ہوتا جن سے نمٹنا اور ضروری ہو تو انھیں قتل کر دینا مسلمانوں پر واجب ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکر کی بیعت میں شامل کیا تو عمر بن خطابؓ نے انھیں قتل کی دھمکی دی تھی یہ

اس کے بعد بیعت سے انکار کرنے والے ان صحابہ کو جو علیؑ کے گھر میں جمع تھے، زندہ جلا دینے کی اور علیؑ کے گھر کو آگ لگا دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اگر ہمیں بیعت سے متعلق عمر کی صحیح رائے معلوم ہو جائے تو بہت سے حیران کن ممثوں کا حل نکل آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عمر کا خیال یہ تھا کہ بیعت کے درست ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ کوئی ایک مسلمان بیعت میں سبقت کر لے۔ پھر باقی پر اس کی پیروی واجب ہو جاتی ہے۔ اس پر بھی اگر کوئی مخالفت کرے تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج اور واجب القتل ہے۔

آئیے دیکھیں خود عمر بیعت کے بارے میں کیا کہتے ہیں !

صحیح بخاری کی روایت ہے یہ عمر کہتے ہیں :
”اس پر بڑی گڑبڑ ہوئی اور خوب شور مچا۔ میں ڈرا کہ ہیں آپس میں

۱۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۶۔ طبری تاریخ الامم والملوک۔ ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاستہ۔

۲۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۸۔ باب رجم الحبلی عن الزناد إذا آخضنت۔

تفرقہ نہ پڑ جائے۔ میں نے ابوبکر سے کہا : ہاتھ بڑھاؤ۔ انھوں نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بیعت کر لی۔ ٹہا جرین اور انصار نے بھی بیعت کر لی۔ ہم سعد بن عبادہ پر گود پڑے۔ انصار میں سے کسی نے کہا : تم نے سعد بن عبادہ کو مار ڈالا ! میں نے کہا : سعد بن عبادہ پر اللہ کی مار !
عمر کہتے ہیں کہ

جو مسئلہ ہمارے سامنے تھا، اس کا اس سے مضبوط کوئی حل نہیں تھا کہ ابوبکر کی بیعت کر لی جائے۔ ہمیں ڈر تھا کہ اگر وہاں موجود لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے اور بیعت نہ ہوئی تو کہیں وہ ہمارے جانے کے بعد اپنے ہی لوگوں سے بیعت نہ کر لیں۔ پھر یا تو ہمیں اپنی مرضی کے خلاف بیعت کرنی پڑے گی اور اگر ہم نے مخالفت کی تو فساد برپا ہوگا۔ اگر کوئی کسی سے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر بیعت کرے تو ان دونوں میں سے کسی کا ساتھ نہیں دیا جائیگا۔

معلوم ہوا کہ عمر کے نزدیک سوالِ انتخاب، اختیار اور شورشی کا نہیں تھا۔ صرف اتنا کافی تھا کہ کوئی مسلمان بڑھ کر کسی سے بیعت کر لے تاکہ باقی لوگوں پر حجت قائم ہو جائے۔ اسی لیے عمر نے ابوبکر سے کہا تھا کہ ہاتھ بڑھاؤ۔ ابوبکر نے ہاتھ بڑھایا تو عمر نے بلا جھجک اور بلا کسی سے مشورہ کیے فوراً اس خوف سے بیعت کر لی کہ کہیں کوئی دوسرا ان سے بازی نہ لے جائے۔ اس بات کو عمر نے اس طرح بیان کیا :

ہم ڈرتے تھے کہ اگر ہم ان لوگوں کے پاس سے چلے گئے اور بیعت نہ ہوئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہمارے جانے کے بعد اپنے ہی لوگوں میں سے کسی سے بیعت کر لیں۔ (عمر کو ڈر تھا کہ کہیں انصار پہل کر کے

اپنے میں سے کسی کی بیعت نہ کر لیں)۔

مزید وضاحت اگلے فقرے سے ہو جاتی ہے :

پھر یا تو ہمیں اپنی مرضی کے خلاف ان سے بیعت کرنی ہوگی یا اگر ہم نے مخالفت کی تو فساد برپا ہو جائے گا۔

احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہاں یہ اعتراف کر لیں کہ عمر بن خطاب نے بیعت کے بارے میں اپنی رلے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بدل لی تھی۔ ہوا میں کہ انھوں نے جو آخری حج کیا تھا اس کے دوران ایک شخص نے عبدالرحمن بن عوف کی موجودگی میں ان سے آکر کہا تھا : آپ کو معلوم ہے کہ فلاں شخص کہتا ہے کہ اگر عمر مرجائے تو میں فلاں سے بیعت کر لوں گا۔ ابوبکر کی بیعت تو اچانک ہو گئی تھی جو اتفاق سے کامیاب ہو گئی۔ یہ سن کر عمر بہت ناراض ہوئے اور مدینے واپسی کے فوراً بعد ایک خطبہ دیا جس میں اور باتوں کے علاوہ کہا :

میں نے سنا ہے کہ تم میں سے کوئی کہہ رہا تھا کہ اگر عمر مر گئے تو میں فلاں شخص کی بیعت کر لوں گا۔ کسی شخص کو اس دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے کہ ابوبکر کی بیعت اچانک ہوئی تھی لیکن کامیاب رہی۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اللہ نے اس کے بُرے نتائج سے محفوظ رکھا ہے

پھر کہا کہ

جو شخص مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر کسی سے بیعت کر لے گا تو نہ بیعت کرنے والے کی بیعت صحیح ہوگی اور نہ بیعت لینے والے کی بیعت، بلکہ وہ دونوں قتل کر دیے جائیں گے۔
کاش! اسقیفہ کے موقع پر بھی عمر کی یہی رلے ہوتی !

۱۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۸۔

۲۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۶۔

۳۔ طبری، تاریخ الامم والملوک، اختلاف عمر - ابن ابی الحدید، شرح بیع البلاء -

۱۔ سب مؤرخین کہتے ہیں کہ اسقیفہ میں صرف چار ہاجر موجود تھے۔ یہ کہنا کہ میں نے بیعت کی اور ہاجر نے بیعت کر لی یہ اس قول سے متصادم ہے جو اسی خطبے میں آگے ہے کہ علیؑ، زبیر اور ان دونوں کے ساتھیوں نے مخالفت کی۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۶۔

اب یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ عمر نے زندگی کے آخری ایام میں اپنی رلے تبدیل کیوں کر لی۔ کیونکہ انھیں دوسروں سے بہتر طور پر معلوم تھا کہ وہ اپنی رلے کی وجہ سے ابوبکر کی بیعت کی بنیاد ڈھا رہے ہیں، اس لیے کہ انھوں نے بھی ابوبکر کی بیعت مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر اچانک کی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے اس بیان سے خود ان کی اپنی بیعت کی بنیاد ہل گئی اس لیے کہ ابوبکر نے اپنی وفات کے قریب مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر ان کے لیے بیعت لی تھی، یہاں تک کہ بعض صحابہ نے ابوبکر سے احتجاج بھی کیا تھا کہ ایسے سخت گیر شخص کو ان کا حاکم نہ بنائیں جب ابوبکر کی چٹھی سنانے کے لیے عمر باہر نکلے تو کسی نے ان سے پوچھا: ابو حفص! اس چٹھی میں کیا ہے؟ عمر نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میں پہلا شخص ہوں گا جو ابوبکر کے حکم کو سن کر اسے قبول کرے گا۔ اس شخص نے اس پر کہا: مگر مجھے معلوم ہے کہ اس میں کیا ہے؟ اگلی بار آپ نے انھیں حکمراں بنایا تھا، اس بار وہ آپ کو حکمران بنارہے ہیں۔

یہ ویسی ہی بات ہے جیسی امام علیؑ نے اس وقت کہی تھی جب وہ لوگوں کو ابوبکر کی بیعت کی دعوت دے رہے تھے۔ علیؑ نے کہا تھا:

دودھ دوہ لو، تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔ آج تم ان کی

خلافت پکٹی کر دو، کل وہ خلافت تمہیں لوٹا دیں گے۔

اہم بات یہ ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بیعت کے بارے میں عمر نے اپنی رلے کیوں بدلی؟ میرا خیال یہ ہے کہ انھوں نے سنا تھا کہ بعض صحابہ ان کے مرنے کے بعد علی بن ابی طالب سے بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بات انھیں قطعاً پسند نہیں تھی۔ عمر کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اگر عمر مر گئے تو میں فلاں شخص سے بیعت کر لوں گا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ وہ خود عمر کے اپنے فعل سے استدلال کر رہا تھا۔ اس کہنے والے کا نام تو معلوم نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ

۱۸ ابن قتیبہ، الامامة والسياسة جلد ۱ صفحہ ۱۸ -

۱۹ صحیح مسلم جلد ۵ صفحہ ۷۵ - صحیح بخاری جلد ۷ صفحہ ۹ -

یہ کبار صحابہ میں سے کوئی صاحب ہوں گے۔ یہ صاحب کہہ رہے تھے کہ ابوبکر کی بیعت اچانک ہوئی تھی مگر مکمل ہو گئی۔ یعنی اگرچہ یہ بیعت مشورے کے بغیر اور دفعتاً ہو گئی تھی مگر یہ مکمل ہو کر ایک حقیقت بن گئی۔ اگر عمر اس طرح ابوبکر سے بیعت کر سکتے تھے تو وہ خود کیوں فلاں سے اس طرح بیعت نہیں کر سکتے؟

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن عباس، عبدالرحمن بن عوف اور عمر بن خطاب اس شخص کا نام نہیں لیتے جس نے یہ بات کہی تھی اور نہ اس شخص کا نام لیتے ہیں جن کی یہ بیعت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ یہ دونوں اشخاص مسلمانوں میں بڑی اہمیت رکھتے تھے، اس لیے عمر یہ بات سن کر بہت بگڑے اور پہلے ہی جمعہ کو جو خطبہ دیا اس میں خلافت کا ذکر چھڑ کر اپنی نئی رلے کا اظہار کیا، تاکہ جو صاحب پھر ایک بار اچانک بیعت کا ارادہ کر رہے تھے ان کا راستہ روکا جاسکے۔ کیونکہ اس بیعت کی صورت میں خلافت فریق مخالف کے ہاتھ میں جانے کا امکان تھا۔ اس کے علاوہ اس بحث کے بین السطور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی شخص کی انفرادی رلے نہیں تھی، یہ رائے بہت سے صحابہ کی تھی اس لیے بخاری کہتے ہیں:

اس پر عمر نے بگڑ کر کہا: میں انشاء اللہ شام کو تقریر کر کے

لوگوں کو ان سے خبردار کر دوں گا جو ان کے معاملات پر ناجائز

قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمر کی رلے میں تبدیلی کی اصل وجہ ان لوگوں کی مخالفت تھی جو بقول ان کے لوگوں کے معاملات پر ناجائز قبضہ کرنا اور علیؑ کی بیعت کرنا چاہتے تھے اور یہ بات عمر کے لیے ناقابل قبول تھی۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ خلافت لوگوں کے طے کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ علی بن ابی طالب کا حق نہیں۔ لیکن اگر عمر کا یہ خیال صحیح تھا تو رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انھوں نے خود لوگوں کا حق غصب کیوں کیا تھا اور مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر ابوبکر سے بیعت کرنے میں جلدی کیوں کی تھی؟

۲۰ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۵ -

ابو حفص عمر کا رویہ ابو الحسن علیؑ کے بارے میں سب کو معلوم ہے۔ عمر کی کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو علیؑ کو حکومت سے دور رکھا جائے۔ یہ نتیجہ ہم نے صرف مذکورہ بالا خطبے ہی سے اخذ نہیں کیا ہے بلکہ تاریخ کا تتبع کرنے والا ہر آدمی جانتا ہے کہ ابو بکر کے دور خلافت میں بھی عملاً عمر بن خطابؓ ہی حکمراں تھے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ابو بکر نے اُسامہ سے اجازت مانگی تھی کہ عمر کو ان کے پاس چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اُمور خلافت میں ان سے مدد دیتے رہیں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابو بکر، عمر اور عثمان کے پورے دور میں علی بن ابی طالبؓ کو ذمہ داری کے عہدوں سے دور رکھا گیا۔ نہ ان کو کوئی منصب دیا گیا، نہ کسی صوبے کا گورنر بنایا گیا، نہ کسی لشکر کا سالار مقرر کیا گیا اور نہ کوئی خزانہ ان کی تحویل میں دیا گیا۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ علی بن ابی طالبؓ کون تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں اس سے زیادہ عجیب بات یہ لکھی ہے کہ عمر کو مزے لے کے قریب اس بات کا افسوس تھا کہ ابو عبیدہ بن جراح یا حذیفہ بن یمان کے ہاتھ لگا کر وہ غلام یا سر، ان دونوں میں سے کوئی اس وقت زندہ نہیں رہتا کہ وہ ان ہی میں سے کسی کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کر دیتے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ بعد میں انھیں خیال آیا کہ اس طرح کی بیعت کے بارے میں تو وہ اپنی رائے پہلے ہی بدل چکے ہیں، اس لیے ضروری ہو کہ بیعت کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا جائے جس کو درمیانی صل قرار دیا جاسکے، جس میں نہ تو کوئی فرد واحد اس کی بیعت کرے جس کو وہ اپنی ذاتی رائے میں مناسب سمجھتا ہو اور نہ دوسروں کو آمادہ کرے کہ وہ بھی اس کی پیروی کریں جیسا کہ خود عمر نے ابو بکر کی بیعت کے وقت کیا تھا۔ یا جس طرح ابو بکر نے اپنے بعد خلافت کے لیے عمر کو نامزد کر دیا تھا۔ یا جیسا کہ ان صاحب کا ارادہ تھا جو حضرت عمر کی موت کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اپنے پسندیدہ شخص کی بیعت کر سکیں، لیکن عمر نے پیش بندی کر کے ان کے

لے ابن سعد نے طبقات میں اس کی تصریح کی ہے۔ دوسرے مؤرخین نے بھی جنھوں نے سر یہ اُسامہ بن زید کا ذکر کیا ہے، اس بات کو بیان کیا ہے۔

منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا۔ نہ ہی عمر کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ خلافت کے معاملے کا تصفیہ مسلمانوں کے شورشی پر چھوڑ دیتے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد سقیفہ میں کیسے کیسے اختلاف پیدا ہو گئے تھے اور کس طرح کشت و خون کی نوبت آتے آتے رہ گئی تھی۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے بالآخر اصحاب شوریٰ کا اصول وضع کیا اور اس اصول کے تحت ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی جس کو خلیفہ کے انتخاب کا مکمل اختیار تھا اور اس کمیٹی کے ارکان کے علاوہ مسلمانوں میں سے کسی کو اس معاملے میں دخل دینے کا حق نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ ان چھ ارکان میں بھی اختلاف پیدا ہونا ناگزیر ہے اس لیے انھوں نے ہدایت جاری کی کہ اختلاف کی صورت میں اس فریق کا ساتھ دیا جائے جس میں عبدالرحمن بن عوف ہوں، خواہ یہ ارکان تین تین کے دو مساوی گروہوں میں تقسیم ہو جائیں اور اس گروہ کو قتل ہی کر دینا پڑے جو عبدالرحمن بن عوف کے خلاف ہو۔

لیکن عمرؓ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ سعد بن ابی وقاص عبدالرحمن بن عوف کے چچا زاد بھائی تھے اور ان دونوں کا تعلق قبیلہ بنی زہرہ سے تھا۔ عمرؓ کو یہ بھی معلوم تھا کہ سعد بن ابی وقاص علیؑ سے خوش نہیں، ان کے دل میں علیؑ کی طرف سے بغض ہے کیونکہ علیؑ نے ان کی انھیال عبد شمس کے بعض افراد کو غزوات میں قتل کیا تھا۔

عمرؓ کو یہ بھی معلوم تھا کہ عبدالرحمن بن عوف عثمان کے بہنوئی ہیں کیونکہ ان کی بیوی لہم کلثوم عثمان کی بہن ہیں۔

عمرؓ یہ بھی جانتے تھے کہ طلحہ کا بھی جھکاؤ عثمان کی طرف ہے۔ بعض لوگوں نے ان دونوں کے درمیان تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ عثمان کی طرف طلحہ کے جھکاؤ کا ایک سبب یہ تھا کہ طلحہ علیؑ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ طلحہ تیمی تھے اور حضرت ابو بکر کے منصب خلافت پر فائز ہو جانے کے بعد سے بنی ہاشم اور بنی تیم کے تعلقات ناخوشگوار ہو گئے تھے۔

حضرت عمرؓ کو یہ سب معلوم تھا اور انھی باتوں کے پیش نظر انھوں نے خاص طور پر ان چھ افراد کا انتخاب کیا تھا، جو سب کے سب ہجاز اور قریشی تھے، کوئی بھی انصار میں سے نہیں تھا۔ ان میں سے ہر ایک کسی ایسے قبیلے کی نمائندگی کرتا تھا جس کی اپنی اہمیت تھی اور اپنا اثر و رسوخ تھا۔

- ۱۔ علی بن ابی طالب - بنی ہاشم کے بزرگ
- ۲۔ عثمان بن عفان - بنی امیہ کے بزرگ
- ۳۔ عبدالرحمن بن عوف - بنی زہرہ کے بزرگ
- ۴۔ طلحہ بن عبید اللہ - بنی تیمم کے بزرگ
- ۵۔ سعد بن ابی وقاص - ان کا تعلق بھی بنی زہرہ سے تھا۔ انھیال بنی امیہ تھی۔
- ۶۔ زبیر بن العوّام - رسول اللہؐ کی بھوپھی صفیہ کے صاحبزادے اور اسماء بنت ابی بکر کے شوہر۔

یہ تھے وہ زعماء اور اربابِ حل و عقد جن کا فیصلہ سب مسلمانوں کے لیے واجب العمل تھا، خواہ وہ مسلمان مدینہ کے باشندے ہوں یا دنیا سے اسلام میں کسی اور جگہ کے۔ مسلمانوں کا کام چون و چرا کے بغیر حکم کی تعمیل تھا۔ اگر کوئی تعمیل حکم نہ کرتا تو پھر اس کا خون مُناف تھا۔ یہ تھے وہ حالات جو ہم قاری کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے، بالخصوص اس مقصد سے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ نصّ غدير کے سلسلے میں خاموشی کیوں اختیار کی گئی تھی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ کو ان چھ افراد کے خیالات اور ان کے طبعی رجحانات کا علم تھا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی طرف سے عثمان بن عفان کو خلافت کے لیے نامزد کر دیا تھا، یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ انھیں پہلے سے علم تھا کہ یہ چھ کنفی کمیٹی علی بن ابی طالب کے حق میں فیصلہ نہیں دے گی۔

یہاں میں ذرا رنگ کر اہل سنت اور ان سب لوگوں سے جو شوری اور آزادی خیال کے اصول پر فخر کرتے ہیں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ شوری کے اصول میں اور اس نظریے میں جو حضرت عمرؓ نے ایجاد کیا تھا کیسے ہم آہنگی پیدا کریں گے کیونکہ اس چھ کنفی کمیٹی کو مسلمانوں نے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنی ذاتی رائے سے منتخب اور مقرر

کیا تھا۔ اس صورت میں ہمیں کم از کم یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس نظریے کے مطابق اسلام میں حکومت کا نظام جمہوری نہیں ہے جیسا کہ شوری اور انتخاب کے حامی فخریہ دعویٰ کرتے ہیں۔

اس بنیاد پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شاید عمر شوری کے قائل ہی نہیں تھے وہ خلافت کو صرف ہجازین کا حق سمجھتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حضرت ابوبکر کی طرح ان کا خیال یہ تھا خلافت صرف قریش سے مخصوص ہے کیونکہ ہجازین میں تو بہت سے غیر قریشی بھی تھے بلکہ غیر عرب بھی تھے۔ اس لیے سلمان فارسیؓ، عمار بن یاسرؓ، بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ، ابوذر غفاریؓ اور ہزاروں دوسرے صحابہ جو قریشی نہیں تھے، انھیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ خلافت کے معاملے میں کچھ بولیں۔

یہ محض دعویٰ نہیں۔ حَاشَا وَكَلَّا! یہ ان کا عقیدہ تھا جو ان ہی کی بانی تاریخ اور حدیث میں محفوظ ہے۔ آئیے، اس خطبے کو دوبارہ دیکھیں جو بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں قلمبند کیا ہے:

عمر بن خطاب کہتے ہیں کہ: میرا ارادہ ہونے کا تھا۔ میں نے ایک تقریر جو مجھے اچھی لگی تیار کر لی تھی۔ یہ تقریر میں ابوبکر سے پہلے کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی حد تک ہوشیاری سے کام لے رہا تھا۔ جب میں نے بولنا چاہا، ابوبکر نے کہا: ٹھہرو! میں خاموش ہو گیا کیونکہ میں ابوبکر کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد ابوبکر نے خود تقریر کی۔ وہ میری نسبت زیادہ متانت اور وقار سے بولے۔ میری تیاری ہوئی تقریر میں کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو مجھے اچھا لگتا ہو، اور ابوبکر نے فی البدیہہ وہی لفظ یا اس سے بہتر لفظ استعمال نہ کیا ہو۔ ابوبکر نے انصار کو مخاطب کر کے کہا: تم نے جو اپنے فضائل و محاسن بیان کیے ہیں واقعی تم ان کے مستحق ہو، لیکن جہاں تک اس معاملہ

کا تعلق ہے یہ قریش کا حق ہے یہ
اس سے معلوم ہوا کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما اور آراذی انہما کے اصول کے
قائل نہیں تھے۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ ابوبکر نے اپنی تائید میں انصار کے
سامنے یہ حدیث نبوی پیش کی کہ **الْخِلَافَةُ فِي قُرَيْشٍ**۔ اس میں شک
نہیں کہ یہ صحیح حدیث ہے، لیکن اس کی اصل وہ حدیث ہے جو بخاری، مسلم
اور نسائی اور شیعہ تمام حدیث کی مستند کتابوں کی متفقہ روایت ہے کہ
رسول اللہ ص نے فرمایا:

الْخِلَافَةُ مِنْ بَعْدِي اثْنَا عَشَرَ كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ
میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے جو سب قریش میں سے ہوں گے۔
اس سے بھی زیادہ واضح یہ حدیث ہے:

لَا يَزَالُ هَذَا الْأُمَدُ فِي قُرَيْشٍ مَا بَقِيَ مِنَ النَّاسِ
اثنان۔
یہ چیز قریش ہی میں ہے گی جب تک دو آدمی بھی باقی ہیں۔

ایک اور حدیث ہے کہ
النَّاسُ تَبِعُوا لِقُرَيْشٍ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ
سب لوگ قریش کے تابع ہیں بھلائی میں بھی، بُرائی میں

بھی۔
جب سب مسلمان ان احادیث پر یقین رکھتے ہیں تو کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ
رسول اللہ ص نے خلافت کا معاملہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ باہمی مشورے سے جسے
چاہیں خلیفہ منتخب کر لیں، آپ ہی انصاف سے بتائیں کیا یہ تضاد نہیں؟
اس تضاد سے چھٹکارا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم ائمہ اہل بیت

۱۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۷ - صحیح مسلم باب الوصیہ -

۲۔ صحیح بخاری کتاب الاحکام باب الامراء من قریش -

۳۔ صحیح مسلم جلد ۶ کتاب الامارہ

ان کے شیعہ اور بعض علمائے اہل سنت کا یہ قول تسلیم کر لیں کہ جناب رسول اللہ ص نے
خود خلفاء کے ناموں اور ان کی تعداد کی تصریح کر دی تھی۔ اس طرح ہم عمر کا موقف بھی
بہتر طور پر سمجھ سکیں گے جو ان کے اپنے اجتہاد پر مبنی تھا۔ وہ نص کو علی کے حق
میں جو قریش میں سب سے چھوٹے تھے، قبول کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ مذکور بالا
حدیث کا اطلاق عمومی طور پر سب قریش پر کرتے تھے۔

اسی وجہ سے انھوں نے اپنے مرنے سے قبل چھ ممتاز قریشیوں کی ایک کمیٹی
قائم کی تھی تاکہ احادیث نبوی کے درمیان اور ان کی اپنی اس رائے کے درمیان
کہ خلافت پر صرف قریش کا حق ہے، ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔

اس کے باوجود کہ یہ پہلے سے معلوم تھا کہ اس کمیٹی کے ارکان علی کا انتخاب
نہیں کریں گے، پھر بھی علی کو اس کمیٹی میں شامل کرنا شاید اس کی ایک تدبیر تھی
کہ علی کو مجبور کیا جائے کہ وہ بھی آجکل کی اصطلاح کے مطابق سیاست کے کھیل
میں شامل ہو جائیں تاکہ ان کے شیعوں اور حامیوں کے پاس جو ان کی اولیت کے قائل ہیں
کوئی دلیل باقی نہ رہے۔

لیکن امام علی ص نے اپنے ایک خطبہ میں عوام کے سامنے اس پر گفتگو کی۔ آپ نے
کہا:

میں نے بہت دن صبر کیا اور بہت تکلیف اٹھائی۔ آخر جب وہ
(خلیفہ) دنیا سے جانے لگا تو معاملہ ایک جماعت کے ہاتھ میں سوچا
گیا اور مجھے بھی اس جماعت کا ایک فرد خیال کیا، جبکہ واللہ مجھے اس
شوری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا ان میں کے پہلے صاحب (ابوبکر) کی نسبت
میری فضیلت میں شک ہی کب تھا جو اب ان لوگوں نے مجھے
اپنے جیسا سمجھ لیا ہے؟ (لیکن میں جی کر ڈا کر کے شوری میں حاضر
ہو گیا) اور نشیب و فراز میں ان کے ساتھ ساتھ چلا مگر ان میں سے
ایک نے بغض و حسد کے مارے میرا ساتھ نہ دیا اور دوسرا دامادی اور
ناگفتہ بہ باتوں کی وجہ سے ادھر ٹھک گیا۔

۱۔ شیخ محمد عبیدہ، شرح منہج البلاغہ جلد ۸ صفحہ ۸۷ -

چو بھی بات یہ ہے کہ امام علیؑ نے ہر دین پیش لی عین بے سود کیا۔
امام علیؑ ان لوگوں سے بیعت کی بھی کہ مانگتے جنہوں نے ان سے منہ پھیر لیا تھا،
اور جن کے دل دوسرے کی طرف جھک گئے تھے۔ اور جو امام علیؑ سے اس لیے حسد
کرتے تھے کہ ان پر اللہ کا فضل تھا یا اس لیے بغض رکھتے تھے کہ علیؑ نے ان کے
سر داروں کو قتل کیا تھا، ان کے بہادروں کو کچل دیا تھا، ان کی عزت خاک میں ملا دی
تھی، ان کو نیچا دکھایا تھا، ان کا غرور اپنی تلوار اور اپنی بہادری سے توڑ دیا تھا،
یہاں تک کہ وہ اسلام لانے اور اطاعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس پر بھی علیؑ سربلند
تھے اور اپنے ابنِ عم کا دفاع کرتے تھے۔ انھیں اللہ کے راستے میں کسی کی ملامت کی
پروا نہیں تھی۔ دنیا کی کوئی شے ان کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ رسول اللہؐ
کو اس کا بخوبی علم تھا اور وہ ہر موقع پر اپنے چچا زاد بھائی کے فضائل و محاسن بیان
کیا کرتے تھے۔ کبھی فرماتے:

حُبِّ عَلِيٍّ اِيْمَانٌ وَبُغْضُهُ نِفَاقٌ ۞
علیؑ کی محبت ایمان اور علیؑ سے بغض نفاق ہے۔
کبھی کہتے:

عَلِيٌّ مِّمِّيْ وَ اَنَا مِنْ عَلِيٍّ ۞
علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے۔
کبھی کہتے:

عَلِيٌّ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِي ۞
علیؑ میرے بعد ہر مومن کے سرپرست ہیں۔
آپ نے یہ بھی فرمایا:

عَلِيٌّ بَابُ مَدِيْنَةِ عَلِيْمٍ وَ اَبُوْ وَلَدِي ۞

۱۔ صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۲۱۱ - مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۶ -

۲۔ صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۱۶۸ -

۳۔ مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۵ - مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۴ - ۴۔ مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۶ -

علیؑ میرے شہرِ علم کا دروازہ اور میرے بچوں کے باپ ہیں۔
آپ نے فرمایا:

عَلِيٌّ سَيِّدُ الْمُسْلِمِيْنَ وَ اِمَامُ الْمُتَّقِيْنَ وَ قَاسِدُ
الْغُرِّ الْمُجْبَلِيْنَ ۞

علیؑ مسلمانوں کے سردار، متقیوں کے پیشوا اور ان لوگوں کے
سالار ہیں جو روز قیامت سرخرو ہوں گے۔

لیکن افسوس کہ اس سب کے باوجود ان لوگوں کا حسد اور بغض بڑھتا ہی گیا
اس لیے اپنی وفات سے چند روز قبل رسول اللہؐ نے علیؑ کو بلا کر گلے سے لگایا اور
روتے ہوئے کہا:

علیؑ! میں جانتا ہوں کہ لوگوں کے سینوں میں تمھاری طرف
سے جو بغض ہے وہ میرے بعد کھل کر سامنے آجائے گا۔ لہذا اگر
تم سے بیعت کریں تو قبول کر لینا ورنہ صبر کرنا، یہاں تک کہ تم
مظلوم ہی میرے پاس آجاؤ۔ ۞

پس اگر ابوالحسنؑ نے ابو بکر کی جبری بیعت کے بعد صبر کیا، تو اس کی وجہ
یہ تھی کہ رسول اللہؐ نے انھیں وصیت کی تھی۔ اس کی مصاحمت صاف ظاہر ہے۔
پانچویں بات یہ کہ پچھل باتوں کے ساتھ ایک اور بات کا اضافہ
کر دیجیے۔ مسلمان جب قرآن کریم پڑھتا ہے اور اس کی آیات پر غور کرتا ہے، تو اسے
ان قرآنی قصوں سے جن میں پہلی آیتوں کا ذکر ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں
ہم سے بھی زیادہ ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔

یہ دیکھیے!

* قاتیل نے اپنے بھائی ہاشم کو سفاک سے قتل کر دیا۔

* عبد الانبیاء حضرت نوحؑ کی ہزار سالہ کوشش کے بعد بھی بہت کم لوگ ان پر

۱۔ شیخ متقی ہندی، منتخب کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۳۴

۲۔ محب طبری، الریاض النضرہ، باب فضائل علی بن ابی طالب۔

ایمان لائے۔ ان کا اپنا بیٹا اور بیوی تک کا فرقہ۔

حضرت لوطؑ کے گاؤں میں صرف ایک ہی گھر مُومنین کا تھا۔

فِرْعٰن جنھوں نے دُنیا میں کبرِ باری کا دعویٰ کیا اور لوگوں کو اپنا غلام بنایا ان

کے یہاں صرف ایک فرد مُومن تھا، وہ بھی تَقِیّہ کیے ہوئے تھا یعنی اپنے

ایمان کو چھپاتے ہوئے تھا۔

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کو بیچے، انھوں نے حسد کی وجہ سے اپنے بے قصور

بھائی کے قتل کی سازش کی اور اسے محض اس لیے قتل کرنا چاہا کہ وہ ان

کے باپ حضرت یعقوبؑ کو زیادہ محبوب تھا۔

اور یہ بنی اسرائیل ہیں، انھیں اللہ نے حضرت موسیٰؑ کے ذریعے نجات

دلائی، ان کے لیے سمندر کے پانی کو بھاڑ دیا۔ انھیں جہاد کی تکلیف بھی

نہیں اٹھانی پڑی اور اللہ نے ان کے دشمنوں، فرعون اور اس کے لشکروں

کو ڈبو دیا۔ مگر ہوا کیا؟ ابھی سمندر سے باہر نکل کر ان کے پاؤں سوکھے

بھی نہیں تھے کہ یہ ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو بتوں کی پوجا کرتی تھی

تو کہنے لگے: ”موسیٰ! جیسے ان کے دیوتا ہیں، ویسا ہی ایک دیوتا

ہمارے لیے بھی بنا دو۔ موسیٰؑ نے کہا: تم تو جاہل لوگ ہو۔ اور جب

موسیٰؑ اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے روانہ ہوئے اور اپنی عدم موجودگی

میں اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا قائم مقام مقرر کر گئے تو لوگوں نے ان کے خلاف

سازش کی اور قریب تھا کہ انھیں مار ڈالتے۔ یہی نہیں انھوں نے اللہ کو

چھوڑ کر ایک بھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اس قوم کے لوگوں نے بہت

سے انبیاء کو قتل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمْ

اسْتَكْبَرْتُمْ فَقَتَلْتُمُوهُمْ وَقَتْلُكُمْ فَفَرَّقْنَاهُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

کیا ایسا نہیں ہوا ہے کہ جب کبھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ کچھ لایا

جو تمھیں پسند نہیں تھا تو تم نے سرکشی اختیار کی اور کچھ کو جھٹلایا

اور کچھ کو قتل کر دیا؟ (سورۃ بقرہ - آیت ۸۷)

* حضرت یحییٰ کو دیکھیے! وہ نبی تھے، پاک دامن تھے اور نیک تھے نہیں

قتل کیا گیا اور ان کا سر تحفہ کے طور پر بنی اسرائیل کی ایک زندی کو

بھیج دیا۔

* یہود و نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے اور صلیب پر چڑھانے کی

سازش کی۔

خود اس اُمتِ محمدیہ نے تیس ہزار کا شکر رسول اللہؐ کے لختِ جگر اور

اہلِ جنت کے سردار امام حسینؑ کو قتل کرنے کے لیے تیار کیا۔ حالانکہ ان کے ساتھ

فقط سترہ ہزار اصحاب تھے۔ لیکن ان لوگوں نے امام حسینؑ اور ان کے سب اصحاب کو

قتل کر دیا۔ حدیث ہے کہ امامؑ کے دودھ پیتے بچے تک کو نہ چھوڑا۔

اس کے بعد حیرت کی کون سی بات باقی رہ جاتی ہے؟ رسول اللہؐ نے خود

اپنے اصحاب سے فرمایا تھا:

تم جلد اپنے سے پہلوں کے طور طریقوں پر چلو گے۔ تم و جب ہ

و جب اندازِ بذرِ اُرع یعنی ہو بہو ان کا اتباع کرو گے۔ اگر وہ

گوہ کے بھٹ میں گھسے ہوں گے تو تم بھی اس میں گھس جاؤ گے

صحابہ نے پوچھا: کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ سے ہے؟

آپؐ نے فرمایا: تو اؤ۔ کس سے؟

حیرت کیسی! ہم خود بخاری و مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کا یہ قول پڑھتے ہیں:

قیامت کے دن میرے اصحاب کو بائیں طرف لایا جائے گا

تو میں پوچھوں گا: انھیں کدھر لے جا رہے ہو؟ کہا جائے گا:

جہنم کی طرف۔ میں کہوں گا: اے میرے پروردگار! یہ تو میرے

اصحاب ہیں۔ کہا جائے گا: آپ کو معلوم نہیں، انھوں نے آپ

کے بعد دین میں بدعت پیدا کی۔ میں کہوں گا: دور ہو وہ جس نے

میرے بعد دین میں تبدیلی کی میں دیکھتا ہوں کہ ان میں سے بہت ہی کم نجات پائیں گے۔ ۱۷

ایک اور حدیث ہے کہ

میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جو سب کے سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک کے۔ ۱۸

سچ کہا اللہ رب العزت نے جو دلوں کے بھید جاننے والا ہے وہ فرماتا ہے:

وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ .

گو آپ کا کیسا ہی جی چاہے، اکثر لوگ ایمان لانے والے

نہیں۔ (سورۃ یوسف - آیت ۱۰۳)

بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمُ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ .

بلکہ یہ رسول ان کے پاس حق لے کر آتے لیکن ان میں سے بیشتر

حق کو ناپسند کرتے ہیں۔ (سورۃ موسیٰ - آیت ۷۰)

لَقَدْ جِئْنَاكُمْ بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ .

ہم نے حق تم تک پہنچا دیا لیکن تم میں سے اکثر حق سے

بیزار ہیں۔ (سورۃ زخرف - آیت ۷۸)

إِلَّا أَنْ وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ .

یاد رکھو! اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر لوگ نہیں

جانتے۔ (سورۃ یونس - آیت ۵۵)

يُرْضَوْنَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ

فَاسِقُونَ .

تمہیں باتوں سے خوش کرتے ہیں اور دل ان کے انکاری

ہیں اور زیادہ تر ان میں بدعمل ہیں۔ (سورۃ توبہ - آیت ۸)

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ .

بے شک اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن ان میں

سے اکثر ناشکرے ہیں۔ (سورۃ یونس - آیت ۶۰)

يَعْرِفُونَ نِعْمَةَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ

الْكَافِرُونَ .

یہ لوگ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے

ہیں اور اکثر ان میں سے کافر ہیں۔ (سورۃ نحل - آیت ۸۳)

وَلَقَدْ صَدَقْنَاَهُ بَيْنَهُمْ لِيَذْكُرُوا فَبِأَىٰ أَكْثَرِ النَّاسِ

إِلَّا كُفُورًا .

ہم اس (پانی) کو ان کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ وہ

غور کریں۔ تاہم اکثر لوگ ناشکرے ہوتے بغیر نہیں رہتے۔

(سورۃ نمران - آیت ۵۰)

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ .

ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں پھر بھی

بشرک کیے جاتے ہیں۔ (سورۃ یوسف - آیت ۱۰۶)

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُونَ .

لیکن اکثر لوگ حق سے ناواقف ہیں اس لیے اس سے

رُگردان کرتے ہیں۔ (سورۃ انبیاء - آیت ۲۴)

أَقِمْنَ هَذَا الْحَدِيثَ تَعْبَبُونَ وَتَصْحَكُونَ وَلَا

تَبْكُونَ وَأَنْتُمْ سَامِدُونَ .

کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور روتے

نہیں، تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ (سورۃ نجم - آیات ۵۹ تا ۶۱)

حسرت و افسوس

یہ واقعات پڑھ کر نہ صرف مجھے بلکہ ہر مسلمان کو افسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے امام علیؑ کو خلافت سے دُور رکھ کر اپنا کتنا بڑا نقصان کر دیا۔ اُمت نہ صرف ان کی حکیمانہ قیادت سے محروم ہو گئی بلکہ ان کے علوم کے بحرِ فوار سے بھی صحیح معنی میں استفادہ نہ کر سکی۔

اگر مسلمان تعصب اور جذباتیت سے بالاتر ہو کر دیکھیں تو انھیں صاف نظر آئے گا کہ رسولِ اعظمؐ کے بعد علیؑ ہی اَعْلَمُ النَّاسِ ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ علمائے صحابہ جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تھی تو حضرت علیؑ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپ فتویٰ دے کر ان کی مشکل کشائی فرماتے تھے۔ عُمر بن خطاب تو اکثر کہا کرتے تھے :

لَوْ لَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ .

اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو گیا ہوتا یہ
یہ بھی یاد رہے کہ خود امام علیؑ علیہ السلام نے کبھی کسی صحابی سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔

تاریخ معترف ہے کہ علی بن ابی طالبؑ صحابہ میں سب سے زیادہ بہادر اور سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ کئی موقوفوں پر ایسا ہوا کہ دشمن نے پیش قدمی کی تو بہادر صحابہ بھی بھاگ کھڑے ہوتے لیکن امام علیؑ ہر موقع پر ثابت قدم رہے۔ اس کی دلیل کے لیے وہ امتیازی سند کافی ہے جو رسول اللہؐ نے اس

وقت عطا فرمائی جب آپؐ نے یہ کہا کہ
کل میں اس شخص کو علم دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ
سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور رسولؐ اس سے محبت رکھتے
ہیں۔ جو آگے بڑھ کر حملہ کرنے والا ہے، پیٹھ دکھانے والا نہیں !
اللہ نے اس کے دل کو ایمان کے لیے جانچ لیا ہے۔
سب صحابہ کی نظریں علم پر لگی تھیں مگر رسول اللہؐ نے علم علی بن ابی طالبؑ
کو عطا فرمادیا۔ لہ

مختصر یہ کہ علم و حکمت اور قوت و شجاعت امام علیؑ کی ایسی خصوصیات ہیں
جن سے شیعہ و سنی سب ہی واقف ہیں اور اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔
نصِ غدیر سے قطع نظر جس سے امام علیؑ کی امامت ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم قیادت
و امامت کا مستحق صرف عالم، شجاع اور قوی کو قرار دیتا ہے۔ علماء کی پیروی واجب
ہونے کے بارے میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے :

أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمْ مَنْ لَا
يُؤْتِي بِلَا أَنْ يَهْدِي فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ .
کیا وہ شخص جو حق کا راستہ دکھائے زیادہ مستحق ہے کہ اس
کی پیروی کی جائے یا وہ جو اس وقت تک راستہ نہیں دکھا سکتا
جب تک خود اسے راستہ نہ دکھایا جائے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے
فیصلے کرتے ہو ؟ (سورۃ یونس - آیت ۳۵)

بہادر اور جری کی قیادت کے واجب الاتباع ہونے کے بارے میں قرآن کریم
میں ہے :

قَالُوا إِنَّا يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ
بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ

لہ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۵ و صفحہ ۱۲ - جلد ۵ صفحہ ۷۶ - ۷۷ - صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۰۱

لہ بقول ابو علی سینا : علیؑ صحابہ میں ایسے ہیں جیسے محسوس میں معقول (یعنی جیسے جسم میں روح) (۱۲ اشرف)

لہ (۱) صحیح بخاری کتاب الحجۃ بنین، باب لا یرجم المجنون (۲) سنن ابی داؤد باب مجنون لیسرق
صفحہ ۱۴۷ (۳) مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۴۰ و ۱۵۴ (۴) موطا امام مالک بن انس کتاب الاشربة
صفحہ ۱۸۶ (۵) مسند شافعی کتاب الاشربة صفحہ ۱۶۶ (۶) کنز العمال ملا علی الدین مثنی جلد ۵ صفحہ ۹۵
(۷) مستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۳۷۵ (۸) درنثور سورہ مائدہ آیت ثمر (۹) سنن دارقطنی کتاب
الحدود (۱۰) شرح معانی الآثار طحاوی کتاب القضاء صفحہ ۲۹۴ -

اللَّهُ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ.

وہ کہنے لگے: اسے ہم پر حکمرانی کا حق کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ یہ نسبت اس کے ہم حکمران کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور اس کو تو کچھ مال و وسعت بھی نہیں دی گئی۔ پیغمبر نے جواب میں کہا: اول تو اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہارے مقابلے میں منتخب فرمایا ہے دوسرے یہ کہ علم اور جسامت دونوں میں اللہ نے اس کو زیادتی دی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وسعت دینے والا، جاننے والا ہے۔ (سورہ بقرہ - آیت ۲۴۷)

اللہ تعالیٰ نے امام علیؑ کو یہ نسبت دوسرے صحابہ کے علم میں بڑی وسعت عطا کی تھی اور وہ صحیح معنیٰ میں شہر علم کا دروازہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ ان ہی سے رجوع کرتے تھے۔ صحابہ کو جب کوئی ایسا مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تھا جسے وہ حل نہیں کر پاتے تھے تو کہا کرتے تھے:

مُعْضِلَةٌ وَلَيْسَ لَهَا إِلَّا أَبُو الْحَسَنِ.

یہ وہ مشکل ہے جسے ابوالحسنؑ کے سوا کوئی حل نہیں کر سکتا ہے۔ امام علیؑ کو اللہ تعالیٰ نے جسم میں بھی وسعت عطا فرمائی تھی برائیں معنیٰ کہ وہ واقعی اسد اللہ الغالب تھے۔ ان کی قوت و شجاعت صدیوں سے زبان زدِ خاص و عام ہے۔ مورخین نے ان کی قوت و شجاعت کی ایسی داستانیں رقم کی ہیں جو معجزہ سے کم نہیں۔ مثلاً:

باب خیبر کو اکھاڑنا جسے بعد میں ۲۰ صحابی مل کر بلا بھی نہ سکے۔

کعبہ کی چھت پر سے بڑے بُت ہٹیل کو اکھاڑنا۔

اس مضبوط چٹان کو الٹ دینا جسے پورا لشکر بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔

جب بھی موقع ہوتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا زاد بھائی کی خوبیاں اور فضائل بیان فرماتے اور لوگوں کو ان کی خصوصیات اور امتیازات سے باخبر کرتے رہتے تھے۔ کبھی فرماتے:

إِنَّ هَذَا أَخِي وَوَصِيِّي وَخَلِيفَتِي مِنْ بَعْدِي فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوهُ.

یہ میرے بھائی، میرے وصی اور میرے بعد میرے خلیفہ ہیں اس لیے ان کی بات سنو اور جو کچھ وہ کہیں اس پر عمل کرو۔ کبھی فرماتے:

أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي.

یعنی جو نسبت ہارون کو موسیٰ سے تھی وہی نسبت تمہیں مجھ سے ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ کبھی فرماتے:

مَنْ أَرَادَ أَنْ يَحْيَا حَيَاتِي وَيَمُوتَ مَمَاتِي وَلْيَسْكُنْ جَنَّةَ الْخُلْدِ الَّتِي وَعَدَنِي رَبِّي فَلْيُؤَالِ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ فَإِنَّهُ لَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ هُدًى وَلَنْ يُدْخِلَكُمْ فِي ضَلَالَةٍ.

جو کوئی یہ چاہتا ہے کہ میری طرح جیے اور میری موت مرے اور خلدِ بریں میں رہے جس کا مجھ سے میرے پروردگار نے وعدہ کیا ہے اسے چاہیے کہ علی بن ابی طالبؑ کا دوست بن جائے کیونکہ علیؑ تمہیں کبھی ہدایت کے دائرہ سے خارج نہیں کریں گے اور نہ کبھی گمراہی کے دائرے میں داخل کریں گے۔

۱۔ طبری، تاریخ الامم والملوک جلد ۲ صفحہ ۳۱۹۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ جلد ۲ صفحہ ۶۲۔

۲۔ صحیح بخاری باب فضائل علیؑ - صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۱۲۰۔

۳۔ مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱۲۸۔ طبرانی، معجم کبیر۔

سیرت رسولؐ کا تتبع کرنے والے کو معلوم ہوگا کہ رسول اللہؐ نے کبھی صرف اقوال پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان اقوال پر عمل بھی کر کے دکھایا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اپنی زندگی میں کسی صحابی کو علیؑ پر امیر مقرر نہیں فرمایا جب کہ دوسرے صحابہ ایک دوسرے پر امیر مقرر ہوتے رہتے تھے۔ غزوہ ذات السلاسل میں ابوبکر اور عمرؓ پر عمر بن عاص کو امیر مقرر فرمایا تھا۔

اسی طرح آپؐ نے تمام کبار صحابہ پر ایک کم عمر نوجوان اُسامہ بن زید کو اپنی وفات سے کچھ قبل امیر مقرر فرمادیا تھا۔ مگر علی بن ابی طالبؑ کو جب بھی کسی دستہ کے ساتھ بھیجا آپ ہی امیر ہوئے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے دو دستے روانہ فرمائے ایک کا امیر علیؑ کو بنایا اور دوسرے کا خالد بن ولید کو۔ اس موقع پر آپؐ نے کہا کہ اگر تم دونوں الگ الگ رہو تو تم میں سے ہر ایک اپنے لشکر کا امیر ہے لیکن اگر اکٹھے ہو جاؤ تو علیؑ پورے لشکر کے سالار ہوں گے۔

اس تمام بحث سے ہمارے نزدیک یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد علیؑ ہی مومنین کے ولی ہیں اور کسی کو ان سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔

لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے اس سلسلے میں سخت نقصان اٹھایا اور آج تک اٹھا رہے ہیں کیونکہ اس وقت جو بویا تھا اسی کا پھل کاٹ رہے ہیں۔ انگوں نے جو بنیاد رکھی تھی پھیلوں نے اس کا انجام دیکھ لیا!

کیا علیؑ کی خلافت سے بہتر خلافت راشدہ کا کوئی تصور کر سکتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اس بارے میں جو پسند کیا تھا اگر مسلمان اس کا اتباع کرتے تو علیؑ ایک ہی طریقے پر اس امت کی قیادت تیس سال تک بالکل اسی طرح کر سکتے تھے جیسے رسول اللہؐ نے کی تھی۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ ابوبکر اور عمرؓ نے متعدد دعوں پر اپنی رائے سے اجتہاد کیا اور بعد میں ان کا اجتہاد بھی ایسی سنت بن گیا جس کی پیروی ضروری خیال کی جانے لگی تھی۔ جب عثمان خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اور بھی

زیادہ تبدیلیاں کیں۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تو کتاب اللہ، سنت رسول اللہؐ اور سنت شیخین سب کو بدل دیا۔ اس پر صحابہ نے اعتراض بھی کیا، اور بالآخر ایک عوامی انقلاب میں خود ان کی جان بھی گئی لیکن اس سے اُمت میں ایسا فتنہ پیدا ہوا کہ آج تک اس کے زخم مندمل نہیں ہو سکے۔

اس کے برخلاف علیؑ سختی سے قرآن و سنت کی پابندی کرتے تھے اور ان سے سرِ موافقہ کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جب ان پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے ساتھ سنت شیخین کا بھی اتباع کریں گے پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ علیؑ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کی پابندی پر اس قدر زور کیوں دیتے تھے جب کہ ابوبکر، عمر اور عثمان اجتہاد اور تغیر پر مجبور ہو گئے تھے؟

اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ علیؑ کے پاس وہ علم تھا جو اور کسی کے پاس نہیں تھا۔ رسول اللہؐ نے انھیں خاص طور پر علم کے ہزار دروازوں سے ممتاز فرمایا تھا اور ان ہزار دروازوں میں سے ہر ایک سے ہزار اور دروازے کھلتے تھے یہ رسول اللہؐ نے علیؑ سے کہا تھا کہ :

اے علیؑ! میرے بعد میری اُمت میں جن امور کے بارے میں

اختلاف ہوگا تم ان کو صاف صاف بیان کر دو گے۔

رہے دوسرے خلفاء! انھیں قرآن کی تاویل تو درکنار قرآن کے بہت سے ظاہری احکام بھی معلوم نہیں تھے۔ مثلاً

بخاری اور مسلم کے باب التیمم میں ایک روایت ہے کہ کسی شخص نے عمر بن خطابؓ سے ان کے ایام خلافت میں پوچھا : امیر المومنین! میں جُنب ہو جاؤں اور

لے علاء الدین متقی، کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۳۹۲ حدیث ۶۰۰۹ - ابونعیم شعبانی، حلیۃ الاولیاء - حافظ قدس حق، نیاج المودۃ صفحہ ۷۳، ۷۷ - ابن عساکر، تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۴۸۳ -

لے مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۲ - ابن عساکر، تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۴۸۸ -

پانی نہ ملے تو کیا کروں؟ عمر نے کہا تو ایسی صورت میں نماز نہ پڑھو۔
 اسی طرح انھیں کَلَّالَہ کا حکم معلوم نہیں تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کاش میں
 کَلَّالَہ کا حکم رسول اللہؐ سے پوچھ لیتا۔ حالانکہ یہ حکم قرآن میں مذکور ہے۔
 کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بات تھی تو امام علیؑ نے ان امور کی وضاحت
 کیوں نہ کر دی جن میں رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اختلاف پیدا ہوا؟
 اس کا جواب یہ ہے کہ جس مسئلے میں بھی اُمت کو مشکل پیش آئی، امام علیؑ
 نے اس کے بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہر مشکل میں صحابہ ان ہی سے رجوع
 کرتے تھے، وہ ہر بات کی وضاحت کرتے تھے، مسئلے کا حل بیان کرتے تھے اور نصیحت
 کرتے تھے۔ مگر صحابہ کو جو بات پسند آتی تھی اور جو ان کی سیاست سے متصادم نہیں
 ہوتی تھی وہ اسے قبول کر لیتے تھے اور باقی کو چھوڑ دیتے تھے۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس
 کی سب سے بڑی گواہ خود تاریخ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر علی بن ابی طالبؑ اور ان کی اولاد میں سے ائمہ نہ ہوتے
 تو عوام اپنے دین کی امتیازی خصوصیات سے ناواقف ہی رہتے۔ لیکن لوگ۔ جیسا کہ
 قرآن نے ہمیں بتایا ہے۔ حق کو پسند نہیں کرتے، اس لیے انھوں نے اپنی خواہشات
 کی پیروی شروع کر دی اور ائمہ اہل بیتؑ کے بالمقابل نئے نئے مذاہب ایجاد کر لیے۔
 ادھر حکومتیں بھی ائمہ اہل بیتؑ پر پابندیاں عائد کرتی تھیں اور انھیں کہیں آنے
 جانے اور لوگوں سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی آزادی نہیں دیتی تھیں۔
 امام علیؑ منبر پر سے فرمایا کرتے تھے:

سَلُّوْنِي قَبْلَ أَنْ تَفْقِدُوْنِي !

لوگو! اس سے پہلے کہ میں تم میں نہ رہوں، جو پوچھنا چاہتے

ہو پوچھ لو۔

امامؑ کے علم و فضل کی یہی ایک دلیل کافی ہے کہ آپ نے نہج البلاغہ جیسا
 عظیم علمی سرمایہ چھوڑا۔ ائمہ اہل بیتؑ نے علم کی اس قدر کثیر مقدار چھوڑی ہے کہ

لہ کَلَّالَہ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بظاہر معنی ماں باپ اور اولاد کے علاوہ وارث کے ہیں۔

اس نے چار دانگ عالم کو بھر دیا۔ سب ہی ائمہٴ مسلمین خواہ سنی ہوں خواہ شیعہ اس
 کے گواہ ہیں۔

اس بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر قسمت علیؑ کا ساتھ دیتی اور انھیں سیرت
 رسولؐ کے مطابق تیس سال تک اُمت کی قیادت کرنے کا موقع ملتا تو اسلام عام
 ہو جاتا اور اسلامی عقائد لوگوں کے دلوں میں پختگی کے ساتھ جاگزیں ہو جاتے، پھر نہ
 کوئی فتنہ، صُغریٰ ہوتا نہ کوئی فتنہ کُبریٰ، نہ واقعہ کربلا ہوتا نہ یوم عاشور۔
 اگر علیؑ کے بعد گیارہ ائمہ کو قیادت کا موقع ملتا جن کا تعین رسول اللہؐ نے
 کیا تھا اور جن کی مدتِ حیات تقریباً تین صدی پر محیط ہے، تو دنیا میں ہر جگہ
 صرف مسلمان ہوتے اور کُرة ارض کی تقدیر بدل جاتی اور ہماری زندگی صحیح معنی
 میں انسانی زندگی ہوتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا تو فرمان ہے:

الْعَمَّ . أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا
 آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ .

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ وہ کہتے
 ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو امتحان میں نہیں ڈالا جائیگا۔

(سورہ عنکبوت۔ آیت ۲)

ائمہ سابقہ کی طرح مسلم ائمہ بھی اس امتحان میں ناکام رہی۔ اس کی تصریح
 متعدد موقعوں پر خود رسول اللہؐ نے فرمائی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی متعدد
 آیات میں بھی اس کی صراحت ہے۔ انسان وہ نا انصاف اور جاہل ہستی ہے

لہ جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ مسلمان یہود و نصاریٰ کے طریقوں پر قدم قدم چلیں گے
 اگر وہ گوہ کے بھٹ میں گھٹیں گے تو مسلمان بھی ایسا ہی کریں گے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔
 اسی طرح حدیثِ حوض میں رسول اللہؐ نے فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ ان میں بہت ہی کم
 نجات پائیں گے۔

لہ جیسا کہ سورہ آل عمران میں ہے: أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ اور سورہ
 فرقان میں ہے: يَا رِبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا النَّوَءَانَ مَعْجَرًا .

جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے :
 لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ أَحَدٌ يَعْمَلُهَا إِلَّا أَنْ يَتَعَمَّدَهُ
 اللَّهُ بِرَحْمَتِهِ وَفَضْلِهِ .
 کوئی شخص جنت میں اپنے اعمال کی وجہ سے داخل نہیں
 ہوگا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمادے اور اسے اپنی
 رحمت سے ڈھانپ لے ۔ لے

بحث کے آخر میں کچھ تبصرہ

میں اس طرح کے اقوال دیکھ کر اکثر دانشوروں اور پروفیسروں کی مجلس
 میں اس پر افسوس کیا کرتا تھا کہ خلافت اس کے صحیح حقدار علی بن ابی طالب کے
 ہاتھ سے نکل گئی۔ آخر ایک دن ان میں سے ایک پروفیسر صاحب نے یہ کہہ کر مجھ پر
 اعتراض کیا کہ
 ”علی بن ابی طالبؑ نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے کیا کیا ہے ؟ انھوں نے
 اپنی پوری زندگی خلافت کی تنگ دود میں گزار دی اور اس کے لیے ہزاروں مسلمانوں
 کو مروا دیا۔ ان کی ساری جنگیں خلافت ہی کے لیے تھیں۔ اس کے برعکس ان سے
 پہلے کے خلفائے ثلاثہ نے اپنی زندگی اسلام کی اشاعت میں صرف کردی اور غرہ
 اسلام کی عزت و وقار کے لیے کام کیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے ملک فتح
 کیے اور شہر آباد کیے۔ اگر ابوبکر صدیقؓ نہ ہوتے تو عرب اسلام سے مرتد ہو گئے
 ہوتے۔ اور اگر عمر بن خطابؓ نہ ہوتے تو ایران اور روم اسلام کی اطاعت قبول نہ
 کرتے۔ اور اگر عثمان بن عفانؓ نہ ہوتے تو آج آپ مسلمان نہ ہوتے“ لے
 پھر ان صاحب نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا :

لے صحیح بخاری جلد ۷ صفحہ ۱۰۰ - صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین -

لے ان صاحب کا اشارہ عثمان بن عفان کے عہد میں شمال افریقہ کے فتح ہونے کی طرف تھا۔ مطلب
 یہ کہ اگر یہ فتح نہ ہوتی تو ہم بربر ہی رہتے۔ ہمارا اسلام سے کوئی واسطہ نہ ہوتا۔

جب علیؑ کو خلافت ملی تو انھوں نے وہ طوفان کھڑا کیا کہ سارا کاروبار خلافت
 ہی درہم برہم کر دیا۔ انتظام بگڑ گیا اور وہ اسلام جو ان خلفاء کے عہد میں طاقتور
 تھا، جن کی تیجائی صاحب تنقیص کرتے اور جن کی نیکی اور پارسائی میں شک پیدا
 کرتے ہیں، وہ پیچھے ہٹنے اور ناکام ہونے لگا۔
 اب اس آخری الزام کا جس پر انھوں نے اپنی بات ختم کی میں کیا جواب دیتا
 بہر حال میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا اور جوش میں نہیں آیا۔ میں نے استغفار پڑھ
 کر کہا :

برادرانِ عزیز ! یہ پروفیسر صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں آپ اس سے متفق ہیں ؟
 اکثر نے کہا : ہاں اور بعض نے جواب نہیں دیا، خواہ اس لیے کہ میرا لحاظ کیا یا اس
 لیے کہ انھیں ان صاحب کی باتوں پر یقین نہیں تھا۔
 میں نے کہا کہ آپ کی اجازت سے میں پروفیسر صاحب کی ایک ایک بات
 کو لے کر اس پر گفتگو کروں گا، اس کے بعد فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔ خواہ آپ میرے
 حق میں فیصلہ دیں خواہ میرے خلاف۔ میں آپ سے صرف یہ چاہوں گا کہ آپ حق
 کا ساتھ دیں اور تعصب سے کام نہ لیں۔

سب نے کہا : بسم اللہ فرمائیے !

میں نے کہا : پہلی بات تو یہ ہے کہ علی بن ابی طالبؑ نے اپنی تمام زندگی
 خلافت کی تنگ دود میں نہیں گزار دی، جیسا کہ پروفیسر صاحب نے فرمایا ہے، بلکہ سچ تو
 یہ ہے کہ وہ خلافت سے گریزاں تھے۔ اگر وہ خلافت کے پیچھے دوڑتے تو رسول اللہ ﷺ کی
 تجہیز و تکفین کو چھوڑ کر دوسروں کی طرح جلدی سقیفہ پہنچتے اور وہاں انھیں کی بات
 در رہتی خصوصاً ایسی حالت میں کہ اکثر صحابہ ان کی رائے سے اتفاق کرتے تھے۔ پھر
 ہم دیکھتے ہیں کہ جب ابوبکرؓ کی موت کے بعد خلافت حضرت عمرؓ کو مل گئی، جب بھی
 انھوں نے صبر سے کام لیا اور کوئی مخالفت نہیں کی۔ پھر عمرؓ کے بعد جب انھیں خلافت
 کی پیشکش ہوئی تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس پیشکش کے
 ساتھ جو شرائط تھیں وہ ان کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ اس سے پروفیسر صاحب
 کے خیالات کی بالکل تردید ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر علیؑ خلافت کے پیچھے دوڑ رہے ہوتے

توان کا کیا نقصان تھا، وہ سنتِ شیخین پر عمل کی شرائط کو منظور کر لیتے اور پھر جودل چاہتا کرتے جیسا کہ عثمان نے کیا۔ اسی روئے سے علیؑ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ علیؑ نے اپنی زندگی میں نہ کبھی جھوٹ بولا اور نہ کبھی وعدہ خلافی کی۔ ان ہی اعلیٰ اصولوں کی پابندی کی وجہ سے علیؑ ناکام رہے جب کہ دوسرے کامیاب ہو گئے کیونکہ وہ اپنی مقصد برآری کے لیے جو چاہتے سو کرتے تھے۔ مگر علیؑ کہا کرتے تھے:

”میں جانتا ہوں کہ تمھاری بہتری کس بات میں ہے۔ مگر مجھے تمھاری بہتری کے لیے اپنی بربادی منظور نہیں۔“

سُبْحَانَ اللَّهِ! کیا کہنا امامؑ کی عظمت کا! سب مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ قضیہ سقیفہ کے بعد جب ابوسفیان نے علیؑ کے پاس آکر انھیں خلافت کا لالچ دیا اور کہا کہ میں ابوبکر اور ان کے حلیفوں سے قتال کے لیے آدمیوں کا اور روپیوں کا انتظام کر دیتا ہوں تو آپ نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور فرمایا:

”اے ابوسفیان! فتنہ نہ پھیلا، میں جانتا ہوں کہ تیرے دل میں کیا ہے۔ میں مسلمانوں میں فتنہ و آشوب پسند نہیں کرتا، بہتر یہی ہے کہ الگ رہوں اور افتراق پسندی سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔“

اگر آپ خلافت کے پیچھے دوڑتے ہوئے تو اس پیشکش کو ضرور قبول کر لیتے۔ لیکن آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی سلامتی کی خاطر قربانی دی اور صبر سے کام لیا۔ علیؑ ہی نے تو ابن عباس سے کہا تھا کہ تمھاری دنیا کی میرے نزدیک بس اتنی وقعت ہے جتنی اس پتے کی جس کو کوئی مڈی اپنے منہ میں لے کر چبا ڈالے یا اتنی جتنی کسی بکری کی رینٹ کی ہوتی ہے یہ

لَهُ إِنَّ دُنْيَاكُمْ عِنْدِي لَأَهْوَىٰ مِنْ ذَرَّةٍ فِي فَمِ جَرَادَةٍ تَقْضِيْهَا. (بخاری)

خطبہ (۲۲)
لَهُ وَلَا لَفَيْتُمْ دُنْيَاكُمْ هَذِهِ أَرْهَدَ عِنْدِي مِنْ عَفْطَةِ عَنَزٍ. (بخاری)

(ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب امیر المومنین امام علیؑ اہل بصرہ سے جنگ کے لیے نکلے تو میں مقامِ ذی قار میں آنجناب کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنا جوتا ٹانگ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمایا کہ اے ابن عباس! اس جوتے کی کیا قیمت ہوگی؟ میں نے کہا: اب تو اس کی کچھ بھی قیمت نہ ہوگی۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: بخدا! اگر میرے پیش نظر حق کی سر بندی اور باطل کی نابودی نہ ہو تو مجھے یہ جوتا تم لوگوں پر حکومت کرنے سے زیادہ عزیز ہے۔)

تو جناب آپ کا یہ فرمان کہ علیؑ خلافت کے پیچھے دوڑتے تھے، اس کی تو تاریخی واقعات سے تردید ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے خلافت کے حصول کی خاطر ہزاروں مسلمانوں کو قتل کر دیا اور ان کی سب لڑائیاں صرف اسی مقصد کے لیے تھیں تو یہ دعویٰ بھی بالکل جھوٹ اور سرسبز بہتان ہے اور حقائق کو سن کر ناہے۔ اگر آپ نے ناواقفیت کی بنا پر ایسا کہا ہے تو اللہ سے معافی مانگیں اور توبہ استغفار کریں اور اگر آپ نے جان بوجھ کر ایسا کہا ہے تو آپ کی سب معلومات بالکل غلط اور جھوٹ ہیں کیونکہ امامؑ کی وہ لڑائیاں جن کا آپ نے ذکر کیا اس کے بعد کی ہیں جب خلافت آپ کے پیچھے دوڑتی ہوئی آپ کے پاس آچکی تھی۔ آپ کو خلافت کے قبول کرنے پر لوگوں نے مجبور کیا تھا بلکہ انکار کرنے کی صورت میں آپ کو قتل کرنے دھکی بھی دی گئی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ علیؑ چوتھائی صدی تک خاموش اور خانہ نشین رہے۔ اس طویل مدت میں نہ خلفاء کی کسی جنگ میں حصہ لیا اور نہ تلوار میدان سے نکالی تو جناب! پھر آپ کیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی جنگیں خلافت کے حصول کی خاطر تھیں؟ اور کیسے یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے حصولِ خلافت کے لیے ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟

جنگِ جمل تو عائشہؓ، طلحہ اور زبیر نے شروع کی تھی۔ ان ہی لوگوں نے بصرہ

اے رسول اللہؐ کی ان مذمہ محترمہ نے آیہ قرآنِ فی مِیْنِکُمْ کی خلاف ورزی کر کے سیاسی فتوں کو عالمِ اسلام میں راہ دی اگرچہ بعد میں وہ اس پریشان ہوئی اور بولیں، کاش میرا رسول اللہؐ سے بہت سا پیچھے ہوتے اور سارے جملے گریں اس قبضے میں ہاتھ نہ ڈالتی!

میں داخل ہو کر لوگوں کو قتل کیا تھا اور بیت المال لوٹ لیا تھا۔ جنگِ جمل کو جنگِ عہد شکنان بھی کہا جاتا ہے کیونکہ طلحہ اور زبیر نے اس وقت بیعت توڑ دی تھی جب امام علیؑ نے انھیں کوٹنے اور بصرہ کا والی بنانے سے انکار کر دیا تھا۔

رہی جنگِ صفین تو یہ معاویہ نے گلے منڈھی تھی۔ معاویہ ہی نے ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا۔ سب سے بڑھ کر عمار بن یاسر کو۔ اور یہ سب کچھ خلافت کے حصول کے لیے کیا۔ تو میرے بھائی! آپ کیوں حقائق کو مسخ کرتے ہیں۔ حالانکہ تاریخ ثابت ہے کہ جنگِ صفین کی ابتدا معاویہ نے خونِ عثمان کا دعویٰ لے کر شروع کی تھی لیکن اصل میں معاویہ کا مقصد حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ اس کی گواہی خود معاویہ نے اس خطبہ میں دی جو انھوں نے جنگ کے بعد کوفہ میں داخل ہونے کے بعد دیا تھا۔

معاویہ نے کہا:

”میں نے تمہارے ساتھ اس لیے جنگ نہیں کی کہ تم نماز پڑھو

یا روزے رکھو یا حج کرو اور زکوٰۃ دو۔ یہ سب کام تو تم پہلے ہی کرتے

ہو۔ میں نے جنگ تمہارا امیر بننے کے لیے لڑی تھی۔ اللہ نے

مجھے اس میں کامیابی دی گو تمہیں یہ بات پسند نہیں تھی۔“

جنگِ صفین کو ظالموں اور باغیوں کی لڑائی بھی کہا جاتا ہے۔ رہی جنگِ نہردان! یہ خوارج کی لڑائی تھی۔ یہ جنگ بھی باغیوں نے امام علیؑ پر تسلط کی تھی۔ یہ ہیں وہ لڑائیاں جو امام علیؑ نے لڑیں۔ امام علیؑ ہر موقع پر لوگوں کو کتاب اللہ کی طرف بلاتے رہے اور اپنے مخالفین پر توبہ قائم کرتے رہے۔

جناب! آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ آپ تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کریں تاکہ

۱۔ طبری، ابن اثیر، یعقوبی، مسعودی اور وہ تمام مؤرخین جنھوں نے جنگِ جمل کا حال لکھا ہے۔

۲۔ طبری، تاریخ الامم والملوک جلد ۵ صفحہ ۱۵۳ - ابن کثیر، البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۲۲۷ -

ابن واضح یعقوبی، تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۲۷ -

۳۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۱ - ابوالفرج اصفہانی، مقاتل الطالبیین صفحہ ۷۰ -

۴۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ جلد ۴ صفحہ ۱۶ -

حق و باطل کو پہچان سکیں اور اولیاء اللہ پر بیجا الزام لگانے سے بچ سکیں۔

اس موقع پر ایک اور پروفیسر صاحب نے جو شاید تاریخ کے ماہر تھے، اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا:

آپ نے جو کچھ کہا بالکل صحیح ہے۔ معاذ اللہ امام علیؑ رحمہ اللہ وجہ خلافت کے لالچی نہیں تھے اور نہ وہ خلافت کی طمع میں کسی ایک شخص کو بھی قتل کر سکتے تھے، سخت انسوس کی بات ہے کہ ابھی تک بعض مسلمان علیؑ پر رشک کرتے ہیں جبکہ عیسائی بھی ان کا احترام کرتے ہیں۔ میں نے حال ہی میں ایک عیسائی مصنف جارج جرداق کی ایک کتاب پڑھی ہے جس کا نام ہے صومۃ العدالۃ الانسانیہ (بندلے عدالتِ انسانی) اس کتاب میں اس نے حیران کن واقعات بیان کیے ہیں جو شخص بھی اس کتاب کو پڑھے گا، امام علیؑ کی عظمت کے سامنے سر جھکا دے گا۔

اس پر ایک تیسرے پروفیسر صاحب ان کی بات کاٹ کر بولے: آپ نے شروع سے ہی یہ بات کیوں نہ کہی؟

انھوں نے جواب دیا: میں درحقیقت تیجانی بھائی کی باتیں سن رہا تھا میں انھیں پہلے سے نہیں جانتا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ ان کا جواب سنوں اور ان کی معلومات کا اندازہ لگاؤں۔ الحمد للہ! انھوں نے اپنے دلائل سے ہمیں لاجواب کر دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ یہ صاحب بھی امام علیؑ کی نفیست کے قائل ہیں لیکن انھیں ابوبکر اور عمرؓ کی حمایت میں جوش آگیا، اس لیے وہ تیجانی بھائی کی باتوں کے ردِ عمل کے طور پر امام علیؑ کی شان میں گستاخی کر بیٹھے جس کا انھیں احساس بھی نہیں ہوا۔

پہلے پروفیسر صاحب نے بھی اپنے ساتھی کی اس بات کو پسند کیا کیونکہ اس طرح انھیں اس شخص سے نجات مل گئی جس میں وہ سب کے سامنے اپنی ہی باتوں کی وجہ سے پھنس گئے تھے۔ مگر چاہے حق ظاہر ہو چکا تھا اور ان صاحب کے لیے بہتر تھا کہ اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے صحابہ کا دفاع کرتے مگر وہ از روئے جہالت حقائق کو سن کرتے ہوئے کہنے لگے:

جی ہاں! میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ خلفاء کا اسلام اور مسلمانوں بڑا احسان ہے

چاہے انھوں نے کچھ بھی کیا ہو۔ آخر کو وہ بشر تھے اور کسی نے بھی ان کے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی خوبیاں بیان کریں (اور خامیوں پر پردہ پڑا رہنے دیں) یہ صحیح نہیں ہے کہ شیعوں کی طرح خلفاء کی فضیلت کا انکار کریں اور حب علی رضی اللہ عنہ سے کام لیں۔

میں نے کہا: اگر اجازت ہو تو میں اپنا جواب مکمل کر لوں تاکہ آپ میں سے کسی کے ذہن میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

”ان صاحب کا یہ کہنا کہ امام علیؑ سے پہلے جو تین خلفاء ہوئے ان کی زندگیاں اشاعت اسلام میں صرف ہوتیں اور ان کے عہد میں بڑی فتوحات ہوتیں، نیز یہ کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں آج مسلمان نہ ہوتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان فتوحات کا مقصد اللہ کی رضا اور اسلام کی عزت تھا تو اللہ اس کی جزا دے گا، لیکن اگر مقصد اپنی فوقیت جتانا، مال غنیمت حاصل کرنا اور عورتوں کو باندیاں بنانے کے لیے قید کرنا تھا تو پھر اس کا نہ کوئی اجر ہے اور نہ ثواب۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب عثمان بن عفان کی مخالفت نے زور پکڑا اور لوگ ان پر اعتراض کرنے لگے تو انھوں نے مردان بن حکم اور معاویہ بن ابی سفیان سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ”افریقہ فتح کرنے کے لیے فوجیں بھیج دو تاکہ لوگوں کا دھیان بٹ جائے، پھر چاہے ان کی پیٹھ پر جو تیں رنگتی رہیں انھیں فکر ہوگی تو اس کی کہ کاٹھی سے ان کے گھوڑوں کی پیٹھ پر زخم نہ پڑ جائیں“۔ چنانچہ عثمان نے اپنے دودھ شریک بھائی عبداللہ بن ابی سرح کی قیادت میں افریقہ فتح کرنے کے لیے فوج بھیج دی اور فتح کے بعد بلا شرکت غیر سے عبداللہ بن ابی سرح کو افریقہ کا پورا خراج دے دیا۔ یہ عبداللہ بن ابی سرح ایک دفعہ ایمان لانے کے بعد مُرتد ہو گیا تھا اور رسول اللہؐ نے اعلان کر دیا تھا کہ اس کا خون مُباح ہے، جو شخص چاہے اسے قتل کر دے۔ جب رسول اللہؐ فتح مکہ کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے اپنے اصحاب کو ہدایت کی عبداللہ بن ابی سرح جہاں کہیں ملے اس کو قتل کر دو چاہے وہ کعبے کے

پر دے پکڑے ہوئے ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن عثمان نے اسے چھپایا اور فتح کے بعد اسے رسول اللہؐ کے پاس لے کر آئے اور اس کی سفارش کی۔ رسول اللہؐ خاموش اور اس بات کے منتظر رہے کہ کوئی اٹھ کر اسے قتل کرے، جیسا کہ آپ نے بعد میں فرمایا۔ اس پر عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہؐ مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیا ہوتا۔ آپ نے فرمایا:

نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا يَتَّبِعُنِي أَنْ تَكُونَ لَنَا خَائِنَةً الْأَعْيُنُ.

”ہم انبیاء کے لیے آنکھ سے دھوکا دینا نامناسب ہے۔“
یہ تھے فتح افریقہ کے اسباب! اور ایسے شخص کے ہاتھوں افریقہ کے لوگ مسلمان ہوئے۔ میں بھی اسی شخص کے توسط سے مسلمان ہوا! یہ تو ہوائی ایک بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ کس نے کہا ہے کہ اگر سقیفہ کا قصہ نہ ہوتا اور علیؑ کو خلافت سے دور نہ رکھا جاتا تو فتوحات بڑے پیمانے پر اور زیادہ نفع بخش نہ ہوتیں اور آج پورے کُرۃ الارض پر اسلام چھایا ہوا نہ ہوتا؟ پھر یہ بھی ہے کہ انڈونیشیا کو تو خلفاء نے فتح نہیں کیا تھا، وہاں تو اسلام تلواروں کے ذریعے نہیں بلکہ سوداگروں کے ذریعے پہنچا تھا اور آج بھی وہاں دنیا بھر میں سب سے زیادہ مسلمان ہیں۔ اور انڈونیشیا اس اسپین سے بہتر ہے جو ان لوگوں کے ہاتھوں تلوار سے فتح ہوا تھا اور جو آج اسلام اور مسلمانوں کا مخالف ہے۔

برادرانِ گرامی! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا قصہ آپ کو سناؤں:

ایک بادشاہ نے حج کو جانے سے پہلے وزیر کو اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔ ان دنوں حج کے سفر میں پورا ایک سال لگتا تھا۔ بادشاہ کے جانے کے بعد اس کے کچھ درباریوں نے وزیر کے خلاف سازش کر کے اسے قتل کر دیا اور اپنے میں سے ایک کو اس کی جگہ وزیر مقرر کر دیا۔ اس نئے وزیر نے بڑے بڑے کام کیے۔ سڑکیں اور مسجدیں بنوائیں، سرائے اور حمام بنوائے۔ بعض سرکش قبائل کو زیر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

مملکت پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی۔ لیکن جب بادشاہ کوچ سے لوٹنے پر یہ معلوم ہوا کہ اس کے قائم مقام کو قتل کر دیا گیا ہے تو وہ بہت افرختہ ہوا اور سب سازشیوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ ایک نے آگے بڑھ کر کہا: سرکار عالیجاہ! ہم نے جو آپ کی حکومت کی توسیع کے لیے اتنے بڑے بڑے کارنامے اور خدمات لائق انجام دی ہیں، کیا ان کے صلے میں ہمارے جرم کو معاف نہیں کیا جاسکتا؟ بادشاہ نے بگڑ کر کہا: چپ رہ نصیحت! تم نے میرے وزیر کو قتل کرتے۔ جسے میں اپنا قائم مقام مقرر کر کے گیا تھا۔ میرے ساتھ نمک حرامی کی ہے۔ رہی وہ خدمات جو تم نے انجام دی ہیں تو وہ اکیلا اس سے کئی گنا زیادہ کر سکتا تھا جو تم سب نے مل کر کیا ہے۔ یہ قصہ سن کر سب ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم مطلب سمجھ گئے۔

میں نے کہا: اب اس آخری فقرے پر آئیے جو ان پروفیسر صاحب نے کہا تھا کہ جب علیؑ کو خدافت مل گئی تو انھوں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا اور ہر چیز کو اٹھل پھل کر دیا!

ہم سب کو معلوم ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ طوفان تو حضرت عثمان کے عہد میں مچا اور ہر چیز اس وقت اٹھل پھل ہوئی جب انھوں نے اقربا پروری کے نتیجے میں اپنے فابری و فاجر رشتہ داروں کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا حالانکہ اس وقت بہترین صحابہ موجود تھے، جنھیں اس کے سوا کیا ملا کہ انھیں زد و کوب کیا گیا، شہر بدر کیا گیا اور ان کی ہڈی پسلیاں توڑی گئیں یہ اسلام اس وقت پیچھے ہٹنے اور ناکام ہونے لگا جب مسلمان بنی اُمیہ کے غلام بن گئے۔ پروفیسر صاحب! آپ یہ سب حقائق لوگوں کو اور خصوصاً اپنے شاگردوں کو

لے جیسے عماد بن یاثر کو زد و کوب کیا گیا، ان کی آنت اُتر آئی، ہینوں علاج کرتے رہے۔

لے ابوذر غفاریؓ نے بورژوا طبقے کی مخالفت کی تو شہر بدر کیے گئے۔ اکیلے پڑے ہوئے

جان دے دی۔

لے عبد اللہ بن مسعودؓ نے فاسقوں کو مسلمانوں کا سال دینے پر اعتراض کیا تو وہ مار دی گئی

کر پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

کیوں نہیں بتلاتے اور ان کی صحیح رہنمائی کیوں نہیں کرتے۔ جب امام علیؑ کو خلافت ملی تو انھوں نے دیکھا کہ کچھ بے دین ہیں، کچھ ظالم ہیں اور کچھ غدار ہیں باقی جو بچے وہ سب منافق ہیں۔ حقیقی مسلمان صرف چند تھے جنھوں نے علیؑ کی ان ہی اُمور پر بیعت کی جن اُمور پر رسول اللہؐ کی بیعت کی تھی۔ امام علیؑ نے بگاڑ کو دُور کرنے، عدالت کو قائم کرنے اور مُعاملات کو رُوبراہ لانے کی اپنی سی پوری کوشش کی یہاں تک کہ وہ اسی اصلاح کی کوشش میں شہید ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے بیٹے شہید ہوئے انھیں زہر دیا گیا اور وہ بھی اصلاح کی راہ میں قربان ہو گئے۔ اس کے بعد امام علیؑ کے دُوسرے بیٹے امام حسینؑ اپنے ساتھیوں، بھائیوں، بیٹوں اور اہل بیت سمیت شہید ہوئے۔ ائمہ اہلبیتؑ میں سے ہر امام نے شہادت پائی خواہ تلوار سے مقتول ہو کر یا زہر سے مسموم ہو کر۔ ان سب ائمہ نے اپنے نانا کی اُمت کی اصلاح کی خاطر اپنی جان کی قربانی دی۔

میں یہاں ایک لطیفہ بیان کرنا چاہتا ہوں، اس سے آپ کو امام علی بن ابی طالبؑ کی قدر و منزلت کا اندازہ ہو گا:

ایک دفعہ ایک شخص امام علیؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا امیر المؤمنین! میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ امامؑ نے فرمایا: جو چاہو پوچھو۔ اس نے کہا: یہ کیا بات ہے کہ ابوبکر اور عمرؓ کے زمانے میں تو حالات ٹھیک رہے لیکن آپ کے زمانے میں ٹھیک نہ ہو سکے۔ امام علیؑ نے برجستہ جواب دیا: ابوبکر اور عمرؓ مجھ جیسے لوگوں پر حکومت کرتے تھے اور میں تم جیسے لوگوں پر حکومت کرتا ہوں۔ اسی لیے یہ انتشار پیدا ہو گیا۔

کیا خوب اور شافی جواب ہے اس کی طرف سے کہ تاریخ نے رسول اللہؐ کے بعد اس جیسا معلم نہیں دیکھا۔

اس قصہ کو سن کر سب حاضرین بہت محفوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ آخر علیؑ

لے ذرا غور فرمائیے کہ وہ کون سے حالات اور اسباب تھے کہ رسول اللہؐ کی رحلت کے صرف پچاس سال

بعد رسول اللہؐ کے نام لیواؤں نے رسول اللہؐ کی اولاد کو جھوکا پایا سا شہید کر دیا۔ (ناشر)

شہرِ علم کا دروازہ تھے۔

خلیفہ مقرر ہونے کی خبر مشہور ہو چکی تھی اور سب لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں، وہ یہ خبر ان لوگوں تک پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں۔

ہوایوں کہ جب حارث بن نعمان فہری کو یہ خبر ملی تو اسے ذرا پسند نہیں آئی۔ وہ رسول اللہؐ کے پاس آیا اور اپنی اونٹنی مسجد کے دروازے کے سامنے بٹھا کر سیدھا رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچا اور کہنے لگا: اے محمدؐ! تم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم یہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور تم اللہ کے رسول ہو، ہم نے تمہاری یہ بات مان لی۔ تم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم دن رات میں پانچ نمازیں پڑھیں رمضان کے روزے رکھیں، بیت اللہ کا طواف کریں، اپنے اموال کی زکوٰۃ دیں ہم نے یہ بات بھی مان لی۔ لیکن تم نے اس پر بس نہیں کی، اپنے چچا کے بیٹے کو اُونچا اٹھا دیا۔ اے سب لوگوں سے بڑھا دیا اور کہہ دیا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاً فَعَلَيْ مَوْلَاہُ۔ اب یہ بات تمہاری اپنی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے یہ

رسول اللہؐ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ آپ نے فرمایا: خُدَائے واحد کی قسم! یہ اللہ کی طرف سے ہے، میری طرف سے نہیں۔ آپ نے اس بات کو تین بار دہرایا۔ حارث وہاں سے اٹھا اور کہنے لگا: اے اللہ! محمدؐ جو کہہ رہے ہیں اگر وہ

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بدو مدینے سے باہر رہتے تھے، وہ علی بن ابی طالبؓ کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان سے نفرت رکھتے تھے بلکہ وہ تو رسول اللہؐ کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ گنوار رسول اللہؐ کے پاس آتا ہے تو سلام نہیں کرتا، آپ کا نام لے کر بچا رہتا ہے۔ سچ کہا ہے اللہ تعالیٰ نے:

الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَنْ لَا يَعْلَمُوا
حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ .

”عرب کے بدو سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل ہیں کہ جو کچھ اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے اس کی حدود سے واقف ہی نہ ہوں“

(سورۃ توبہ - آیت ۹۷)

میں نے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کر دی کہ: ہمارے پروفیسر صاحب نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں خلفائے ثلاثہ کی تنقیص کرتا ہوں اور ان کے کردار کی پاکیزگی میں شبہ پیدا کرتا ہوں، تو یہ محض تہمت ہے۔ کیونکہ میں نے فقط وہی کچھ کہا ہے جو بخاری و مسلم نے کہا ہے اور اہل سنت مورخین نے کہا ہے۔ اگر آپ اسے تنقیص اور کردار کشی تصور کرتے ہیں تو مجھے الزام دینے کے بجائے ان لوگوں کو الزام دیں۔ مجھ سے تو آپ فقط یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ میں کوئی ایسی سند دکھاؤں جو اہل سنت کے نزدیک قابل اعتماد ہو۔ مجھے آپ صرف اس وقت الزام دے سکتے ہیں جب آپ خود ان سندوں کو دیکھ کر میرا کوئی ایک بھی جھوٹ پکڑ سکیں۔

سب نے یک زبان ہو کر کہا: واقعی اس طرح کی بحثوں میں یہی ہونا بھی چاہیے۔ سب نے پروفیسر صاحب پر زور دیا کہ مجھ سے معذرت کریں۔ چنانچہ انھوں نے معذرت کر لی۔ فَلَیْلَہُ الحمد

امام علیؓ کی ولایت کے دوسرے شواہد

چونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ امام علیؓ کی ولایت کو مسلمانوں کے لیے آزمائش قرار دیا جائے، اس لیے اس بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ مگر چونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان بھی ہے اور وہ انگوں کی حرکتوں کا پچھلوں سے مواخذہ نہیں کرتا۔ اس لیے اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہوا کہ اس واقعہ کے ساتھ کچھ اور ایسے اہم واقعات کو منسلک کر دیا جائے جن کی نوعیت تقریباً معجزات کی ہو، تاکہ یہ واقعات اس بات کا محرک بن جائیں کہ ولایت علیؓ کے واقعہ میں موجود لوگ اس واقعہ کو نقل کرتے رہیں اور بعد میں آنے والے اس واقعہ سے منسلک دوسرے واقعات سے عبرت پکڑیں، شاید اس طرح اس واقعہ پر مسلسل گفتگو کے نتیجے میں لوگ راہِ حق پر گامزن ہو سکیں۔

پہلا واقعہ: اس واقعے کا تعلق اس شخص کی سزا سے ہے جس نے ولایت علیؓ کو اس وقت جھٹلایا تھا جب غدیر خم میں امام علیؓ کے مسلمانوں پر

بچ ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایا ہم پر دردناک عذاب بھیج۔

لاری کہتا ہے کہ وہ ابھی اپنی اونیٹنی تک نہیں پہنچا تھا کہ آسمان سے ایک پتھر آیا جو اس کے سر پر گرا اور وہ وہیں ہلاک ہو گیا۔ تب آیہ سائل اتری۔ علاوہ ان مآخذوں کے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اور بھی بہت سے علمائے اہل سنت نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ جسے مزید حوالوں کی تلاش ہو، وہ علامہ عینی کی الفدریر کا مطالعہ کرے۔

دوسرا واقعہ: اس کا تعلق ان لوگوں کی سزا سے ہے جنہوں نے واقعہ غدیر کو چھپانے کی کوشش کی اور انھیں امام علیؑ کی بددعا لگی۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب امام علیؑ نے یوم رجبہ، کوفہ میں لوگوں کے مجمع میں منبر پر سے اعلان کیا کہ:

”میں ہر مسلمان کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ اگر اس نے غدیر خم میں رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہو کہ مَن کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیْ مَوْلَاہُ تو وہ کھڑے ہو کر جو کچھ اس نے سنا ہو اس کی گواہی دے لیکن وہ شخص کھڑا ہو جس نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ دیکھا ہو اور اپنے کانوں سے سنا ہو۔“

یہ سن کر تیس صحابی کھڑے ہو گئے، جن میں سے سولہ اصحاب بدر تھے۔ ان سب نے شہادت دی کہ رسول اللہؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں سے کہا تھا کہ:

کیا تمہیں معلوم ہے کہ مومنین پر ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ میرا حق ہے؟ سب نے کہا: جی ہاں! پھر آپؐ نے کہا:

مَن کُنْتُ مَوْلَاہُ فَهَذَا مَوْلَاہُ۔ اَللّٰهُمَّ وَاٰلِیْہِ وَسَلَامُ عَلَیْہِمْ اَجْمَعِیْنَ۔

۱۔ حافظ حسکانی، شواہد التریل، جلد ۱، صفحہ ۲۸۶۔ ابو اسحاق ثعلبی، تفسیر الکشف والبيان۔ محمد بن احمد قرطبی، تفسیر الجامع لاحکام القرآن، جلد ۱۸، صفحہ ۲۷۸۔ محمد رشید رضا، تفسیر المنار، جلد ۸، صفحہ ۲۶۸۔ حافظ قد زرقانی، ینایع الودود، صفحہ ۸۲۳۔ حاکم نیشاپوری، مستدرک علی الصحیحین، جلد ۲، صفحہ ۵۰۶۔ علی بن برہان الدین حلبی، شریعہ حلبیہ، جلد ۳، صفحہ ۲۷۵۔

لیکن بعض صحابہ جو واقعہ غدیر میں موجود تھے، علیؑ سے حسد اور بغض کی وجہ سے بیٹھے رہے اور شہادت دینے کے لیے کھڑے نہیں ہوئے، ان میں انس بن مالک بھی تھے۔ جب امام علیؑ منبر پر سے اترے تو آپؑ نے ان سے کہا: انس! کیا بات ہے تم دوسرے صحابہ کے ساتھ اس دن جو کچھ تم نے سنا تھا اس کی شہادت دینے کے لیے کھڑے نہیں ہوئے؟ انس نے کہا: امیر المومنین! اب میں بڑھا ہو گیا ہوں مجھے یاد نہیں رہا کیا بات ہوتی تھی۔ امام علیؑ نے کہا: اگر تم جھوٹ بول رہے ہو تو اللہ تمہیں برص کی بیماری میں مبتلا کرے۔ چنانچہ انس ابھی وہاں سے اٹھے بھی نہ تھے کہ ان کے چہرے پر برص کے داغ پڑ گئے۔ انس روتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے شہادت کو چھپایا تھا، اس لیے مجھے عذاب صاع، علیؑ کی بددعا لگ گئی۔

یہ مشہور قصہ ہے۔ اس کو ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں بیان کیا ہے جہاں باب البرص میں انس بن مالک کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جن کی بیماری سے شکل بگڑ گئی تھی۔

امام احمد بن حنبل نے بھی مسند میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ سب کھڑے ہو گئے سوائے تین آدمیوں کے جنہیں علیؑ کی بددعا لگ گئی۔

”مناسب ہو گا کہ یہاں ہم ان تین اشخاص کی تصریح کر دیں جن کا ذکر امام احمد بن حنبل نے احمد بن یحییٰ بلاذری کے حوالے سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”جب امام علیؑ نے شہادت طلب کی اس وقت منبر کے نیچے انس بن مالک، برار بن عازب اور جریر بن عبد اللہ بجلی بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان تین میں سے کوئی بھی نہیں اٹھا۔ امام علیؑ نے اپنی بات کو دہرایا پھر بھی ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر امام نے کہا: ”یا الہی! جو کوئی جانتے ہو جھٹے اس شہادت کو چھپاتے اسے اس وقت تک دنیا سے نہ اٹھانا جب تک اس پر کوئی ایسی نشانی نہ لگ جلتے جس سے وہ پہچانا جائے۔“ چنانچہ انس بن مالک کو برص

۱۔ ابن قتیبہ، کتاب المعارف، صفحہ ۲۵۱۔

۲۔ امام احمد بن حنبل، مسند، جلد ۱، صفحہ ۱۱۹۔

کی بیماری لگ گئی۔ براء بن عازب کی بیٹائی جاتی رہی اور جریرہ ہجرت کے بعد مدینہ
 بدو بن گئے اور شرارت جاکر اپنی ماں کے گھر مرے۔
 یہ ایک مشہور قصہ ہے جس کو بہت سے مؤرخین نے نقل کیا ہے۔
 فَأَعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ۔

جو شخص بھی اس واقعہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرے گا، جو تقریباً
 فراموش کیا جا چکا تھا اور جسے امام علیؑ نے چوتھائی صدی گزرنے کے بعد دوبارہ
 زندہ کیا تھا، وہ امام علیؑ کی عظمت، بلند ہمتی اور خلوص کا قائل ہو جائے گا
 انھوں نے نہ صرف صبر کا حق ادا کر دیا بلکہ صبر کے حق سے بھی زیادہ صبر کیا۔ جب
 بھی انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ضرورت محسوس کی تو بے کہے،
 ابوبکر، عمر اور عثمان کو نصیحت کرنے اور مفید مشورے دینے سے گریز نہیں کیا۔
 لیکن اس سب کے باوجود واقعہ غدیر ان کے ذہن میں ہمیشہ مستحضر رہا اور جب
 بھی موقع ملا انھوں نے اسے زندہ کیا۔ یہاں تک کہ بھڑے مجمع میں علی الاعلان
 انھوں نے دوسروں سے بھی اس واقعہ کی گواہی چاہی۔

دیکھیے امام علیؑ نے اس واقعہ کی یاد کو زندہ کرنے اور سب مسلمانوں پر خواہ وہ
 اس واقعہ کے وقت موجود تھے یا نہیں تمام محنت کرنے کا کیا دانشمندانہ طریقہ
 اختیار کیا ہے۔ اگر امام علیؑ یہ کہتے کہ لوگو! غدیر خم میں رسول اللہؐ نے خلافت کے
 لیے مجھے نامزد کیا تھا، تو حاضرین پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا بلکہ وہ انطا اعتراض کرتے کہ
 امام نے اتنی طویل مدت تک خاموشی کیوں اختیار کی۔

۱۔ ابن عساکر، تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۷ اور جلد ۳ صفحہ ۱۵۰۔ شرح نہج البلاغہ تحقیق محمد ابوالفضل
 جلد ۱۹ صفحہ ۲۱۷۔ میر حامد حسین موسوی، عقبات الانوار جلد ۲ صفحہ ۳۰۹۔ ابن مغازل، مناقب علی
 بن ابی طالب صفحہ ۲۳۔ علی بن برہان الدین صلی، سیرۃ حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۳۳۷۔

۲۔ ایک پہلو یہ ہے کہ امام علیؑ نے صحابہ کو دعوت دی تھی کہ حدیث غدیر کی شہادت دیں۔ اس واقعہ
 کو محدثین اور مؤرخین کی ایک بڑی تعداد نے بیان کیا ہے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا۔ جیسے امام احمد
 بن حنبل، ابن عساکر، ابن ابی الحدید وغیرہ۔

لیکن جب آپ نے یہ کہا کہ میں ہر مسلمان کو قسم دیتا ہوں کہ اگر اس نے وہ
 سنا ہو جو رسول اللہؐ نے غدیر کے دن فرمایا تھا، تو وہ کھڑے ہو کر اس کی شہادت
 دے، تو اس واقعہ کو حدیث نبوی کے طور پر تیس سال صحابیوں نے بیان کیا جن میں
 ۱۶ بدری تھے۔ اس طرح امامؑ نے جھٹلانے والوں، شک کرنے والوں اور اتنی طویل
 مدت تک خاموشی اختیار کرنے پر اعتراض کرنے والوں کا منہ بند کر دیا۔ کیونکہ اب
 آپ کے ساتھ ساتھ ان تیس صحابہ کا شکوت اس بات کی روشن دلیل تھا کہ معاملہ
 دراصل نازک تھا اور جیسا کہ ظاہر ہے اس موقع پر شکوت ہی میں اسلام کا
 مفاد تھا۔

شوریٰ پر تبصرہ

گزشتہ ادراک میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ شیعوں کے بقول خلیفہ کا تعین
 اللہ کے ہاتھ میں ہے جو رسول اللہؐ وحی آنے پر کرتے تھے۔ یہ قول احکام اسلامی
 کے فلسفے سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔ کیونکہ سورہ قصص میں ہے: يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ
 وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ۔

اور چونکہ اللہ سبحانہ کی مشیت یہ ہے کہ اُمت محمدیہ بہترین اُمت ہو جو
 انسانوں کے لیے پیدا کی گئی ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی قیادت دانشمند
 پختل، قوت، شجاعت، ایمان اور زہد و تقویٰ کے اعلیٰ میار پر فائز ہو۔ یہ صفات
 صرف اس فرد میں پائی جاسکتی ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا ہو اور قیادت
 و سیادت کی خصوصی صفات سے نوازا ہو۔ سورہ حج آیت ۷۵ میں ہے:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ
 إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ۔

اللہ انتخاب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والوں
 کا اور اسی طرح آدمیوں میں سے بھی۔ بے شک اللہ خوب سننے
 والا، خوب دیکھنے والا ہے۔

جس طرح اللہ سبحانہ انبیاء کا انتخاب کرتا ہے اسی طرح اوصیاء کا بھی

وہی انتخاب کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے :

لِكُلِّ نَبِيٍّ وَصِيٌّ، وَأَنَا وَصِيٌّ عَلَى بَنِي طَالِبٍ
ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ میرے وصی علی بن ابی طالبؑ ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا :

أَنَا خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ وَعَلِيٌّ خَاتَمُ الْأَوْصِيَاءِ
میں خاتم الانبیاء ہوں اور علیؑ خاتم الاوصیاء ہیں۔

اس طرح شیعوں نے دوسروں کو بھی بے فکر کر دیا اور خود بھی آرام سے ہو گئے۔ انھوں نے اپنا معاملہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے سپرد کر دیا ہے۔ اب ان میں نہ کوئی خلافت کا دعویٰ کر سکتا ہے، نہ کسی کو خلافت کا لالچ ہو سکتا ہے، نہ کسی نص کی بنیاد پر اور نہ خود اپنی مرضی سے۔ کیونکہ ایک تو نص اختیار اور شوریٰ کی نفی کرتی ہے، دوسرے نص میں رسول اللہ ﷺ نے خود مخصوص اشخاص کا ناموں کے ساتھ تعین کر دیا ہے۔

اسی لیے شیعوں میں تو کسی کو خلافت کا دعویٰ کرنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر بالفرض کوئی ایسی جسارت کرے بھی تو اسے فاسق اور دین سے خارج سمجھا جائے گا۔

لیکن اہل سنت کے نزدیک خلافت کا فیصلہ شوریٰ اور لوگوں کی پسند سے ہوتا ہے۔ اس طرح اہل سنت نے ایسا دروازہ کھول دیا ہے جسے امت میں سے کسی شخص کے لیے بھی بند نہیں کیا جاسکتا اور اس طرح ہر ایسے غیر متھوئیر کے لیے موقع ہے کہ وہ خلافت کو لپچاتی ہوئی نظروں سے دیکھے۔ خلافت کا کھول

قریش ہی کے لیے نہیں بلکہ ایرانیوں، ترکوں، مغلوں حتیٰ کہ غلاموں کے لیے بھی ممکن ہو گیا۔ ایک شاعر نے خلافت اسلامیہ کا یوں نقشہ کھینچا ہے۔

هَزَلْتُ حَتَّى بَانَ مِنَ الْهَزَالِ

كَلَاهَا وَحَتَّى اسْتَأَمَّهَا كُلُّ مُفْلِسٍ

خلافت اس قدر لاغر ہو گئی ہے کہ دُبیلے پن سے اس کے گردے نظر آنے لگے اور ہر مفلس قلاش نے اسے اپنی ماں بنا لیا۔

وہ سب اقدار اور شرائط جن کا خلیفہ میں ہونا ضروری تھا، بھاپ بن کر ہوا میں اُڑ گئیں۔ ایسا ہونا قدرتی تھا کیونکہ بشر آخر بشر ہے، اس کے انسانی جذبات ہیں، خود غرضی اس کی جبلت ہے۔ وہ اقدار ملتے ہی بدل جاتا ہے اور پہلے سے بدتر ہو جاتا ہے۔

ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تصدیق اسلامی تاریخ سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں پر ایسے ایسے بدکاروں اور بدکرداروں نے حکومت کی ہے جن میں نہ حیا تھی، نہ اخلاق اور نہ ہی ایمان۔

مجھے ڈر ہے کہ بعض قارئین اسے مبالغہ تصور کریں گے۔ لیکن اگر وہ اُنویسوں اور عباسیوں وغیرہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کوئی امیر المؤمنین کھلم کھلا شراب پیتے تھے، بندروں سے کھیلے تھے اور بندروں کو سونے کے زیور پہناتے تھے۔ کسی امیر المؤمنین نے اپنی ایک کنیز کو اپنا لباس پہنا کر مسلمانوں کو نماز پڑھانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ ایک امیر المؤمنین کی حجابہ نامی باندی مگر تھی تو یہ حضرت ہوش دحواس ہی کھو بیٹھے تھے۔ ایک امیر المؤمنین کسی شاعر کے شعر سن کر ایسے مستاتے کہ لگے اس کا عضو تناسل چوڑے۔ ہم ان لوگوں کے حالات بیان کرنے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ ان کے متعلق مسلمانوں کا پہلے ہی فیصلہ ہے کہ یہ محض کٹ کھنی بادشاہت کی نمائندگی کرتے تھے خلافت کی قطعاً نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے ایک قول منسوب ہے کہ

الْخِلَافَةُ مِنْ بَعْدِي ثَلَاثُونَ عَامًا ثُمَّ تَكُونُ مِلْكًا عَصُوفًا.

لہ ابن عساکر، تاریخ دمشق جلد ۳ صفحہ ۵۔ خوارزمی، مناقب خوارزمی صفحہ ۴۲۔ ینابیع المودۃ صفحہ ۹۰۔
لہ حافظ قدوسی خنئی، ینابیع المودۃ جلد ۲ صفحہ ۳۰ بحوالہ طبعی۔ خوارزمی، مناقب خوارزمی محبت طبری، ذخائر العقبی۔
ستہ تعداد کی روایت بخاری و مسلم میں ہے۔ اور تعداد اور سمار کی حاکمیت کے لیے دیکھیے ینابیع المودۃ جلد ۲ صفحہ ۹۱۔

میرے بعد تیس سال خلافت رہے گی اس کے بعد کٹ کھنی
بادشاہت ہوگی۔

میرے خیال میں اس قول کو رسول اللہ ص سے منسوب کرنا درست نہیں ہے۔
کیونکہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان کو۔ جنہیں حضرت علی ص سے افضل شمار کیا جاتا ہے
بلکہ ذوالنورین اور کامل النبیاء والایمان کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے قتل کر دیا تھا
کیونکہ وہ ان سے تنگ آئے ہوئے تھے یہاں تک کہ انہوں نے حضرت عثمان کو
مسلمانوں کے قبرستان ”جنت البقیع“ میں دفن بھی نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ان کو
بے غسل و کفن بقیع سے ملتی یہودیوں کے قبرستان ”حشر کوکب“ میں سپرد خاک
کیا گیا۔

جو شخص تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرے گا، اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ خلفاء
کے کرتوت عام لوگوں سے بھی بدتر تھے لیکن اس وقت ہماری بحث کا موضوع یہ
نہیں ہے۔ جسے اس بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق ہو، وہ طبری
کی تاریخ الأمم والملوک، ابن اثیر کی کامل التاريخ، ابوالفداء کی المختصر فی
تاریخ البشر اور ابن قتیبہ دینوری کی الامامة والسیاسة وغیرہ سے رجوع کرے۔
میں صرف اپنی پسند سے خلیفہ مقرر کرنے کی خرابی اور اس نظریہ کا بنیادی بانجھپن
دکھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ جس کو ہم آج پسند کرتے ہیں، عین ممکن ہے کہ کل وہ
ہماری نظروں میں مردود قرار پائے اور یہ معلوم ہو کہ ہم نے غلطی کی تھی اور ہمارا
پسند صحیح نہیں تھی۔ ایسا ہو چکا ہے۔ عبدالرحمن بن عوف نے خود عثمان بن عفان کو
خلافت کے لیے پسند کیا لیکن بعد میں پھپھتائے مگر اس وقت کیا ہو سکتا تھا جب
چڑیاں چمک گئیں کھیت۔ عبدالرحمن بن عوف سابقین اقلین میں سے ایک جلیل القدر
صحابی تھے۔ جب ان کی پسند درست ثابت نہیں ہوتی تو کیسے کوئی ہوش مند شخص
ایسے بانجھ اور بے ثمر نظریے سے مطمئن ہو سکتا ہے جس نے صرف فتنہ و فساد، افراتفر
اور خونریزی کو جنم دیا ہو۔ جب ابوبکر کی بیعت کی جا رہی تھی۔ جو بقول عمر بن خطاب
اچانک ہو گئی تھی لیکن اللہ نے اس کے بڑے نتائج سے محفوظ رکھا۔ جس کی کتنے ہی
صحابہ نے مخالفت کی اور جب علی ص کی بیعت جو بر سر عام ہوتی تھی بعض صحابہ نے

تور دی جس کے نتیجے میں جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان واقع ہوئیں
تو کیسے کوئی دانش مند اس نظریے سے مطمئن ہو سکتا ہے جو آزمایا گیا لیکن شروع
ہی سے قطعی ناکام رہا بلکہ مسلمانوں کے لیے وبال ثابت ہوا۔ بالخصوص جب کہ
ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ جو شوری کے ذریعے سے خلیفہ کے انتخاب کے قاتل
ہیں ایک دفعہ کسی کے خلیفہ مقرر ہو جانے کے بعد نہ اسے تبدیل کر سکتے ہیں اور نہ
معزول کر سکتے ہیں۔ جب عثمان کو مسلمانوں نے معزول کرنا چاہا تو انہوں نے یہ کہہ کر
انکار کر دیا کہ جو قیص اللہ نے مجھے پہنایا ہے میں اسے نہیں اتاروں گا۔

مغرب کی متمدن قومیں جو جمہوریت کی چیمپیئن بنی ہوئی ہیں سربراہ مملکت
کے انتخاب سے متعلق ان کے طریقہ کار کو دیکھ کر ہمیں اس نظریے سے اور بھی نفرت
ہو جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیاں اقتدار کی دوڑ میں ایک دوسرے
کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں، مختلف اداروں سے سود سے بازی کرتی
ہیں اور ہر قیمت پر اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے
ارہوں ڈالر پروپیگنڈے پر خرچ کیے جاتے ہیں، جب کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقے
کو اس رقم کی سخت ضرورت ہوتی ہے جیسے ہی کوئی شخص اس سیاسی کھیل کے
ذریعے اقتدار کی کرسی تک پہنچ جاتا ہے تو وہ فوراً اپنے حامیوں، پارٹی ممبروں،
دوستوں اور عزیز رشتہ داروں کا وزارت کے منصبوں، اعلیٰ عہدوں اور کلیدی
انتظامی ذمہ داریوں پر تقرر کر دیتا ہے اور دوسرے لوگ سربراہی کی معینہ مدت ختم
ہونے تک حزب اختلاف میں رہتے ہیں۔ اور اس پوری مدت میں نہ صرف سربراہ
کے لیے مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کرتے رہتے ہیں بلکہ حتی الامکان کوشش کرتے ہیں
کہ اسے بدنام کریں اور ہو سکے تو عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعے اس کا اقتدار
ہی ختم کر دیں۔ اس سارے فیصلے میں مجبور اور بے دست و پا قوم کی تقدیر میں صرف
خسارہ ہی خسارہ ہے۔

مغربی نظام جمہوریت کے نتیجے میں کتنی انسانی اقدار پامال ہوتی ہیں اور
آزادی اور جمہوریت کے نام پر اور پرکشش نعروں کی آڑ میں کتنی سیاہ کاریاں فروغ
پاتی ہیں!! یہاں تک کہ (بعض یورپی ملکوں مثلاً برطانیہ میں) برادری کو قانوناً جائز

قرار دے دیا گیا۔ اور نکاح کے بجائے زنا کو ترقی پسندی شمار کیا گیا۔ میں حیران ہوں کہ مغربی تہذیب کی برکات کو کہاں تک گنواؤں !

دیوارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے کھرا جے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اب دیکھیے! شیعہ عقیدہ کتنا عظیم اور کتنا فراخ دلانہ ہے کہ اس کے مطابق خلافت اُصولِ دین میں شامل ہے، کیونکہ معاشرتی اور انفرادی زندگی کی درستگی کا دار و مدار اسی پر ہے۔

شیعوں کا یہ قول کہ منصبِ خلافت اللہ کے اختیار میں ہے ایک عاقلانہ اور صحت مندانہ نظریہ ہے، جس کو عقل قبول کرتی ہے، ضمیر کا اطمینان ہوتا ہے اور جس کی تائید قرآن و سنت سے ہوتی ہے اور ساتھ ہی اس سے لالچوں، غداروں اور منافقوں کی ہمت شکنی ہوتی ہے اور ظالموں، گردن کشتوں اور ملوک و سلاطین کا غرور خاک میں ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :
فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ
إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ
وَيَحْسَبُونَ أَنََّّهُم مُّهْتَدُونَ

ایک گروہ کو اس نے راہ دکھا دی اور ایک گروہ ہے کہ اس پر گمراہی ثابت ہو چکی۔ انھوں نے شیطانوں کو اپنا رفیق بنالیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ ہم راہ پاتے ہوئے ہیں۔

(سورۃ اعراف - آیت ۳۰)

مسئلہ تقدیر - اہل سنت کی نظر میں

میری گزشتہ زندگی میں قضا و قدر کا موضوع میرے لیے ایک چیلستان بنا ہوا تھا کیونکہ مجھے اس کی کوئی ایسی وضاحت نہیں ملتی تھی جو میرے دل کو لگے اور جس سے مجھے اطمینان حاصل ہو۔ میں اس سلسلے میں حیران و پریشان تھا۔

مجھے اہل سنت کے مدرسے میں یہ سکھایا گیا تھا کہ انسان اپنے افعال میں آزاد نہیں، وہ وہی کچھ کرتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے اور وہی کچھ بنتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس دو فرشتے بھیجتا ہے جو اس کی عمر، اس کی روزی اور اس کے اعمال کے بارے میں تفصیل لکھ دیتے ہیں۔ اور یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ وہ شقی ہوگا یا سعید یعنی خوش نصیب ہوگا یا بد نصیب۔

میں عجیب محضے میں گرفتار تھا کیونکہ ایک طرف تو مجھے یہ تعلیم دی گئی تھی، دوسری طرف میری عقل اور میرا ضمیر یہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ عادل ہے، وہ اپنی مخلوق پر ظلم نہیں کرتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کو ایسے افعال پر مجبور کرے جس کا وہ بعد میں محاسبہ کرے یا کسی کو ایسے جرم کی پاداش میں عذاب دے جو خود اس نے اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہو اور جس کے ارتکاب پر اسے مجبور کیا ہو۔ دوسرے مسلمان نوجوانوں کی طرح میں بھی اسی فکری تضاد میں مبتلا تھا اور میرا تصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ قوی اور جبار ہے، اس کی شان یہ ہے کہ

اس سے کچھ باز پرس نہیں کی جاسکتی، اوروں سے باز پرس ہوگی۔

۱۔ صحیح مسلم کتاب القدر -

لَا يُسْتَعْلَمُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْتَكُونُونَ (سورۃ انبیاء - آیت ۲۳)

وہ فعال لما یرید ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اُس نے مخلوق کو پیدا کیا، کچھ کو جنتی بنایا اور کچھ کو جہنمی۔ پھر یہ کہ وہ رحمن و رحیم ہے وہ اپنے بندوں پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے :
تھارا پروردگار اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا یہ

ایک اور آیت میں ہے :
”بے شک اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنے اپنے اندر ظلم کرتے ہیں“

اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :
”اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ شفیق ہے جتنی ماں اپنے بچے پر ہوتی ہے“

میں اسی فکری تضاد کے بیچ و خم میں الجھا ہوا تھا اور اس کی جھلک میرے قرآن کے سمجھنے میں بھی نظر آتی تھی۔ میں کبھی کہتا تھا کہ انسان خود اپنا نگران ہے اور وہی اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے :
”جو کوئی ذرا سی نیکی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرا سی بدی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا“

کبھی تو میں یہ سمجھتا تھا کہ انسان کو کوئی دوسری طاقت چلاتی ہے، اس کی اپنی کوئی قوت ہے اور نہ طاقت، وہ خود اپنے کو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اور نہ اپنے لیے روزی کا بندوبست کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہنجوائے قرآن :

لَهُ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ (سورۃ حمہ - آیت ۲۶)
لَهُ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ
(سورۃ یونس - آیت ۲۲)

۱۰۰ صبح بخاری جلد ۵ ص ۷۵ -
لَهُ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ
(سورۃ زلزال - آیت ۷-۸)

تم تو بس وہی چاہ سکتے ہو جو اللہ چاہے ہے
میں ہی نہیں بلکہ اکثر مسلمان اسی فکری تضاد میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء و مشائخ سے جب قضا و قدر کے بارے میں گفتگو کی جائے تو ان سے کوئی ایسا جواب نہیں بن پڑتا جس سے دُوسروں کو تو کیا خود انھیں بھی اطمینان ہو سکے۔ بس یہی کہہ دیتے ہیں کہ اس موضوع پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں بلکہ بعض تو تقدیر کی اس بحث کو ہی حرام قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمان کے لیے صرف اتنا ایمان لانا ضروری ہے کہ اچھی بری تقدیر اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر کوئی ضدی ان سے پوچھ بیٹھے کہ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ پہلے تو اپنے بندے کو گناہ کے ارتکاب پر مجبور کرے اور پھر اسے نار جہنم میں جھونک لے تو فوراً اس پر کافر و زندق ہونے کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم دین سے نکل گئے۔ غرض ایسے ہی لغو الزام لگائے جاتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلیں ٹھٹھر کر رہ گئی ہیں اور لوگوں کا عقیدہ یہ ہو گیا ہے کہ جو طے آسمانوں میں بنتے ہیں یعنی نکاح پہلے سے قسمت میں لکھا ہوتا ہے اور اسی طرح طلاق بھی۔ اور حد تو یہ ہے کہ زنا بھی مقدر ہوتا ہے۔ تقدیر مہر م کے ماننے والے کہتے ہیں کہ عورت کی شرمگاہ پر ان سب مردوں کے نام لکھے ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ صحبت کرنے والے ہیں۔ یہی حال شراب پیئے اور کسی کو قتل کرنے کا ہے۔ بلکہ یہی صورت کھلنے پینے کی ہے۔ تم وہ چیز کھا پی سکتے ہو جو اللہ نے تمھارا مقدر میں لکھ دی ہے۔

ایک مرتبہ یہ مسائل پیش کرنے کے بعد میں نے اپنے یہاں کے ایک عالم سے کہا کہ قرآن تو ان خیالات کی تکذیب کرتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ رسول، قرآن کے برعکس کچھ کہے۔ نکاح کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ
جو عورتیں تمھیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو یہ

لَهُ وَمَا نَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (سورۃ انسان - آیت ۱۳۰)
لَهُ فَأَنكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ (سورۃ نساء - آیت ۳)

اس آیت سے صاف اختیار اور آزادی کا اظہار ہوتا ہے۔

طلاق کے متعلق قرآن کریم میں ہے :

”طلاق تو دو ہی مرتبہ ہے، پھر یا تو رکھ لینا ہے قاعدے

کے مطابق یا چھوڑ دینا ہے خوش دلی کے ساتھ“۔

یہاں بھی وہی اختیار کی بات ہے۔

زنا کے متعلق ارشاد ہے :

”زنا کے پاس نہ پھٹکو کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے“۔

اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آدمی جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار

سے کرتا ہے۔

شراب کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے :

”شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے

آپس میں دشمنی اور کینہ ڈال دے اور تمھیں ذکرِ الہی اور نماز

سے روک دے۔ تو کیا تم ان کاموں سے باز آ جاؤ گے؟“۔

اس آیت میں شراب اور جوئے کی ممانعت کی گئی ہے جس کے معنی یہی

ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے کہ چاہے تو شراب پئے اور جو آکھیلے یا پھر یہ کام نہ کرے۔

قتلِ عمد کے بارے میں ارشاد ہے۔

”اللہ نے جس انسان کی جان کو محترم قرار دیا ہے اسے ناحق

قتل مت کرو“۔

۱۔ الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَإِمْسَالُهُ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيْعٍ بِإِخْسَانٍ - سورۃ بقرہ - آیت ۲۲۹

۲۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزَّيْنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا - سورۃ بنی اسرائیل - آیت ۱۳۲

۳۔ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ

وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ يٰۤأَيُّهَا

مَآءَ - آیت ۹۱ - ۴۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ - سورۃ النام

آیت ۱۵۲ -

۱۵۴

ایک اور آیت میں ہے :

”جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم

ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اس

پر لعنت کرے گا اور اس کے لیے دردناک عذاب تیار رکھے گا“۔

اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اختیار ہے کہ وہ کسی کو

قتل کرے یا نہ کرے۔

کھانے پینے کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود مقرر کی ہیں۔ چنانچہ

ارشاد ہے :

”کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند

نہیں کرتا“۔

یہ آیت بھی آدمی کے اختیار پر ہی دلالت کرتی ہے۔

یہ تمام آیات انسان کے بعد میں نے ان عالم سے کہا : قبلہ ! ان تمام قرآنی

دلائل کے بعد بھی آپ یہی کہتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور بندہ اپنے

افعال میں مختار نہیں، مجبور ہے ؟

ان عالم نے جواب دیا : تنہا اللہ تعالیٰ ہی ہے جو کائنات میں جس طرح

چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ اور دلیل کے طور پر انھوں نے یہ آیت پڑھی :

”لے دُنیا جہان کے مالک تو جسے چاہے حکومت دے اور جس

سے چاہے حکومت چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے

چاہے ذلیل کرے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔

۱۔ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِدًاۙ فَجَزَاءُہٗ جَهَنَّمُ خَالِدًاۙ فِيہَا وَغَضِبَ

اللہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہُ وَآَعَدَ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًاۙ - (سورۃ نسا - آیت ۹۳)

۲۔ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِقُوا إِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ - (سورۃ اعراف

آیت ۳۱)

بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے یہ
میں نے کہا کہ ہمارا اختلاف اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بارے میں نہیں
ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہے تو سب جن
وائس اور دیگر تمام مخلوقات مل کر بھی اس کی مشیت کے خلاف نہیں کر سکتے۔
سوال بندوں کے افعال کا ہے کہ آیا وہ ان کے افعال ہیں یا وہ اللہ کی
طرف سے ہیں ؟

اس پر ان عالم صاحب نے لکھ دیکھ کر دینی دین (تمہارا عقیدہ
تمہارے ساتھ اور میرا عقیدہ میرے ساتھ کہہ کر بحث کا دروازہ بند کر دیا ہمارے
جو علمائے کرام اپنی رائے پر قانع رہتے ہیں اور اسے بدلنے پر کبھی تیار نہیں ہوتے
عموماً ان کی آخری دلیل یہی ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ دو دن کے بعد میں اُن عالم صاحب سے پھر ملا اور میں
نے کہا:

اگر آپ کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ کرتا ہے اور بندوں
کو کچھ اختیار نہیں، تو آپ خلافت کے بارے میں بھی یہی بات کیوں نہیں کہتے
کہ اللہ سبحانہ جو چاہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے پسند کرتا ہے، بندوں
کی مرضی کو کوئی دخل نہیں۔

وہ: جی ہاں! میں یہی تو کہتا ہوں۔ اللہ نے ہی پہلے ابوبکر کو پسند
کیا، پھر عمر کو، پھر عثمان کو، پھر علی کو۔ اگر اللہ یہ چاہتا کہ علی خلیفہ اول ہوں
تو جن وائس مل کر بھی علیؑ کو خلیفہ اول ہونے سے نہیں روک سکتے تھے۔
میں: یہ کہہ کر تو آپ پھنس گئے۔

وہ: میں کیسے پھنس گیا؟

لَهُ قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكِ الْمُلْكِ تُوْقِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعِ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ يَبْدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ أَمْرٌ

آل عمران - آیت ۲۶

میں: اب یا تو آپ یہ کہیں کہ اللہ نے چار خلفائے راشدین کو تو خود پسند
کر لیا، اس کے بعد یہ کام لوگوں پر چھوڑ دیا کہ جس کو چاہیں پسند کر لیں یا پھر یہ کہیں
کہ اللہ نے لوگوں کو بالکل اختیار نہیں دیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر تا
قیام قیامت سب خلفاء کو وہی پسند کرتا ہے؟

وہ: میں دوسری شق کا قائل ہوں: قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكِ الْمُلْكِ
تُوْقِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعِ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ۔

میں: اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ اسلام میں بادشاہوں اور گجگڑاہوں
کی وجہ سے کئی واقع ہوئے وہ اللہ کی طرف سے تھے۔ کیونکہ اللہ ہی نے انھیں حکومت
عطا کر کے مسلمانوں پر تسلط کیا تھا۔

وہ: جی ہاں! یہی بات ہے۔ بعض صلحاء نے اس آیت میں اَمْرَنَا
کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی: وَلَا إِذَا آرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا
مُتْرَفِيهَا۔ مطلب یہ کہ ہم نے انھیں حاکم بنا دیا۔

میں: (تعجب سے) اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہی نے چاہا تھا کہ ابنِ مہم
علیؑ کو قتل کرے اور یزید کے ہاتھوں حسینؑ بن علیؑ کا قتل ہو۔

وہ: (فتحندانہ لہجے میں) جی ہاں! بالکل۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ رسول اللہ
نے حضرت علیؑ کو کرم اللہ وجہہ سے فرمایا تھا کہ بعد میں آنے والوں میں سب سے شقی
وہ ہوگا جو تمہارے سر کو دو پارہ کر کے چہرے کو خون سے تر کر دے گا۔ اسی طرح
رسول اللہ نے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات بتادی تھی کہ سیدنا حسینؑ کو
کر بلا میں قتل کر دیا جائے گا۔ نیز آپ نے یہ خبر بھی دی تھی کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ
مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائیں گے اس طرح ہر شے ازل سے لکھی ہوئی
ہے۔ جو کچھ مُقدّر میں لکھا ہے اس سے انسان کو مفر نہیں۔ اس طرح آپ ہار گئے
ہیں، میں نہیں۔

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ چھوٹے نہیں سہا رہے ہیں۔
کیونکہ بخیاں خویش وہ میرے مقابلے میں جیت گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان حضرت
کو کیسے سمجھاؤں کہ اللہ تعالیٰ کو کسی واقعے کا علم ہونے کے قطعاً یہ معنی نہیں کہ اللہ

نے وہ واقعہ تقدیر میں لکھ دیا ہے یا لوگوں کو اس پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ یہ نظریہ ان صاحب کے دماغ میں بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ایک اور سوال کیا کہ

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نئے اور پرانے سب بادشاہ اور وہ سب لوگ جو اسلام اور مسلمانوں سے لڑتے رہے ہیں، اللہ کے مقرر کیے ہوئے ہیں؟ وہ : اس میں کیا شک ہے۔

میں : کیا وہ فرانسیسی نوآبادیاتی حکومت جس نے تیونس، الجزائر اور مراکش پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ بھی اللہ کی طرف سے تھی؟

وہ : جی ہاں! اور جب مقررہ وقت آیا تو فرانس ان ملکوں سے نکل گیا۔ میں : بہت خوب! پھر آپ پہلے کیسے اہل سنت کے اس نظریہ کا دفاع کر رہے تھے کہ رسول اللہؐ نے وفات پائی مگر خلافت کا معاملہ شوریٰ پر چھوڑ دیا کہ مسلمان جسے چاہیں خلیفہ بنالیں؟

وہ : جی ہاں! میں اب بھی اسی پر قائم ہوں اور انشاء اللہ قائم رہوں گا۔ میں : پھر آپ ان دونوں باتوں میں کیسے تطبیق دیتے ہیں؟ ایک اللہ کا اختیار اور دوسرے شوریٰ کے ذریعے مسلمانوں کا اختیار؟

وہ : جب مسلمانوں نے ابوبکر کو پسند کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بھی انہیں پسند کر لیا۔

میں : کیا سقیفہ میں خلیفہ کو منتخب کرنے کے بارے میں کوئی وحی نازل ہوئی تھی؟

وہ : اَسْتَغْفِرُ اللہ! محمدؐ کے بعد کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ یہ شیعوں کا عقیدہ ہے۔

میں : شیعوں کو اور ان کے باطل عقائد کو چھوڑ دیے۔ آپ اپنے عقیدے کے مطابق ہمیں قائل کیجیے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کو پسند کر لیا تھا؟

وہ : اگر اللہ کا ارادہ کچھ اور ہوتا تو مسلمان اور سارا جہان مل کر بھی اللہ

کے ارادے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس وقت میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ نہ سوچتے ہیں، نہ قرآنی آیات پر غور کرتے ہیں۔ ان کی رائے کبھی بھی کسی علمی نظریے کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ اس پر مجھے ایک اور قصہ یاد آگیا :

ایک دن میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کھجور کے باغ میں ٹہل رہا تھا اور ہم قضا و قدر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں میرے سر پر ایک پکی ہوئی کھجور گری۔ میں نے اسے کھانے کے لیے گھاس پر سے اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ میرے دوست نے کہا : تم وہی چیز کھا سکتے ہو جو تمہارے نصیب میں ہو کیونکہ دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔

میں نے کہا : اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لکھی ہوئی ہے تو پھر میں اسے نہیں کھاؤں گا یہ کہہ کر میں نے اسے پھینک دیا۔

میرے دوست نے کہا : بُسحان اللہ! اگر کوئی چیز تمہارے نام پر لکھی ہوئی نہ ہو تو اللہ اسے تمہارے پیٹ میں سے بھی نکال لے گا۔

میں نے کہا : اگر یہ بات ہے تو میں اسے کھا لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے اسے دوبارہ اٹھا لیا۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کا کھانا یا نہ کھانا میرے اپنے اختیار میں ہے۔ میرا دوست مجھے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ میں اس کھجور کو چبا کر نگل گیا۔ اس وقت میرے دوست نے کہا : دیکھا یہ تمہارے نام پر ہی لکھی ہوئی تھی۔ اس طرح وہ اپنے خیال میں مجھ سے جیت گیا۔ کیونکہ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اب میں اس کھجور کو پیٹ میں سے نکال لیتا۔

جی ہاں! اہل سنت کا قضا و قدر کے بارے میں یہی عقیدہ ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ جب میں سُنی تھا تو میرا یہی عقیدہ تھا۔

قدرتی بات ہے کہ میں اس عقیدے کی وجہ سے جو فکری تضاد پر مبنی تھا پریشان رہتا تھا اور یہ بھی قدرتی بات ہے کہ اس عقیدے کی وجہ سے ہم لوگ جمود کا شکار ہیں۔ ہم اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ اللہ ہماری حالت بدل دے۔ یہ نہیں کہ ہم خود اپنی حالت بدلیں تاکہ اللہ واقعی ہماری حالت بدل دے

ہم اپنی ذمہ داری سے بھاگتے ہیں اور اپنی ذمہ داری کو اللہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ کسی چور، ڈاکو سے یا سترلی، زانی اور جوار سے یا اس مجرم سے بات کریں جس نے کسی نابالغ لڑکی کو اغوا کر کے اس سے اپنی شہوت کی آگ بجھانے کے بعد اسے قتل کر دیا ہو، تو وہ یہی کہے گا کہ ”ع“ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے“ میں کیا کر سکتا تھا، میری تقدیر میں یہی لکھا تھا“ یہ عجب خدا ہے جو پہلے تو انسان کو حکم دیتا ہے کہ اپنی بیٹی کو زندہ دفن کر دے۔ پھر پوچھتا ہے کہ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ۔

یہ بھی جان دیجیے کہ ان باتوں کی وجہ سے مغربی مفکرین اور دانشور ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہماری کم سمجھی پر ہنستے ہیں۔ اہل یورپ اسی عقیدہ تقدیر کو عروہ کی جہالت اور ان کی پس ماندگی کا خاص سبب بتلاتے ہیں۔ یہ بھی قدرتی امر ہے کہ محققین نے دریافت کیا ہے کہ اس عقیدہ کو آدمی حکمرانوں نے رواج دیا۔ وہ کہتے تھے چونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکومت عطا کی ہے اس لیے ان کی اطاعت فرض ہے۔ جس نے ان کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو ان کی مخالفت کرتا ہے وہ باغی ہے اور بغاوت کی سزا موت ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کے متعدد شواہد موجود ہیں۔

عثمان بن عفان ہی کی مثال لیں۔ جب لوگوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں، تو انھوں نے کہا کہ میں وہ قیصر نہیں اتاروں گا جو اللہ نے مجھے پہنائی ہے۔ لیکن گویا ان کی رائے کے مطابق خلافت وہ لباس تھا جو اللہ نے انھیں پہنایا تھا۔ کسی کو حق نہیں تھا کہ وہ یہ لباس ان سے چھین لے، بجز اللہ تعالیٰ کے کہ وہی یہ لباس اتار سکتا ہے یعنی ان کی نوبت کی صورت میں۔

اسی طرح معاویہ بن ابی سفیان نے اپنے ایک خطبے میں کہا تھا کہ ”میں نے تم سے اس لیے جنگ نہیں کی تھی کہ تم نماز پڑھو، روزے رکھو یا حج کرو اور زکوٰۃ دو۔ میں نے تو اس لیے جنگ کی تھی کہ تم پر حکومت

کروں۔ اللہ نے میری یہ خواہش پوری کر دی حالانکہ تمہیں یہ بات ناگوار ہے“

یہ عثمان سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ پر الزام ہے کہ اس نے مسلمانوں کے قتل میں مدد دی۔ معاویہ کا یہ خطبہ مشہور ہے۔ لہٰذا لوگوں کی مرضی کے خلاف یزید کو زبردستی ولی عہد مقرر کرتے وقت بھی معاویہ نے یہی دعویٰ کیا تھا کہ اللہ نے یزید کو میرا جانشین بنا دیا ہے۔ مؤرخین نے معاویہ کا وہ مکتوب نقل کیا ہے جو اس نے اس موقع پر چار طرف بھیجا تھا۔ والی مدینہ مروان بن حکم کو لکھا تھا کہ

”اللہ نے میری زبان سے بیعت یزید کا فیصلہ صادر کر دیا ہے“ لہٰذا

جب امام زین العابدینؑ کو زنجیروں میں باندھ کر فاسق و فاجر ابن زیاد کے سامنے لے جایا گیا تو اس نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ علی بن حسینؑ ہیں۔ اس نے کہا: کیا اللہ نے حسینؑ بن علیؑ کو ہلاک نہیں کر دیا؟ امام زین العابدینؑ کی پھوپھی جناب زینبؑ نے جواب دیا: نہیں! انھیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں نے قتل کر دیا۔ ابن زیاد نے کہا: دیکھا! اللہ نے تمہارے گھر والوں کے ساتھ کیا کیا؟ اس پر جناب زینبؑ نے کہا: میں نے تو جو کچھ دیکھا اچھا ہی دیکھا ہے۔ اللہ نے ان کے لیے قتل ہونا لکھا تھا سو وہ اپنی قبروں میں جا سوتے غنقریب اللہ تجھے اور انھیں ایک جگہ جمع کرے گا وہاں دیکھ لینا کیا ہوتا ہے تیری ماں تجھ پر روئے لے ابن مرجانہ! لہٰذا اس طرح یہ عقیدہ بنی امیہ اور ان کے حامیوں سے چل کر اُستِ اسلامیہ میں پھیل گیا۔

لہٰذا ابو العزیز اصفہانی، مقاتل الطالبیین صفحہ ۷۰۔ حافظ ابن کثیر البدایہ النہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۳۱۔ شرح نبی البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۱۶ لہٰذا ابن قتیبہ، الامارہ والسیاسہ جلد ۱ صفحہ ۱۵۱۔ لہٰذا ابو العزیز اصفہانی، مقاتل الطالبیین مقتل حسین۔

قضا و قدر کے بارے میں شیعہ عقیدہ

جیسے ہی شیعہ علماء سے میری واقفیت ہوئی اور میں نے ان کی کتابیں پڑھیں، قضا و قدر کے بارے میں ایک بالکل نیا علم مجھ پر منکشف ہو گیا۔ ایک مرتبہ کسی نے امام علی علیہ السلام سے قضا و قدر کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ نے غیر مبہم، صاف اور جامع الفاظ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

”افسوس! شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ قضا و قدر نے لازمی اور حتمی فیصلہ کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر جزا و سزا کا سوال ہی نہ ہوتا اور نہ وعدہ و وعید کا کچھ مطلب ہوتا۔ اللہ نے اپنے بندوں کو جن کاموں کا حکم دیا ہے، ان کا اختیار بھی دیا ہے اور جن کاموں سے منع کیا ہے، ان کا نقصان بھی بتلادیا ہے اللہ نے انسان کو تھوڑے سے کام کا مکلف ٹھہرایا ہے اور کوئی مشکل کام نہیں بتلایا۔ پھر یہ کہ تھوڑے کام پر بہت زیادہ اجر کا وعدہ کیا ہے۔ نہ کوئی اللہ کی نافرمانی پر مجبور ہے اور نہ کسی پر اس کی اطاعت کے لیے زبردستی ہے۔ اس نے انبیاء کو کھیل کے طور پر نہیں بھیجا اور کتابوں کو فضول نہیں اتارا۔ اس نے آسمانوں کو، زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ یہ تو کافروں کا گمان ہے۔ ان کافروں کی تودوخ میں شامت آجائے گی۔“

یہ بیان کتنا واضح اور کتنا غیر مبہم ہے۔ میں نے اس موضوع پر اس سے جامع وقاطع بیان اور حقیقت کے اظہار میں اس سے بہتر دلیل نہیں دیکھی۔ اللہ

لے جیسے آیت اللہ سید محمد باقر صدر جن سے میں نے خوب استفادہ کیا۔ آیت اللہ سید ابوالقاسم خوئی،

علامہ محمد علی طباطبائی اور سید حکیم وغیرہ۔

۱۵ شیخ محمد عبیدہ، شرح بیع البلاغہ جلد ۴ صفحہ ۶۷۳۔

نے ہمیں حکم دیا ہے لیکن اسے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار بھی دیا ہے۔ یہی مطلب ہے اس کا کہ اللہ نے اپنے بندوں کو جن کاموں کا حکم دیا ہے ان کا اختیار بھی دیا ہے۔ اسی طرح جن کاموں سے اللہ سبحانہ نے منع کیا ہے ان کے بارے میں تنبیہ بھی کر دی ہے کہ اس قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں وہ سزا کا مستحق ہوگا۔

امام علی علیہ السلام نے اس مسئلہ کی یہ کہہ کر مزید توضیح فرمادی ہے کہ نہ کوئی اللہ کی نافرمانی پر مجبور ہے اور نہ کسی پر اس کی اطاعت کے لیے زبردستی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ اپنے بندوں کو کسی کام پر مجبور کرنا چاہتا تو اس سے کون جیت سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کو اطاعت اور نافرمانی کی طاقت اور اختیار دے دیا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ۔

آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے آچکا ہے اب جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔

(سورۃ کہف - آیت ۲۹)

اس کے بعد امام انسانی ضمیر کو مخاطب کرتے ہیں تاکہ بات دل کی گہرائی تک اتر جائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

”انسان اپنے افعال میں مجبور ہوتا تو انبیاء کا بھیجا جانا اور کتابوں کا نازل کیا جانا محض ایک مذاق ہوتا، جس سے اللہ جلّ شانہ، پاک ہے، کیونکہ انبیاء کا آنا اور کتابوں کا نازل ہونا محض لوگوں کی اصلاح، ان کی روحانی بیماریوں کے علاج اور کایا۔ زندگی گزارنے کے بہترین طریقے کی وضاحت کے لیے ہے۔“

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ۔

بیشک یہ قرآن ایسے طریقے کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا

ہارمون، زندہ خلیے اور سیال مادے بناتی ہیں اور ساتھ ہی جسم کی عجب متوازن طریقے سے تعمیر کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ انسان کو احساس بھی نہیں ہونے پاتا کہ عنایات ربانی ہر لحظہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس کی زندگی میں بھی بلکہ مرنے کے بعد بھی۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى أَلَمْ يَكُنْ نَطْفَةً مِنْ مَنًى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُخَيِّقَ الْمَوْتَىٰ

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا یہ پہلے ایک قطرہ منی نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا۔ پھر وہ خون کا لو تھڑا ہو گیا۔ پھر اللہ نے اسے بنایا اور درست کیا۔ پھر اس کی دو قسمیں کر دیں مرد و عورت۔ تو کیا اللہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے۔ (سورۃ قیامت - آیات ۳۶ تا ۴۰)

سچ کہا تو نے اے ہمارے پانہار! تو نے ہی ہمیں پیدا کیا اور ہمارے اعضاء کو درست کیا۔ تو اسی موت دے گا اور تو ہی پھر زندہ کرے گا۔ پھٹکار ان پر جو تیری مخالفت کرتے ہیں اور تجھ سے دُوری اختیار کرتے ہیں، انھوں نے تجھے نہیں پہچانا۔ ہم اس بحث کو امام علی رضاؑ کے ایک قول پر ختم کرتے ہیں۔ مامون الرشید کے عہد میں جب کہ ابھی آپ کی عمر پورے چودہ سال کی بھی نہیں تھی کہ آپ کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم تسلیم کر لیا گیا تھا۔

ایک دفعہ کسی شخص نے آپ سے آپ کے دادا امام جعفر صادقؑ کے اس قول کے معنی پوچھے کہ لَا جَبَدَ وَلَا تَقْوِيصَ وَلَكِنَّ أَمْرًا بَيْنَ الْأَمْدَيْنِ تو آپ نے فرمایا: جو شخص یہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ کرتا ہے پھر اللہ ان افعال پر ہمیں عذاب بھی دیتا ہے، وہ خبر کا قائل ہے۔ اور جو شخص

یہ کہتا ہے کہ اللہ نے پیدا کرنے اور رزق دینے کا کام اماموں کے سپرد کر دیا ہے، وہ تقویٰ کا قائل ہے۔ جو شخص خبر کا قائل ہے وہ کافر ہے اور جو تقویٰ کا قائل ہے، وہ مُشرک ہے۔

أَلَا أَمْرٌ بَيْنَ الْأَمْرَيْنِ کے معنی ہیں ان افعال کو بجا لانا جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان افعال سے بچنا جن سے اس نے منع کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ قدرت بخش ہے کہ وہ بُرائی کرے یا نہ کرے ساتھ ہی اسے بُرائی سے منع کیا ہے۔ اسی طرح اسے یہ بھی قدرت بخش ہے کہ وہ نیکی کا کام کرے یا نہ کرے۔ لیکن اسے نیکی کے کام کرنے کا حکم دیا ہے۔

جان عزیز کی قسم! قضا و قدر کے بارے میں امام ثامن کا یہ بیان کافی وشافی ہے، جس کو ہر شخص تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سمجھ سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا ہے، جب آپ نے ائمہ کے بارے میں کہا:

”ان سے آگے نہ بڑھنا اور ان سے پیچھے نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان کو سکھانے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں“

قضا و قدر کی بحث کے ضمن میں خلافت پر تبصرہ

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اور بندوں کے اعمال اللہ چلاتا ہے اور بندوں کو اس ضمن میں کوئی اختیار نہیں۔ لیکن خلافت کے معاملے میں وہ کہتے ہیں کہ اسے رسول اللہؐ نے سُورِیٰ پر چھوڑ دیا تھا کہ لوگ جس کو پسند

(سورۃ بنی اسرائیل - آیت ۹)

ہے۔

امام اپنی بات کو یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ

”عقیدہ جبر کے یہ معنی ہیں کہ زمین و آسمان اور ان کے دریا

جو کچھ ہے اس کو بے مقصد پیدا کیا گیا ہے حالانکہ ایسا کہنا کفر ہے

جس پر اللہ تعالیٰ نے عذاب جہنم کی دھمکی دی ہے“

جب ہم قضا و قدر کے بارے میں شدید نظریے کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو

اسے مناسب اور معقول پاتے ہیں جب کہ ان کے مقابل میں ایک گروہ نے تفریط

سے کام لیا اور وہ جبر کا قائل ہو گیا، دوسرے نے افراط سے کام لیا اور وہ تفویض کا

قائل ہو گیا۔ پھر عقائد کی درستگی کے لیے ائمہ آتے تو انھوں نے ان دونوں فریقوں کو

حق کا راستہ دکھایا اور کہا کہ

لَا جَبَرَ وَلَا تَفْوِیْضَ وَلَٰكِنْ أَمْرٌ بَيْنَ الْأَمْرَيْنِ

کام میں نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ حقیقت ان دونوں کے

درمیان ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے اس بات کو ایک ایسی سادہ مثال سے سمجھایا ہے

جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جو ہر شخص کی عقل کے مطابق ہے۔ کسی نے آپ

سے پوچھا کہ آپ کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ ”نہ جبر نہ تفویض بلکہ ان دونوں

کے درمیان ایک چیز ہے؟ آپ نے اس کے جواب میں کہا: تمھارے زمین پر چلنے

اور زمین پر گرنے میں فرق ہے۔ مطلب یہ تھا کہ زمین پر ہم اپنے اختیار سے

چلتے ہیں لیکن جب ہم گرتے ہیں تو یہ گرنا ہمارے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا

کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی گرنا نہیں چاہتا۔ کون چاہے گا کہ گرے تاکہ اس کی کوئی

بڑی پسلی ٹوٹ جائے اور وہ معذور ہو جائے؟

اس لیے قضا و قدر جبر و تفویض کے درمیان ایک چیز ہے۔ یعنی کچھ

کام ایسے ہیں جو ہم اپنے ارادے اور اختیار سے کرتے ہیں، اور کچھ کام ایسے ہیں

جن پر ہمارا بس نہیں چلتا اور اگر ہم ان کو روکنا بھی چاہیں تو روک نہیں سکتے۔

نہیں ہوگا۔ اس طرح انسان کو بیک وقت اختیار ہے بھی اور نہیں بھی۔

(الف: جن کاموں کا انسان کو اختیار ہے وہ ان کو سوچ سمجھ کر کرتا ہے

کیونکہ اسے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا وہ اس کام کو کرے یا نہ کرے۔ اسی کی طرف

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے:

وَلَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۚ قَالَ لَهَا فَجُورَهَا وَ

تَقْوَاهَا ۚ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۚ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا

قسم ہے جان کی اور جس نے اسے درست کیا، پھر نیکی اور

بدی کی دونوں راہیں اسے بتا دیں۔ وہ یقیناً بامراد ہو گیا جس

نے اپنی جان کو پاک کر لیا۔ اور وہ یقیناً نامراد ہوا جس نے اسے

گناہ کر کے دبا دیا۔ (سورۃ شمس - آیت ۱۰ تا ۱۴)

نفس کو پاک کرنا یا نہ کرنا نتیجہ ہے اس کا کہ انسانی ضمیر کو اختیار حاصل

ہے۔ اسی طرح کامرانی اور نامرادی منصفانہ نتیجہ ہے اختیار کے استعمال کا۔

ب: جن کاموں کا انسانوں کو اختیار نہیں وہ، وہ قوانین فطرت ہیں جو

کلی طور پر اللہ کی مشیت کے تابع ہیں۔ مثلاً مرد یا عورت ہونا انسان کے اپنے

اختیار میں نہیں۔ نہ اس کا رنگ رُوپ اس کے اپنے اختیار میں ہے، نہ اس

کے بس میں ہے کہ اس کے ماں باپ کون ہوں، وہ غریب گھرانے میں پیدا ہو یا

خوشحال گھرانے میں۔ نہ اس کا اپنے قد و قامت پر بس ہے نہ اپنی شکل و صورت

پر اختیار ہے۔

انسان متعدد زبردست عوامل کے تابع ہے جیسے موروثی امراض، یا طبعی

قوانین جو اس کے فائدے کے لیے کام کرتے ہیں اور اسے ان کے سلسلے میں کوئی

مشقت برداشت نہیں کرنی پڑتی۔ چنانچہ انسان جب تھک جاتا ہے تو اسے

نیند آ جاتی ہے اور وہ سو جاتا ہے اور جب آرام کر چکتا ہے تو جاگ جاتا ہے جب

ٹھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتا ہے اور جب پیاس لگتی ہے تو پانی پیتا ہے۔ جب

خوش ہوتا ہے کھکھلا اٹھتا ہے، ہنستا ہے اور جب غمگین ہوتا ہے، پژمردہ ہو جاتا

ہے اور تپتا ہے۔ اس کے جسم کے اندر فیکٹریاں اور ورکشاپیں کام کر رہی ہیں جو

کریں اسے خلیفہ بنالیں۔
 اس کے بالکل برعکس، اگرچہ شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے
 سب اعمال کا اختیار ہے اور اللہ کے بندے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں مگر خلافت
 کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہاں بندوں کو پسند کا کوئی حق نہیں۔
 پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل سنت کے نقطہ نظر میں بھی تضاد ہے
 اور اہل تشیع کے نقطہ نظر میں بھی تضاد ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔
 جب اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کے اعمال چلاتا ہے تو ان
 کا یہ قول فی الواقع جو کچھ ہوتا ہے اس سے متضاد ہے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق
 اگرچہ اصل اختیار اللہ کو ہے لیکن ظاہری طور پر کچھ اختیار بندوں کو بھی ہے چنانچہ
 بروز سقیفہ بظاہر تو ابوبکر کو عمر اور دوسرے بعض صحابہ نے منتخب کیا تھا، لیکن
 درحقیقت وہ اللہ کے حکم کو عملی جامہ پہنا رہے تھے اور ان کی حیثیت اہل سنت
 کے خیال کے مطابق محض ایک واسطے کی تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔
 اس کے برخلاف شیعہ جب یہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے اپنے بندوں کو
 ان کے افعال کا اختیار دیا ہے تو ان کے اس قول میں اور اس قول میں کہ خلافت
 کے معاملے کا اختیار صرف اللہ کو ہے، کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ کیونکہ نبوت کی طرح
 خلافت بھی بندوں کا عمل نہیں اور نہ اس کو طے کرنا ان کے سپرد ہے جس طرح
 اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو انسانوں میں سے پسند کر کے مبعوث فرماتا ہے، بالکل
 یہی صورت خلیفہ رسول کی ہے۔ لوگوں کو اختیار ہے کہ وہ اللہ کے حکم کی تعمیل کریں
 یا اس کی نافرمانی کریں۔ خود انبیاء کی زندگی میں ہمیشہ ایسے ہی ہوتا رہا ہے۔
 اللہ کی پسند کے بارے میں بھی بندوں کو آزادی ہے۔ نیک اور مومن
 اللہ کی پسند کو قبول کرتے ہیں اور کفرانِ نعمت کرنے والے اللہ کی پسند کو قبول
 کرنے سے انکار کرتے اور اس کے خلاف بغاوت اور سرکشی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
 فرماتا ہے :

فَمَنِ اتَّبَعَ هٰذَاى فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ وَمَنْ
 اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ

يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ اَعْمٰى
 وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اَيَاتُنَا
 فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى .

جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا اور نہ
 تکلیف میں پڑے گا اور جو کوئی میری نصیحت سے منہ موڑے گا
 اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا
 اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں
 اٹھایا میں تو آنکھوں والا تھا؟ اللہ کہے گا : یہ تو بھٹک رہا
 لیکن جیسے تیرے پاس ہماری نشانیاں پہنچی تھیں اور تو نے انہیں
 بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج ہم تجھے بھلا دیں گے۔“

(سورہ ظہر - آیات ۱۲ تا ۱۴)

پھر اہل سنت والجماعت کا نظریہ اس خاص مسئلے یعنی خلافت کے بارے
 میں دیکھیے۔ وہ کسی فریق کو بھی الزام نہیں دیتے۔ کیونکہ جو کچھ ہوا اور جتنا خون بہایا گیا
 اور جو بھی بدعنوانیاں ہوئیں سب اللہ کی طرف سے تھیں۔ ایک شخص نے جو صاحب
 علم ہونے کا مدعی تھا مجھ سے کہا تھا :

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ

اگر تیرا پروردگار نہ چاہتا تو وہ یہ سب کچھ نہ کرتے۔

لیکن شیعہ نظریہ یہ ہے کہ ہر اس شخص کو ذمہ داری اٹھانی پڑے گی جو بھی
 کجروی کا سبب بنا اور جس نے بھی اللہ کی نافرمانی کی اس کو نہ صرف اپنی غلطی کا بوجھ
 اٹھانا ہوگا بلکہ ان کی غلطیوں کا بھی جو قیامت تک اس کا اتباع کریں گے، کیونکہ
 كَلَّمَكُمْ رَاجٍ وَكَلَّمَكُمْ مِّنْ سُوْلٍ عَنْ رَّعِيَّتِهِ .



رسولؐ کے ترکہ کے بارے میں اختلاف

گزشتہ مباحث سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ خلافت کے بارے میں اہل سنت کی کیا رائے ہے، اور شیعوں کی کیا رائے ہے، اور ہر فریق کے قول کے بموجب رسول اللہؐ نے اس سلسلے میں کیا اقدام کیا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کیا رسول اللہؐ نے کوئی ایسی قابل اعتماد چیز چھوڑی ہے جس کی طرف اختلاف کی صورت میں رجوع کیا جاسکے۔ کیونکہ اختلاف کا ہونا تو فطری ہے جیسا کہ خود کتاب اللہ سے معلوم ہوتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ
وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ
إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور ان کی جو تم میں سے اولی الامر ہیں۔ اگر تم میں کسی بات پر کوئی نزاع پیدا ہو تو اس کو لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روز آخرت پر۔ یہ طریقہ اچھا ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔

جی ہاں! رسول اللہؐ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُمت کے لیے کوئی ایسی بنیاد چھوڑ جائیں جو اُمت کے لیے سہارے کا کام دے۔ رسول اللہؐ تو رحمۃ اللعالمین تھے، ان کی شدید خواہش تھی کہ اُن کی اُمت دنیا میں بہترین اُمت ہو اور آپ کے بعد اس میں اختلاف پیدا نہ ہو۔ اسی لیے صحابہ اور محدثین سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا :

میں تمھارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔
تم جب تک ان کو تمھارے رہو گے میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے
کتاب اللہ اور میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے

کبھی جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر پہنچ جائیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم میرے بعد ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہو۔

یہ صحیح حدیث ہے اور فریقین کے محدثین نے اپنی کتابوں میں تیس سے زیادہ صحابہ کے حوالے سے اسے روایت کیا ہے۔

چونکہ میری عادت ہے کہ میں شیعوں کی کتابوں اور شیعہ علماء کے اقوال سے استدلال نہیں کیا کرتا۔ اس لیے میرے لیے ضروری ہے کہ میں ان علمائے اہل سنت کے نام گنواؤں جنہوں نے اس حدیث ثقلین کی صحت کا اعتراف کیا ہے اور آپؐ اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اگرچہ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ شیعہ اقوال سے بھی استدلال کیا جائے۔ بہر حال یہ ہے مختصر فہرست ان علمائے اہل سنت کی جنہوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے :

- ۱۔ مُسْلِم بن حجاج نیشاپوری، صحیح مُسْلِم فضائل علی بن ابی طالب جلد ۲ صفحہ ۱۲۲
- ۲۔ محمد بن عیسیٰ ترمذی، جامع الترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۸
- ۳۔ احمد بن شعیب بن علی نسائی، خصائص امیر المومنین صفحہ ۲۱
- ۴۔ احمد بن محمد بن حنبل، مُسْنَد احمد جلد ۳ صفحہ ۱۷
- ۵۔ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری، المُسْتَدْرَك عَلَى الصَّحِيحَيْنِ، جلد ۳ صفحہ ۱۰۹
- ۶۔ علاء الدین علی متقی ہندی، کنز العمال من سُنَنِ الاقوال و الافعال جلد ۱ صفحہ ۱۵۴
- ۷۔ محمد بن سعد زہری بصری، الطبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۹۴
- ۸۔ عزالدین ابن اثیر جزیری، جامع الاصول جلد ۱ صفحہ ۱۸۷
- ۹۔ حافظ جلال الدین سیوطی، الجامع الصغیر جلد ۱ صفحہ ۳۵۳
- ۱۰۔ حافظ نور الدین علی بن ابی بکر شمس، مَجْمَعُ الزَّوَادِ وَمَنْعُ الْفَوَائِدِ جلد ۹ صفحہ ۱۴۳

۱۱۔ تنہائی الفتح الکبیر جلد ۱ صفحہ ۲۵۱

۱۲۔ عزالدین ابن اثیر جزری اسد الغابۃ فی معرفة الصحابة

جلد ۲ صفحہ ۱۲

۱۳۔ علی بن حسین دمشقی المعروف بر ابن عساکر تاریخ مدینۃ دمشق،

جلد ۵ صفحہ ۲۳۶

۱۴۔ اسماعیل بن عمر المعروف بر ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم

جلد ۲ صفحہ ۱۱۳

۱۵۔ منصور علی ناصف التاج الجامع للأصول جلد ۳ صفحہ ۲۰۸

ان کے علاوہ ابن حجر نے اپنی کتاب صواعق مخرقة میں اس حدیث کو بیان کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ نیز ذہبی نے بھی تنقیص میں اسے علی شرط الشیخین (بخاری و مسلم) صحیح قرار دیا ہے۔ خوارزمی حنفی اور ابن مغازی شافعی نے بھی یہ روایت بیان کی ہے۔ طبرانی نے اپنی کتاب معجم میں اسے نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں سیرت حلبیہ کے حاشیہ پر، سیرت نبویہ میں اور نیابیح المودہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

کیا اس کے بعد بھی کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ حدیث ثقلین (کتاب اللہ و عترتی اہل بیتی) سے اہل سنت واقف نہیں، یہ شیعوں کی وضع کی ہوئی، احادیث میں سے ہے۔ تعصب، تنگ نظری، فکری جمود اور جاہلانہ کٹرپن پر خدا کی مار!

آئیے ان لوگوں کو توان کے حال پر چھوڑیں جو اس حدیث کو وضعی بتلاتے ہیں اور ہم اپنی بحث ان روشن خیال لوگوں کے ساتھ جاری رکھیں جن کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے حق کی تلاش ہے۔ امید ہے کہ وہ سلامتی کا راستہ پانے میں کامیاب ہوں گے۔

صحیح بات یہ ہے کہ حدیث ثقلین جس میں رسول اللہ نے کتاب اللہ اور عترت طاہرہ سے وابستہ و پیوستہ رہنے کی وصیت کی ہے وہ اہل سنت کے نزدیک بھی صحیح حدیث ہے اور شیعوں کے یہاں تو اور بھی زیادہ تواتر اور صحت سند کے ساتھ

ائمہ طاہرین سے منقول ہے۔ پھر نہیں معلوم بعض لوگ کیوں اس حدیث میں شک پیدا کرتے اور اپنی سی پوری کوشش کرتے ہیں کہ اس کے الفاظ کو وہ کتاب اللہ و سنتی سے بدل دیں۔ اس کے باوجود کہ مفتاح کنوز السنۃ نامی کتاب کے صفحہ ۲۷۸ پر مصنف نے وصیتہ صلی اللہ علیہ وسلم بکتاب اللہ و سنتہ رسولہ کا عنوان بخاری و مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالے سے باندھا ہے لیکن اگر آپ ان چاروں کتابوں میں یہ حدیث تلاش کریں تو اس کا دور دور تک پتہ نہیں چلے گا۔ بخاری میں ایک عنوان البتہ ہے کتاب الاغتصام بالکتاب والسنۃ لیکن اس عنوان کے تحت بھی کتاب میں اس حدیث کا وجود نہیں۔

زیادہ سے زیادہ بخاری میں ایک حدیث ملتی ہے کہ طلحہ بن مصرف کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن ابی اؤفی (رضی اللہ عنہما) سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ وصیت فرماتی تھی، انھوں نے کہا: نہیں۔ میں نے کہا: پھر باقی سب لوگوں کو وصیت کا حکم کیوں ہے؟ عبداللہ بن ابی اؤفی نے کہا: آپ نے کتاب اللہ کے متعلق وصیت کی تھی یہ لیکن یہاں بھی اس حدیث کا وجود نہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: تَرَكْتُ فِيْكُمْ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّتِيْ .

میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں: ایک کتاب اللہ، دوسرے میری سنت۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ کسی کتاب میں یہ حدیث موجود بھی ہے جب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اجماع حدیث کے دوسرے الفاظ پر ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا۔ علاوہ ازیں اگر ہم کتاب اللہ و سنتی والی حدیث پر ذرا غور کریں تو مختلف وجوہ سے یہ حدیث واقعات کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی، نہ عقلاً نہ نقلًا:

۱۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۳۷۔

۲۔ صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۱۶۸۔

پہلی وجہ : مؤرخین اور محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کی کتابت سے منع فرمایا تھا۔ آپ کے زمانے میں کسی کو سنت نبوی کو مدون کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے یہ بات دل کو نہیں لگتی کہ آپ نے تَرَكْتُ فِيْكُمْ كِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّتِيْ فرمایا ہوگا۔ اس کے برخلاف جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے وہ لکھی ہوئی موجود تھی۔ کتابان وحی اس کے لکھنے پر مامور تھے نیز اسے صحابہ یاد کرتے تھے، وہ سنیوں میں محفوظ تھی اس لیے ہر صحابی کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ کتاب اللہ سے رجوع کر سکے، خواہ وہ حافظ قرآن ہو یا نہ ہو۔ جہاں تک سنت نبوی کا تعلق ہے وہ آپ کے زمانے میں لکھی ہوئی نہیں تھی، نہ آپ کے زمانے میں کوئی احادیث کا مجموعہ تحریری شکل میں موجود تھا، جیسا کہ معلوم ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ سنت نبوی میں آنحضرت کے اقوال، افعال اور وہ تمام امور شامل ہیں جن کی آپ نے علماً تصویب کی ہو یعنی صحابہ کو کرتے دیکھ کر منع نہ کیا ہو۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ صحابہ کو خاص طور پر سنت نبوی سکھانے کے لیے کبھی جمع نہیں کیا کرتے تھے بلکہ مختلف موقعوں کی مناسبت سے گفتگو فرماتے رہتے تھے۔ ان موقعوں پر کچھ اصحاب موجود ہوتے تھے اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس وقت آپ کے ساتھ صرف ایک ہی صحابی ہوں۔ تو ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما دیتے کہ میں تمہارے درمیان اپنی سنت چھوڑ رہا ہوں۔

دوسری وجہ : جب وفات سے تین دن قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں اضافہ ہو گیا اور تکلیف شدید ہو گئی تو آپ نے مؤخروں سے فرمایا کہ شانے کی بڑی اور دوات لے آؤ میں کچھ لکھ دوں تاکہ تم پھر کبھی گمراہ نہ ہو۔ لیکن عمر بن خطاب نے کہا : حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ (ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے) اگر اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما چکے ہوتے کہ تَرَكْتُ فِيْكُمْ كِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّتِيْ، تو اس صورت میں عمر بن خطاب کے لیے یہ کہنا کسی طرح جائز نہیں تھا کیونکہ اس

کے معنی یہ ہوتے کہ وہ اور دوسرے صحابہ جنہوں نے ان کی تائید کی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید کر رہے ہیں جب کہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید کرنے والا بلاشبہ کافر ہے۔ میرے خیال میں اہل سنت والجماعت کو یہ بات کبھی بھی پسند نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ یہ بھی اضافہ کر لیجیے کہ عمر بن خطاب نے خود احادیث بیان کرنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔

اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حدیث اہل بیت کے کسی مخالف کی گھڑی ہوئی ہے اور غالباً اہل بیت کو خلافت سے محروم کرنے کے بعد گھڑی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے یہ حدیث وضع کی ہے وہ خود حیران تھا کہ کیا بات ہے کتاب اللہ سے تو لوگ تمسک کرتے ہیں مگر عثرت کو چھوڑ کر دوسروں کی پیروی کرنے لگے ہیں، اس لیے اس نے سوچا کہ وہ یہ حدیث گھڑ کر ان لوگوں کی دل کے لیے ایک دھجواڑ ہٹا کر دے تاکہ صحابہ پر یہ اعتراض نہ کیا جاسکے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل کیوں نہیں کیا اور اس کے خلاف کیوں کیا۔

تیسری وجہ : ہمیں معلوم ہے کہ اپنی خلافت کے اوائل میں ابوبکر کو جس مسئلے سے سب سے پہلے دوچار ہونا پڑا وہ ان کا یہ فیصلہ تھا کہ مانعین زکات سے جنگ کی جائے۔ عمر بن خطاب نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور دلیل کے طور پر کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

جو توحید و رسالت کی گواہی دے اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کہے اس کی جان اور اس کا مال میری طرف سے محفوظ ہے، بجز

اس کے کہ کسی حق کی وجہ سے ہو اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کوئی معلوم شے ہوتی تو ابوبکر اس سے ناواقف نہیں

ہو سکتے تھے۔ ان کو تو سب سے پہلے اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔

بعد میں عمر اس حدیث کی اس تاویل سے مطمئن ہو گئے جو ابوبکر نے کی۔

اور ابوبکر کی یہ بات تسلیم کر لی کہ زکات مال کا حق ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ فعلی

لے احادیث کی گھڑنت کے بارے میں علامہ مرتضیٰ عسکری کی کتاب "ایضاح فی امور اہلبیت کا کردار" دیکھیے !

سُنّت جس کی تاویل ممکن نہیں دانستہ یا نادانستہ ان لوگوں نے نظر انداز کر دی۔ یہ ثعلبہ کا قصہ ہے، جس نے رسول اللہؐ کو زکات ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بارے میں قرآن کی ایک آیت بھی نازل ہوئی تھی لیکن رسول اللہؐ نے اس سے جنگ نہیں کی اور نہ اسے زکات ادا کرنے پر مجبور کیا۔ کیا ابو بکر اور عمرؓ کو اُسامہ بن زید کا قصہ بھی معلوم نہیں تھا؟ اُسامہ کو رسول اللہؐ نے ایک سریت پر بھیجا تھا، جس میں دشمن کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد دشمن کا ایک آدمی اُسامہ کو ملا جس نے مسلمانوں کو دیکھتے ہی کہا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ لیکن اُسامہ نے اسے قتل کر دیا۔ جب یہ بات رسول اللہؐ کو معلوم ہوئی تو آپؐ نے اُسامہ سے کہا:

کیا تم نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہنے کے بعد بھی اسے قتل کر دیا؟
اُسامہ کہتے ہیں کہ

میں نے عرض کیا: اُس نے تو اپنی جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا۔
لیکن رسول اللہؐ بار بار وہی بات دہراتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! میں آج ہی اسلام لایا ہوتا۔
ان تمام باتوں کے پیش نظر ہمارے لیے کتاب اللہ و سنتی والی حدیث پر یقین کرنا ممکن نہیں ہے۔ جب صحابہ ہی کو سنت نبویؐ کا علم نہیں تھا تو بعد میں آنے والوں کا تو ذکر ہی کیا؟ اور ان لوگوں کے متعلق کیا کہا جائے جو مدینے سے دور رہتے تھے۔

چوتھی وجہ: ہمیں معلوم ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صحابہ کے بہت سے اعمال سنتِ رسولؐ کے منافی تھے۔ لہذا ہمارے سامنے اب دوسری صورتیں ہیں: یا تو کہیں کہ صحابہ سنتِ رسولؐ سے ناواقف تھے، یا پھر یہ کہیں کہ وہ عمداً سنتِ رسولؐ کو چھوڑ کر اپنے اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ اگر ہم دوسری صورت کے قائل ہو جائیں تو وہ اس آیت کا مصداق ہو جائیں گے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَ

رَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ
وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا۔

کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا فیصلہ کر دیں تو وہ یہ کہیں کہ انھیں اپنے کام میں کچھ اختیار ہے۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی تو وہ صریحاً گمراہ ہو گیا۔

(سورہ احزاب - آیت ۳۶)

اور اگر ہم یہ کہیں کہ صحابہ سنتِ رسولؐ سے ناواقف تھے، تو ایسی حالت میں رسول اللہؐ یہ کیسے فرما سکتے تھے کہ میں تمہارے درمیان اپنی سنت چھوڑ رہا ہوں جب کہ آپ کو معلوم تھا کہ آپ کے اصحاب اور مقربین سنت کا پورا علم نہیں رکھتے بعد میں آنے والوں کا تو ذکر کیا جنھوں نے آپ کو دیکھا تک نہیں۔ ایسی حالت میں تو آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ صحابہ کو احادیث لکھنے کا حکم دیتے تاکہ یہ مجموعہ احادیث مسلمانوں کے لیے قرآن کے بعد مرجع ثانی کا کام دیتا۔

رہا یہ کہنا کہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں قرآن و سنت غلط ملط نہ ہو جائیں تو اس کا ثبوت ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ یہ ممکن تھا کہ وحی ایک خاص رجسٹر میں جمع کی جاتی اور سنت ایک دوسرے رجسٹر میں۔ اس طرح دو الگ الگ کتابیں تیار ہو جائیں، جیسا کہ ہمارے یہاں آج کل قاعدہ ہے، اس صورت میں ضرور یہ کہنا صحیح ہوتا کہ میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کو اپنی سنت کو چھوڑ رہا ہوں۔

پانچویں وجہ: یہ تو معلوم ہے کہ سنت کی تدوین عباسی دور میں ہوئی اس سے پہلے نہیں۔ حدیث کی جو پہلی کتاب لکھی گئی، وہ مؤطاً امام مالکؒ ہے یہ فاجعہ کربلا اور واقعہ حرہ کے بعد کی بات ہے۔ واقعہ حرہ میں تین دن تک مدینہ منورہ میں فوجیوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ جو جی چاہے کریں۔ اس سانحے میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد شہید ہوئی۔ ان حادثات کے بعد ان راویوں کا کیسے اعتبار کیا جاسکتا ہے جنھوں نے دنیا کمانے کی غرض سے حکام وقت کا قرب حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اضطراب اور تناقض پیدا ہوا اور اُمت مسلمہ

فروق میں بٹ گئی۔ چنانچہ ایک فرقے کے نزدیک جو بات ثابت شدہ تھی وہ دوسرے کے نزدیک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی اور جسے ایک فرقے نے صحیح قرار دیا دوسرے نے اس کی تکذیب کی۔

ان حالات میں ہم کیسے مان لیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو کہ تَرَكْتُ فِيكُمْ كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّتِي۔ رسول اللہ ﷺ کو خوب معلوم تھا کہ منافقین اور مُخْرِفِین آپ سے جھوٹی باتیں منسوب کریں گے۔ آپ نے خود فرمایا تھا:

مجھ سے بہت سی جھوٹی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ پس جو شخص مجھ سے جان بوجھ کر جھوٹ منسوب کرے، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ لہ

جب آپ کی زندگی ہی میں آپ سے بکثرت جھوٹی باتیں منسوب کی گئی ہوں، تو آپ کیسے اپنی اُمت کو اپنی سنت کے اتباع کا حکم دے سکتے تھے جبکہ آپ کے بعد صحیح و غلط میں تمیز دشوار ہو گئی۔

پھر اہل سنت کی صحاح میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد ثقلین یعنی دو جانشین یا دو چیزیں چھوڑیں۔ اہل سنت کبھی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے کِتَابَ اللَّهِ وَ سُنَّتَهُ رَسُولِهِ فرمایا اور کبھی کہتے ہیں کہ آپ نے عَلَیْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّتِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ مِنْ بَعْدِي فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں، سنت خلفاء کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اس طرح شریعت کے ماخذ دو کے بجائے تین ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ سب اس حدیث ثقلین کے منافی ہے جس پر اہل سنت اور شیعوں کا اتفاق ہے۔ اس حدیث میں کِتَابَ اللَّهِ وَ عَثَرَتِي کے الفاظ ہیں اور اس کے لیے ہم نے بیس سے زیادہ اہل سنت کی معتبر کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ شیعہ ماخذ اس کے علاوہ ہیں جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا۔

ساتویں وجہ: رسول اللہ ﷺ کو بخوبی علم تھا کہ آپ کے اصحاب۔ گو

قرآن ان کی زبان میں اور جیسا کہ مشہور ہے، ان کے لہجے میں نازل ہوا ہے۔ بہت سے مقامات کی تفسیر اور تاویل سے ناواقف تھے۔ پھر یہ کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ بعد میں آنے والے، خصوصاً وہ رومی، ایرانی، حبشی اور دوسرے عجیب جن کی زبان عربی نہیں تھی اور جو نہ عربی سمجھتے تھے اور نہ بولتے تھے، قرآن کو کما حقہ سمجھ پائیں گے۔ روایت ہے کہ جب ابو بکر سے اللہ تعالیٰ کے قول وَ فَارَكْهُنَّ وَ آبَا کے معنی پوچھے گئے تو انھوں نے کہا: میری کیا مجال کہ میں کتاب اللہ کے بارے میں کوئی ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہ ہو۔

اسی طرح عمر بن خطاب کو بھی اس کے معنی معلوم نہیں تھے۔ انس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک دفعہ عمر بن خطاب نے منبر پر یہ آیت پڑھی:

فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَ عَيْنًا وَ قُضْبًا وَ زَيْتُونًا وَ نَخْلًا وَ حَدَائِقَ غُلْبًا وَ فَارَكْهُنَّ وَ آبَا۔

اس کے بعد کہنا لگے: چھوڑو، ایسی ٹوہ محض تکلف ہے۔ اگر تمہیں ابُ کے معنی معلوم نہیں تو نہ ہوں، اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ کتاب اللہ میں جو واضح ہدایت ہے اس پر عمل کرو اور جو سمجھ میں نہ آئے اسے اس کے رب پر چھوڑ دو۔

جو کچھ یہاں کتاب اللہ کی تفسیر کے بارے میں کہا گیا ہے، اس کا اطلاق جو کچھ نبوی کی تفسیر پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ کتنی ہی احادیث ہیں جن کے بارے میں صحابہ میں، مختلف فرقوں میں اور شیعوں اور سنتیوں میں اختلاف رہا ہے کبھی اس بارے میں کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف اور کبھی اس بارے میں کہ حدیث کا مفہوم کیا ہے۔ وضاحت کے لیے میں اس اختلاف کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

۱۔ قسطلانی، ارشاد انسانی جلد ۱۰ صفحہ ۲۹۸۔ ابن حجر، فتح الباری فی شرح صحیح البخاری جلد ۱۳ صفحہ ۲۳۔
۲۔ تفسیر طبری جلد ۳ صفحہ ۳۸۔ کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۲۹۶۔ مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱۴۳۔ تاریخ بغداد جلد ۱۱ صفحہ ۲۹۸۔ تفسیر کشاف جلد ۳ صفحہ ۲۵۳۔ تفسیر خازن جلد ۴ صفحہ ۳۷۴۔ ابن تیمیہ، مقدمہ صول تفسیر صفحہ ۳۰۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم جلد ۴ صفحہ ۴۷۳۔

۱۔ حدیث کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں صحابہ میں اختلاف

یہ صورت خلافت ابوبکر کے ابتدائی ایام میں اس وقت پیش آئی جب فاطمہ بنت رسولؐ ابوبکر کے پاس آئیں اور فدک کی واکزاری کا مطالبہ کیا۔ جناب فاطمہؓ کا دعویٰ تھا کہ فدک ان کے والد نے اپنی زندگی میں انھیں عطا کر دیا تھا، لیکن ان کے والد کی وفات کے بعد ان سے لے لیا گیا۔ ابوبکر نے اس دعوے کو غلط قرار دیا اور اس کی تردید کی کہ رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں فدک جناب فاطمہؓ کو دے دیا تھا۔ جناب فاطمہؓ نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ان کے والد کی میراث انھیں دی جائے۔ لیکن ابوبکر نے کہا کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا ہے :
نَحْنُ مَعَشَرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَاهُ مُصَدَّقَةً
ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ

ہوتا ہے۔

جناب فاطمہؓ نے اس حدیث کو من گھڑت قرار دیا اور اس کے مقابلے میں قرآنی آیات پیش کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف اور جھگڑا بڑھ گیا۔ جناب فاطمہؓ مرتے دم تک ابوبکر سے ناراض رہیں، ان سے بات نہیں کرتی تھیں۔ جیسا کہ خود صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں آیا ہے۔

ایک اور مثال ام المومنین عائشہ اور ابوہریرہ کے اختلاف کی ہے :

اگر کوئی شخص رمضان میں صبح کو ناپاک اٹھے تو عائشہ کہتی تھیں کہ اس کا روزہ درست ہے۔ ابوہریرہ کی رائے تھی کہ وہ افطار کرے۔ امام مالک نے مؤطا میں اور بخاری نے اپنی صحیح میں ام المومنین عائشہ اور ام المومنین ام سلمہ سے روایت کی ہے، وہ دونوں کہتی ہیں کہ رمضان میں رسول اللہؐ صبح کو جنب اٹھے تھے ہم بستر کی وجہ سے، احتلام کی وجہ سے نہیں، پھر روزہ رکھ لیتے تھے۔ ابوہریرہ بن عبد الرحمن کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ جن دنوں مروان بن حکم

مدینہ کا امیر تھا، ایک دن میں اور میرے والد اس کے پاس تھے۔ اس کے سامنے ذکر آیا کہ ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جو شخص صبح کو جنب اٹھے وہ اس دن افطار کرے۔

مروان کہنے لگا : عبد الرحمن ! میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ تم ام المومنین عائشہ اور ام المومنین ام سلمہ کے پاس جا کر ذرا اس بارے میں دریافت تو کرو۔ اس پر عبد الرحمن اور میں حضرت عائشہ کے پاس گئے۔ وہاں جا کر عبد الرحمن نے سلام کیا اور کہا : ام المومنین ! ہم مروان بن حکم کے پاس تھے، وہاں ذکر آیا کہ ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جو صبح کو جنب ہو وہ اس دن افطار کرے، روزہ نہ رکھے۔ عائشہ نے کہا : اس طرح نہیں جیسے ابوہریرہ کہتے ہیں۔ عبد الرحمن ! کیا تمہیں رسول اللہؐ کا طریقہ پسند نہیں؟ عبد الرحمن نے کہا : بخدا یہ بات نہیں۔ عائشہ نے کہا : اگر ایسا ہے تو میں گواہی دیتی ہوں کہ رسول اللہؐ احتلام کے بغیر ہم بستر سے صبح کو جنب ہوتے تھے اور پھر اس دن کا روزہ رکھ لیتے تھے۔ ابوبکر بن عبد الرحمن کہتے ہیں کہ ہم وہاں سے نکل کر حضرت ام سلمہ کے یہاں گئے۔ ہم نے ان سے پوچھا تو انھوں نے بھی وہی کہا جو عائشہ نے کہا تھا۔ اس کے بعد ہم واپس مروان بن حکم کے پاس پہنچے اور جو کچھ ان دونوں نے کہا تھا وہ مروان کو بتایا۔

مروان نے کہا : ابو محمد ! دروازے پر سواری موجود ہے۔ تم فوراً سوار ہو کر ابوہریرہ کے پاس جاؤ، وہ عتیق میں اپنی زمین پر ہیں، انھیں جا کر سب بات بتاؤ۔

چنانچہ عبد الرحمن سوار ہوئے میں بھی ان کے ساتھ سوار ہوا اور ہم دونوں ابوہریرہ کے پاس پہنچے۔ عبد الرحمن نے کچھ دیر ان سے ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر اصل موضوع پر آئے۔ ابوہریرہ نے کہا : مجھے تو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں، مجھ سے تو کسی نے کہا تھا۔

دیکھیے ! ابوہریرہ جیسے صحابی جو اہل سنت کے نزدیک اسلام میں احادیث کے سب سے بڑے راوی ہیں، کیسے دینی احکام سے متعلق محض ظن و تخمین کی بنا پر

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۳۲ باب الصائم یُفِیْعُ جُنْبًا - تنویر الحواکک شرح مؤطا مالک جلد ۱

صفحہ ۲۷۲ مَا جَاءَ فِي الذِّي يُفِیْعُ جُنْبًا فِي رَمَضَانَ -

فتوے دے دیتے ہیں اور پھر اسے رسول اللہؐ سے منسوب کر دیتے ہیں حالانکہ انھیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بات انھیں کس نے بتلائی تھی۔ ایسے احکام جن کا مآخذ بھی معلوم نہیں اہل سنت ہی کو مبارک ہوں۔

ابو ہریرہ کا ایک اور قصہ

عبداللہ بن محمد کہتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا ہشام بن یوسف نے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں بتلایا عمر نے، وہ روایت کرتے ہیں زہری سے، وہ ابوسلمہ سے، وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، وہ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
”چھوٹ، یرقان اور ہامہ (ایک فرضی پرندہ جو جاہلی عربوں کے خیال کے مطابق اس وقت تک چنچتا رہتا ہے جب تک مقتول کا بدلہ نہ لے لیا جائے) کوئی چیز نہیں۔ اس پر ایک اعرابی نے کہا کہ یا رسول اللہؐ! پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اُونٹ صحرائیں خوبصورت ہرنوں کی طرح کلیلیں کرتے پھرتے ہیں پھر ان میں کوئی خارش زدہ اُونٹ آملتا ہے تو سب کو خارش ہو جاتی ہے۔ رسول اللہؐ نے کہا : یہ بتاؤ، پہلے اُونٹ کو بیماری کس نے لگائی تھی؟“

ابوسلمہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے بعد میں ابو ہریرہ کو یہ کہتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ
”بیمار کو تندرست کے پاس نہ لے جاؤ۔“

ابو ہریرہ نے پہلی حدیث کا انکار کیا تو ہم نے کہا : آپ نے نہیں کہا تھا کہ چھوٹ کوئی چیز نہیں۔ اس پر ابو ہریرہ نے حبشی زبان میں کچھ کہا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ابوسلمہ کہتے ہیں کہ اور کوئی حدیث ہم نے ابو ہریرہ کو بھولتے نہیں دیکھا۔

تو قارئین ! یہ ہے سنت رسولؐ بلکہ یوں کہیے، یہ ہیں وہ روایات جو خدا کے رسولؐ سے منسوب کی گئی ہیں۔ کبھی تو ابو ہریرہ یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے پہلے جو حدیث سنائی تھی اس کا انھیں کچھ علم نہیں، ان سے تو یہ بات کسی نے کہی تھی۔ اور کبھی جب ان کی بیان کردہ احادیث میں تناقض کی نشان دہی کی جاتی ہے تو وہ کچھ جواب نہیں دیتے بلکہ حبشی زبان میں کچھ بڑبڑا دیتے ہیں۔ معلوم نہیں اہل سنت کیسے انھیں اسلام کا سب سے بڑا راوی حدیث قرار دیتے ہیں؟

عائشہ اور ابن عمر کا اختلاف

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں اور ابن عمر اُمّ المؤمنین عائشہ کے حجرے کے ساتھ پیٹھ لگاتے بیٹھے تھے اور ہمیں ان کے سواک کرنے کی آواز آرہی تھی، اتنے میں میں نے پوچھا : اے ابو عبد الرحمن! کیا رسول اللہؐ نے رجب کے مہینے میں بھی عمرہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا : ہاں کیا ہے۔ میں نے عائشہ سے کہا : اماں جان! آپ سن رہی ہیں ابو عبد الرحمن کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا : کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا : یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے رجب میں عمرہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا : ابو عبد الرحمن کو اللہ معاف کرے۔ آپ نے رجب میں کبھی عمرہ نہیں کیا۔ اور جب بھی عمرہ کیا یہ تو ہر دفعہ آنحضرتؐ کے ساتھ تھے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ابن عمر یہ گفتگو سن رہے تھے مگر انھوں نے نہ اُمّ المؤمنین کی تصدیق کی نہ تردید اس چپکے ہو رہے۔

عائشہ اور ازواج نبی کا اختلاف

اُمّ المؤمنین عائشہ بیان کرتی ہیں کہ سہلہ بنت سہیل ابو خذیفہ کی جورو جو بنی عامر کی اولاد میں سے تھی رسول اللہؐ کے پاس آئی اور بول : یا رسول اللہؐ!

ہم (ابو حذیفہ کے غلام) سالم کو اپنا بچہ سمجھتے تھے اور یہ کہ جب میں بے لباس ہوتی تھی وہ گھر میں اندر چلا آتا تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس صرف ایک ہی گھر ہے۔ یہ سن کر رسول اللہؐ نے فرمایا: اسے دودھ پلا دو۔ تنہا نے کہا: میں اسے کیونکہ دودھ پلا سکتی ہوں، اب تو وہ جوان ہو گیا ہے اور اس کے داڑھی مونچھ ہے۔ اس پر رسول اللہؐ مسکرائے اور بولے: اسے دودھ پلاؤ، اس میں تمھارا کیا جائے گا، اگر کچھ جائے گا تو ابو حذیفہ کا جائے گا۔

اُمّ المؤمنین عائشہ اس حدیث پر عمل کیا کرتی تھیں اور جس آدمی کو چاہیں کہ ان کے پاس آیا جایا کرے تو اپنی بہن اُمّ کلثوم کو حکم کرتیں اور اپنی بھتیجیوں کو بھی کہ اس آدمی کو اپنا دودھ پلا دیں لیکن دوسری اہل بیت المؤمنین اس کا انکار کرتی تھیں کہ بڑھپن میں رضاعت کے سبب کوئی ان کا محرم بن کر ان کے پاس آجاسکتا ہے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ رسول اللہؐ نے یہ رخصت خاص تنہا بنت سہیل کو دی تھی۔ بخدا! ایسی رضاعت کے سبب کوئی ہمارا محرم نہیں بن سکتا یہ

تحقیق کرنے والا جب ایسی روایات دیکھتا ہے تو اسے یقین نہیں آتا۔ لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ایسی روایات جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت پر حرف آتا ہے حدیث کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ روایات رسول اللہؐ کو جو خصائل حسنہ کے پیکر تھے اور مکام اخلاق کی تمکین کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ ایک ایسے شخص کے رُوب میں پیش کرتی ہیں جو اخلاقی اقدار کی دھجیاں بکھیرتا ہے اور دین اسلام میں ایسی مضحکہ خیز باتیں داخل کرتا ہے کہ فرزانے تو کب دیوانے بھی بے ساختہ ہنس پڑیں۔ (غلامی رسولؐ میں، موت بھی قبول ہے کا نعرہ بلند کرنے والے مسلمان کیا ایسی کوئی حدیث قبول کر سکتے ہیں جو خدا کے عظیم نشان رسولؐ کا استخفاف کرتی ہو، عقل کی کسوٹی اور اخلاق کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو، ایمانی غیرت کے منافی ہو اور شرم و حیا کا جنازہ نکال دے۔

کیا کوئی غیرت مند مسلمان اپنی بیوی کو اس بات کی اجازت دے سکتا ہے

کہ وہ کسی جوان آدمی کو دودھ پلائے تاکہ وہ اس کی ماں بن جائے؟ لے اللہ کے رسولؐ! آپ کی ذات والا صفات ایسی بیہودہ باتوں سے بہت بلند ہے اور یہ آپ پر بہتان عظیم ہے۔ میں کیسے باور کروں کہ وہ رسولؐ جس نے مرد کے لیے نامحرم عورت کو چھونا اور اس سے ہاتھ ملانا حرام قرار دیا ہے وہ بڑھپن میں عورت کا دودھ پینا جائز قرار دے سکتا ہے۔ (العیاذ باللہ)

میں اس حدیث سازی کا مقصد تو نہیں جانتا البتہ یہ جانتا ہوں کہ بات اس حدیث کی حدود سے نکل کر آگے بڑھ گئی اور سنت جاریہ بن گئی۔ کیونکہ اُمّ المؤمنین عائشہ اس حدیث پر عمل کرتی تھیں۔ وہ جس شخص کو چاہیں کہ ان کے پاس آیا جایا کرے اسے رضاعت کے لیے اپنی بہن اُمّ کلثوم کے پاس بھیجا کرتی تھیں۔

ذوق آگہی رکھنے والوں کی معلومات کے لیے بتانا چلوں کہ لوگوں کا اُمّ المؤمنین عائشہ کا محرم بن کر ان کے پاس آنا جانا صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا تھا جب ان کی رضاعت پانچ دفعہ ہوتی ہو کیونکہ اُمّ المؤمنین ہس کی روایت ہے کہ اللہ نے دس دفعہ رضاعت والی آیت اتاری تھی، پھر یہ پانچ دفعہ رضاعت والی آیت سے منسوخ ہو گئی۔ پس یہ آیت برابر پڑھی جاتی تھی یہاں تک کہ رسول اللہؐ کے انتقال کے بعد بھی قرآن میں تھی یہ (لیکن اب قرآن میں موجود نہیں ہے)۔

۱۔ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۶۷ باب التیمم بحسب رضعات۔

۲۔ یہ قرآن جو ہمارے ہاتھوں میں ہے وہی ہے جو فاطمہ الزہراء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے۔ تیسری صدی کے شیخ صدوق علیہ الرحمہ سے لے کر پندرہویں صدی کے آیت اللہ خوی دام ظلہ العالی تک شیعہ علماء کبھی تحریف قرآن کے قائل نہیں رہے۔ ان کی کتابیں اور ان کے فتوے اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ لیکن خدا معلوم کیوں کچھ دگ مقطوع السند اخبار آحاد کے سہارے شیعہ دشمنی کی بھر اس نکلتے ہیں اور شیعوں پر یہ سنگین ثبوت لگاتے ہیں کہ ان کا قرآن چالیس پاروں کا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اگر کچھ مُرسَل، ضعیف، مقطوع السند روایتیں شیعہ کتب میں ہیں تو اس سے کہیں زیادہ روایات سُنی کتب احادیث میں بھی ہیں لیکن کیسی طرح بھی قابل اعتبار نہیں۔ مثلاً

۱۔ صحیح مسلم کتاب الرضاع جلد ۲ صفحہ ۱۱۶ - مؤطا امام مالک کتاب الرضاع جلد ۲ صفحہ ۱۱۶

● اُمّ المؤمنین ابی عائشہ آیہ رضاعت عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَّعْلُومَاتٍ (شیر خوار کو دس مرتبہ دودھ پلانا میں ہے) کو جزو قرآن بتاتی ہیں اور یہ آیت صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابی داؤد، سنن ابی مالک میں لکھی ہے۔

● عمر بن خطاب آیہ رَجُمَ (الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ فَارْجُمُوهُمَا الْبَتَّةَ) کو جزو قرآن بتاتے ہیں اور یہ آیت صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ اور ابی مالک میں لکھی ہے۔

● عمر بن خطاب کہتے ہیں کہ آیت : لَا تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ فَإِنَّهُ لَفِيكُمْ إِنْ تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ قَرَّانٌ کا جزو تھی اور ہم اسے پڑھا کرتے تھے۔ یہ آیت صحیح بخاری و مسند احمد بن حنبل میں دیکھی جاسکتی ہے۔

● سنن ابن ماجہ میں ہے کہ اُمّ المؤمنین نے کہا :

زانی اور زانیہ کو سنگسار کرنے کی آیت (آیہ رَجُمَ) نازل ہوئی تھی۔ نیزہ کہ بڑھ پن میں دس دفعہ دودھ پلانے کی آیت (وَرَضَاعُهُ الْكَبِيرُ عَشْرًا) نازل ہوئی تھی اور ایک کاغذ پر لکھی ہوتی میرے تحت کے نیچے رکھی تھی، جب رسول اللہؐ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ہم افراتفری کے عالم میں تھے تو بکری اسے کھا گئی۔

● اور صحیح مسلم میں ترقیم ہے کہ ابو موسیٰ اشعری نے بصرے میں تین سو قاریان قرآن کو خطاب کرتے ہوئے کہا :

ہم ایک سورہ پڑھا کرتے تھے جو طویل تھا اور جس کا مضمون سورہ توبہ کی طرح سنّت تھا۔ بعد میں ہم وہ سورہ بھول گئے البتہ اس کی یہ آیت میرے حافظ میں باقی ہے : لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَا يَبْتَغِي وَادِيَا ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ .

● اسی طرح ہم ایک اور سورہ بھی پڑھا کرتے تھے جو ”مَسَاجِدُ“ میں سے ایک کے مشابہ تھا۔ ہم وہ سورہ بھول گئے اور مجھے اس کی فقط یہ آیت یاد رہ گئی ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ فُتُكِبْتُمْ شَهَادَةً فِي أَعْيُنِكُمْ فَسْتَلُونَهَا عَنْهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ .

۲۔ سنت رسولؐ کے بارے میں فقہی مذاہب کا اختلاف

سنت رسولؐ کے بارے میں ابوبکر اور عمرؓ میں اختلاف تھا۔ ابو بکر کا فاطمہؓ سے اختلاف تھا۔ ابو بکر رسولؐ کا آپس میں اختلاف تھا۔ ابو ہریرہؓ کا عائشہؓ سے اختلاف تھا۔ عبد اللہ بن عمرؓ اور عائشہؓ کے مابین اختلاف تھا۔

حدیث کی معتبر کتابوں سے یہ چند نمونے ہم نے ان لوگوں کو آئینہ دکھانے کے لیے پیش کیے ہیں جو کہتے پھرتے ہیں کہ شیعوں کا موجودہ قرآن پر ایمان نہیں۔ حالانکہ قرآن یہی ہے جو دقتین کے بیچ میں ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ اور سب مسلمانوں کا اسی پر ایمان ہے۔ جو ہم پر بہتان باندھا ہے، ہم اس کا اور اپنا معاملہ اللہ کی عدالت میں پیش کرتے ہیں کہ وہ احکم الحاکمین ہے۔

ہم تو بس اتنی سی بات جانتے ہیں کہ قرآن میں تحریف نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ آخری آسمانی شریعت ہے اور خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے :
إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ . (ناشر)

۱۔ مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے بارے میں اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔ ہم نے اس قصہ کے مآخذ بیان کر دیے ہیں۔

۲۔ قصہ فدک اور حدیث نَحْنُ مَعْشَرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورِثُ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے مآخذ کا بیان بھی گزر چکا۔

۳۔ بالغ مرد کو دودھ پلانے کے قصے کی طرف اشارہ ہے جو عائشہؓ سے مروی ہے لیکن دیگر ادواج رسولؐ نے اس کے برخلاف کہا ہے۔

۴۔ ابو ہریرہؓ کی اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہؐ صبح کو جنب ہوتے تھے اور روزہ رکھ لیتے تھے۔ عائشہؓ نے ابو ہریرہؓ کی اس بات کو غلط بتلایا ہے۔

۵۔ اشارہ ہے اس روایت کی طرف کہ رسول اللہؐ نے چار عمرے کیے جن میں سے ایک رَجَب میں تھا۔ عائشہؓ نے اس کی تردید کی ہے۔

عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر کے درمیان اختلاف تھا لیہ علی بن ابی طالبؑ اور عثمان بن عفان کے درمیان اختلاف تھا لیہ جب صحابہ کے درمیان ہی اتنا اختلاف تھا لیہ تو تابعین کے درمیان تو اور بھی بڑھ گیا حتیٰ کہ فقہی مذاہب ستر سے بھی زیادہ ہو گئے۔ ابن مسعود صاحب مذہب تھے، اسی طرح ابن عمر، ابن عباس، ابن زبیر، ابن عیینہ، ابن جریج، حسن بصری، سفیان ثوری، مالک بن انس، ابو حنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل سب کے سب صاحب مذہب تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت ہیں۔ لیکن سلطنت عباسیہ نے اہل سنت کے چار مشہور مذاہب کو چھوڑ کر باقی سب کا خاتمہ کر دیا۔

اگرچہ اب فقہی مذاہب چند ہی رہ گئے ہیں، پھر بھی ان کے درمیان اکثر فقہی مسائل میں اختلاف ہے۔ اور اس کی وجہ وہی سنت رسولؐ کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک مذہب کسی مسئلے میں حکم کی بنیاد کسی حدیث پر رکھتا ہے جسے وہ اپنے زعم میں صحیح سمجھتا ہے، تو دوسرا مذہب اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہے یا کسی دوسرے مسئلے پر نص اور حدیث کی عدم موجودگی کی وجہ سے قیاس کرتا ہے۔ اسی وجہ سے، مثلاً رضاعت کے مسئلے میں بہت اختلاف ہے، کیونکہ اس بابے میں احادیث باہم متضاد ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ایک مذہب کے مطابق ایک قطرہ دودھ پینے سے بھی حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ جبکہ دوسرے مذہب کی رو سے دس یا پندرہ دفعہ دودھ پلانا ضروری ہے۔

۳۔ سنت رسولؐ کے بارے میں شیعہ سنتی اختلاف

اس مسئلے میں شیعہ سنتی اختلاف عموماً دو وجہ سے ہوتا ہے: ایک تو یہ

لہ اشارہ ہے ان کے درمیان سنت کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں اختلاف کی طرف۔ دیکھیے صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۲۹۔

لہ اشارہ ہے ان کے درمیان سنت ج کے بارے میں اختلاف کی طرف۔ دیکھیے صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۵۳۔
تہ بسم اللہ کے بابے میں، وضو کے بارے میں، مسافر کی نماز کے بارے میں اور ایسے ہی ان گنت دوسرے مسائل۔

شیعہ اس حدیث کو صحیح نہیں مانتے جس کے راوی کی عدالت پایہ اعتبار سے ساقط ہو خواہ وہ صحابی ہی کیوں نہ ہو۔ اہل سنت کے برخلاف شیعہ اس بات کے قائل نہیں کہ تمام صحابہ ثقہ اور عادل تھے۔

اس کے علاوہ شیعہ کسی ایسی حدیث کو بھی قبول نہیں کر سکتے جو ائمہ اہل بیت کی روایت سے متصادم ہو۔ وہ ائمہ اہل بیت کی روایت کو دوسروں کی روایت پر ترجیح دیتے ہیں خواہ دوسروں کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جن کی قرآن و سنت سے تائید ہوتی ہے اور جن کو ان کے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض چیزوں کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ شیعہ سنتی اختلاف کا ایک اور سبب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک حدیث کا مفہوم کچھ ہے اور شیعہ اس کے کچھ اور معنی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً وہ حدیث جس کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں یعنی:

اِخْتِلَافُ اُمَّتِي رَحْمَةٌ

اہل سنت تو اس حدیث کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ فقہی مسائل میں مذاہب اربعہ کا اختلاف مسلمانوں کے لیے رحمت ہے۔

جبکہ شیعہ کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کے پاس سفر کر کے جانا اور ایک دوسرے سے علم حاصل کرنا رحمت ہے۔ یہ تشریح امام جعفر صادقؑ کی ہے اور ہم اسے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

بعض دفعہ شیعہ سنتی اختلاف حدیث رسولؐ کے مفہوم میں نہیں ہوتا بلکہ اس بارے میں ہوتا ہے کہ جس شخص یا اشخاص کا حدیث میں ذکر ہے اس سے کون مراد ہے۔ مثلاً قول رسولؐ ہے کہ

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ مِنْ بَعْدِي

اہل سنت خلفائے راشدین سے ابوبکر، عمر، عثمان اور علی مراد لیتے ہیں، مگر شیعہ بارہ ائمہ مراد لیتے ہیں۔

اسی طرح رسول اللہؐ کا ایک اور قول ہے:

اَلْخُلَفَاءُ مِنْ بَعْدِي اثْنَى عَشَرَ كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ

”میرے بعد بارہ خلیفہ ہوں گے جو سب قریش سے ہوں گے۔“
شیعہ بارہ خلفاء سے بارہ ائمہ اہل بیت مراد لیتے ہیں جبکہ اہل سنت
والجماعت کے یہاں اس کی کوئی تشریح ہے ہی نہیں۔
کبھی شیعہ سنی اختلاف ان تاریخی واقعات کے بارے میں ہوتا ہے جن کا
تعلق رسول اللہ کی ذات سے ہے۔ جیسا کہ آپ کے یوم ولادت کے بارے میں اختلاف
ہے۔ اہل سنت ۱۲ ربیع الاول کو میلاد النبی مناتے ہیں جبکہ شیعہ اس مہینے کی
۱۷ تاریخ کو محافل میلاد منعقد کرتے ہیں۔

سنت نبوی کے بارے میں ایسا اختلاف ہونا قدرتی ہے۔ اس سے بچنا ممکن
نہیں۔ کیونکہ کوئی ایسا مرجع موجود نہیں جس کی طرف سب رجوع کر سکیں اور جس کے
حکم کو سب مانیں اور جس کی رائے کو سب قبول کریں اور جس پر سب کو اسی طرح اعتماد
ہو جیسے رسول اللہ کی زندگی میں آپ پر تھا۔

ائمہ کی زندگی میں ایسے شخص کا وجود ہر وقت ضروری ہے اور عقل بھی یہی
کہتی ہے، اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ رسول اللہ اس ضرورت کو نظر انداز کر دیتے۔
آپ کو معلوم تھا اور علامہ الغیوب نے آپ کو اطلاع دے دی تھی کہ آپ کی ائمہ آپ
کے بعد قرآن کی تاویل کرے گی۔ اس لیے آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ کوئی ایسا معلم
مقرر کریں کہ اگر ائمہ صراطِ مستقیم سے ہٹنے لگے تو وہ اس کی صیح راہ نمائی کر سکے۔ اور
آپ نے ائمہ کے لیے واقعی ایک ایسے عظیم قائد کا انتظام کر دیا تھا جس کی تعلیم و تربیت
میں آپ نے ابتدا ہی سے پوری کوشش صرف کی تھی اور جب وہ درجہ کمال کو پہنچ
گیا اور آپ سے اس کی نسبت وہ ہو گئی جو حضرت ہارونؑ کی جناب موسیٰؑ سے تھی
تو آپ نے یہ جلیل القدر کام یہ کہہ کر اس کے سپرد کر دیا کہ

أَنَا أَقَاتِلُهُمْ عَلَى تَنْزِيلِ الْقُرْآنِ وَأَنْتَ تَقَاتِلُهُمْ
عَلَى تَأْوِيلِهِ۔ لہ

”اے علی! میں تنزیلِ قرآن کی خاطر لڑتا رہا ہوں، اب تم تاویلِ قرآن کے
لیے لڑو۔“

آپ نے یہ بھی فرمایا :
أَنْتَ يَا عَلِيُّ! تُبَيِّنُ لِمَا أُحْتَفَظُ فِيهِ مِنْ بَعْدِي
عَلَى! جس بات میں میری ائمہ میں میرے بعد اختلاف ہو
تم اس بات کو واضح کر دینا۔ لہ

قرآن جو اللہ کی کتاب ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اس کی تفسیر
اور توضیح کے لیے لڑے یعنی جانفشانی کرے کیونکہ یہ ایک خاموش کتاب ہے جو خود
نہیں بولتی مگر ساتھ ہی متعدد معانی کی حامل ہے۔ اس کا ظاہر بھی ہے اور باطن
بھی۔ جب قرآن کی یہ صورت ہے تو سنت کی تشریح و توضیح تو اور بھی ضروری ہے
اور جب قرآن و سنت دونوں تشریح طلب ہوں تو رسول اللہ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ
وہ دونوں ثقلتین ایسے چھوڑیں جو خاموش اور گونگے ہوں اور جن کی حسبِ منشا
تاویل وہ لوگ کر سکیں جن کے دل میں کجی ہے اور جو فتنہ برپا کرنا اور دنیا کمانا چاہتے
ہیں اور جن کے متعلق معلوم ہے کہ بعد میں آنے والوں کے لیے گراہی کا سبب بنیں گے
کیونکہ لوگ ان کے ساتھ حسنِ ظن رکھیں گے، انھیں عادل سمجھیں گے لیکن بعد میں
قیامت کے دن پشیمان ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَوْمَ تَقُفُّ وَجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا
أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا
سَادَتَنَا وَكِبَرَاءَنَا فَأَصَلَّوْنَا السَّبِيلَا رَبَّنَا ارْتِهِمْ
ضَعُفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا۔

جس دن ان کے چہرے آگ میں اٹائے جائیں گے تو وہ کہیں
گے اے کاش! ہم اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرتے۔ اور کہیں گے

لہ مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۲ - تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۴۸۸ - مناقب خوارزمی صفحہ ۲۳۶ -
کنز العمال جلد ۲۰۳ - منتخب کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۳۳ - مناقب المودة صفحہ ۱۸۲ -

لہ مناقب خوارزمی صفحہ ۴۴ - مناقب المودة صفحہ ۳۳۲ - الإصابہ فی تمییز الصحابہ جلد ۲ صفحہ ۲۵ - کفایت الطالب
صفحہ ۳۳۴ - منتخب کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۳۶ - إحقاق الحق جلد ۶ صفحہ ۳۷ -

کرے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کا کہا مانا تو انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ اے پروردگار! اُن کو دُگنا عذاب دے اور اُن پر بڑی لعنت کر۔

(سورۃ اٰحزاب - آیات ۶۶ تا ۶۸)

كَلَّمَا دَخَلْتَ اُمَّةً لَعَنْتُ اُحْتَهَا حَتّٰى اِذَا اَدَارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرَاهُمْ لَوْ لَا هُمْ رَبَّنَا هُوَ لَوْ اَضَلُّوْنَا فَاتَّيْتَهُمْ عَذَابًا ضَعِيفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِيُكْفِي ضِعْفٌ وَلٰكِنْ لَا تَعْلَمُوْنَ

جب ایک کے بعد ایک جماعت (جہنم میں) داخل ہوگی تو وہ اپنے جیسی دوسری جماعت پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب ساری جماعتیں جمع ہو جائیں گی تو پھیلی جماعت پہلی کی نسبت کہے گی کہ اے ہمارے پروردگار یہ تھے وہ جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، پس تو ان کو آگ کا دھرا عذاب دے۔ اللہ کہے گا تم میں سے ہر جماعت کے لیے دھرا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔

(سورۃ انفار - آیت ۳۸)

گمراہی کا سبب یہی ہے۔ کوئی امت ایسی نہیں گزری جس کے پاس اللہ نے نبی بادی نہ بھیجا ہو۔ اور اس کی امت نے اس کے بعد اللہ کے کلام میں تحریف نہ کی ہو۔

کیا کوئی شخص بشر طریموت اور بقائمی ہوش و حواس یہ تصور کر سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں سے کہا ہو گا کہ میں خدا ہوں، ہرگز نہیں! قرآن شریف میں ہے:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِيْ بِهٖ

خدا یا! میں نے ان سے وہی کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا۔

لیکن لالچ اور حب دُنیا نے عیسائیوں کو تثلیث کے عقیدے کی طرف دھکیل دیا۔ حضرت عیسیٰ نے اپنے پیروکاروں کو حضرت محمد کی آمد کی بشارت دی تھی

اسی طرح ان سے پہلے حضرت موسیٰ نے بھی یہ بشارت دی تھی لیکن عیسائیوں نے محمد اور احمد ناموں کی تاویل کر کے ان کا مطلب نجات دہندہ بنالیا اور آج تک وہ اس نجات دہندہ کا انتظار کر رہے ہیں۔

امت محمدیہ بھی تاویل کی بدولت ۳ فرقوں میں تقسیم ہو گئی جس میں سولے ایک کے سب جہنمی ہیں۔ اب ہم انھی فرقوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن کیا کوئی ایک فرقہ بھی ایسا ہے جو خود کو گمراہ سمجھتا ہو؟ بالفاظ دیگر کیا کوئی ایک بھی فرقہ ایسا ہے جو یہ کہتا ہو کہ ہم کتاب و سنت کی مخالفت کرتے ہیں؟ اس کے برعکس ہر فرقے کا یہی دعویٰ ہے کہ ہم کتاب و سنت پر قائم ہیں۔ آخر پھر حل کیا ہے؟

کیا رسول اللہ کو اس کا حل معلوم نہیں تھا یا خود اللہ تعالیٰ کو حل معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ رسول اللہ تو عبد مأمور تھے یعنی وہ تو وہی کرتے تھے جو انھیں حکم ملتا تھا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ طَيِّرٍ

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور وہ ان کی بھلائی چاہتا ہے، اس لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اس مشکل کا کوئی حل تجویز نہ کرے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلائل کو دیکھنے کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلائل کو دیکھنے کے بعد زندہ رہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں کو نظر انداز کر دے اور انھیں بغیر ہدایت کے چھوڑ دے۔ سولے اس صورت کے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا منشا ہی یہ ہے کہ اس کے بندے افتراق و انتشار اور گمراہی میں مبتلا ہوں تاکہ وہ انھیں آتش دوزخ میں بھونک دے۔ یہ اعتقاد بالکل غلط اور باطل ہے میں اللہ سے عفو کا طلب گار ہوں اور توبہ کرتا ہوں اس قول سے جو اللہ کی جلالت اور حکمت کے منافی ہے۔

اے آپ انھیں نصیحت کرتے رہیں کہ آپ نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر دروغ نہیں ہیں۔ مؤرخین

اس لیے رسول اللہ ص سے منسوب یہ قول کہ آپ نے اپنے بعد کتاب اور سنت چھوڑی ہے، ہماری مشکل کا کوئی معقول حل نہیں ہے، بلکہ اس سے پیچیدگی مزید بڑھتی ہے اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کی جڑ نہیں کٹتی۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب لوگوں نے اپنے امام کے خلاف بغاوت کی تو انھوں نے یہی نعرہ لگایا تھا کہ لَيْسَ الْحُكْمُ لَكَ يَا عَلِيُّ وَلَا لِمَا الْحُكْمُ لِلَّهِ۔

علی! تمہارا نہیں اللہ کا حکم چلے گا۔

یہ ظاہر یہ نعرہ بڑا دلکش ہے معلوم ہوتا ہے کہ نعرہ لگانے والا اللہ کے حکم کا نفاذ چاہتا ہے اور غیر اللہ کا حکم ماننے سے انکاری ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْجُجُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ
کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ سخت جھگڑاؤں میں (سورہ بقرہ - آیت ۲۰۴)

جی ہاں! ہم اکثر دل فریب نعروں سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ان کے پیچھے کیا ہے، لیکن امام علیؑ بات کو سمجھتے تھے کیونکہ وہ شہر علم کا دروازہ تھے۔ اس لیے آپ نے جواب دیا کہ

كَلِمَةٌ حَقٌّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ۔

ان کی بات صحیح مگر مقصد غلط ہے۔

جی ہاں! ایسا اکثر ہوا ہے کہ صحیح بات کو غلط مقصد کے لیے استعمال کیا گیا

ہے۔ آئیے اس کو سمجھ لیں کہ کیسے ؟

جب خوارج امام علیؑ سے یہ کہتے تھے کہ حکم آپ کا نہیں اللہ کا چلے گا تو کیا ان کا مطلب یہ تھا کہ اللہ زمین پر اتر کر آئے گا اور سب کے سامنے ظاہر ہو کر ان کے اختلافی مسائل کا تصفیہ کرے گا۔ یا وہ یہ تو جانتے تھے کہ اللہ کا حکم تو قرآن میں ہے لیکن یہ سمجھتے تھے کہ علیؑ نے قرآن کی غلط تاویل کی ہے۔ اگر ایسا تھا تو ان کے پاس

اس کی کیا دلیل تھی، جب کہ علیؑ ان سے زیادہ عالم تھے، ان سے زیادہ راست باز تھے اور ان سے پہلے اسلام لائے تھے۔ کیا علیؑ سے بڑھ کر بھی کوئی اسلام کا پھر رد اور رفا دار ہو سکتا تھا ؟

معلوم ہوا کہ یہ محض دل فریب نعرہ تھا جس کا مقصد سیدھے سادھے لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کی تائید اور جنگ میں ان کی معاونت حاصل کرنا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہی زمانہ وہی لوگ۔ مگر دفریب کم نہیں ہوتے بلکہ بڑھتے جاتے ہیں۔ کیونکہ آج کے مکار اور عیار لوگ انگوں کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ صحیح بات کو غلط مقصد کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

آج بھی چمکتے دھمکتے ہوئے دل فریب نعرے لگائے جاتے ہیں۔ مثلاً :
ازدائی، توحید کی حمایت اور شرک کی مخالفت کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اب کون مسلمان ہے جو اس اصول سے اتفاق نہیں کرے گا۔ ایک فرقے نے تو اپنا نام ہی اہل سنت و الجماعت رکھ چھوڑا ہے۔ کون مسلمان نہیں چاہے گا کہ وہ اس جماعت کے ساتھ ہو جو سنت رسولؐ کا اتباع کرتی ہو۔

بعث پارٹی کا نعرہ ہے :

أُمَّةٌ عَرَبِيَّةٌ وَاحِدَةٌ ذَاتَ رِسَالَةٍ خَالِدَةٍ۔

غیر فانی پیغام کی حامل ایک متحد عرب قوم۔

کون مسلمان اس نعرے سے دھوکا نہیں کھا جائے گا اگر اسے اس پارٹی اور اس کے عیسائی بانی مائیکل عفلق کے خفیہ عزائم کا علم نہیں۔

آفرین ہے آپ کو اے علی بن ابی طالبؑ! آپ کے حکیمانہ اقوال آج بھی قائم و دائم ہیں اور ہمیشہ زمانے کے کانوں میں گونجتے رہیں گے !

فَكَمْ مِّنْ كَلِمَةٍ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ

کتنی ہی بار ایسا ہوتا ہے کہ صحیح بات کو غلط مقصد کے

لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک عالم نے منبر پر چڑھ کر بہ آواز بلند فرمایا :

جو کہے گا کہ میں شیعہ ہوں، ہم اُس سے کہیں گے کہ تو کافر ہے اور جو کوئی کہے گا کہ میں سُنی ہوں، ہم اس سے بھی کہیں گے کہ تو کافر ہے۔ ہمیں شیعہ چاہئیں نہ سُنی۔ ہمیں فقط مسلمان چاہئیں۔

یہاں بھی صریح بات کا غلط مطلب لیا گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ عالم کس اسلام کی بات کر رہا تھا؟ آج دُنیا میں متعدد اسلام ہیں بلکہ قرنِ اول ہی میں متعدد اسلام تھے۔ علیؑ کا بھی اسلام تھا اور معاویہ کا بھی اسلام تھا اور دونوں کے پیروکار بھی تھے، آخر لڑائی تک نوبت پہنچی۔

پھر حسینؑ کا بھی اسلام تھا اور یزید کا بھی اسلام تھا جس نے اہل بیت کو اسلام ہی کے نام پر تہ تیغ کیا۔ اُس نے دعویٰ کیا تھا کہ چونکہ حسینؑ نے اس کے خلاف خروج کیا ہے اس لیے وہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں۔

پھر ائمہ اہل بیت اور ان کے حاسیوں کا اسلام تھا اور حکمرانوں اور ان کے عوام کا اسلام تھا۔ تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں میں اس طرح کا اختلاف رہا ہے۔ آج بھی ایک طرف تو ان لوگوں کا اسلام ہے جنہیں مغرب اعتدال پسند اور روشن خیال کہتا ہے کیونکہ اس اسلام کے پیروکاروں نے یہود و نصاریٰ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہوا ہے اور یہ لوگ سپر پاورز کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ دوسرا اسلام ان کٹر مسلمانوں کا ہے جنہیں مغرب بنیاد پرست متعصب، دقیاؤسی اور مذہبی دیولنے کہتا ہے۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ اس عالم اور خطیب نے بعد میں اپنے خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔

ان اسباب کے پیش نظر جو ہم نے گزشتہ اوراق میں بیان کیے، اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ کتاب اللہ و سنتی والی حدیث کو صحیح تسلیم کیا جاسکے۔

اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح اور عیاں ہو جاتی ہے کہ دوسری حدیث کتاب اللہ و سنتی ہی صریح ہے جس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اس حدیث سے تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اگر ہم اہل بیتؑ کی طرف رجوع کریں جن کی

طرف رجوع کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، تو پھر کس اہیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ خصوصاً اگر یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ ائمہ جن کو خود رسول اللہؐ نے مقرر کیا ہے وہی اس کام کے اہل ہیں اور مسلمانوں میں کوئی ان کے علم کی وسعت میں اور ان کے زہد و تقویٰ میں شک نہیں کرتا۔ وہ تمام فضائل میں دوسروں سے بڑھ کر ہیں۔ اللہ نے انہیں ہر نجاست سے پاک رکھا ہے اور ان کو اپنی کتاب کا وارث بنایا ہے۔ لہذا وہ قرآن کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور نہ اس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں بلکہ تاقیام قیامت اس سے جدا نہیں ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں: ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے جو شل رشتی کے آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے اور دوسری میری عمرت یعنی میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں گے۔

چونکہ میں سپیوں کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں اس لیے ضروری ہے کہ میں فقط حق بات کہوں اور کسی کی ملامت یا اعتراض کی پروا نہ کروں۔ میرا مقصد لوگوں کو خوش کرنے کے بجائے اللہ سبحانہ کی رضا کا حصول اور خود اپنے ضمیر کا اطمینان ہو کیونکہ غیروں کا تو یہ حال ہے کہ

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔

تم سے ہرگز خوش نہیں ہوں گے نہ یہود اور نہ نصاریٰ، جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہ کرنے لگو۔

اس تمام بحث میں شیعہ ہی حق پر ہیں، کیونکہ اہل بیتؑ کے معاملے میں انہوں نے رسول اللہؐ کی وصیت پر عمل کیا ہے۔ اہل بیتؑ کی امامت کو تسلیم کیا ہے اور اہل بیتؑ کی اطاعت اور ان کی متابعت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پس شیعوں کو دُنیا اور آخرت کی یہ کامیابی مبارک ہو۔ حدیث میں

ہے کہ ”آدمی کا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہے“ پھر کیا کہنے اس شخص کے جو اہل بیت سے محبت بھی رکھتا ہو اور ان کا اتباع بھی کرتا ہو۔

زنجیری نے اس بارے میں کہا ہے :

كَثُرَ الشُّكُّ وَالْإِخْتِلَافُ وَكُلُّ
يَدَّعِي أَنَّهُ الصِّرَاطُ السَّوِيُّ
فَتَمَسَّكْتُ بِإِلَهِ إِلَّا اللَّهُ
وَ حُبِّي لِأَحْمَدٍ وَعَلِيٍّ

فَارَزَّ كُلُّهُ بِحُبِّ أَصْحَابِ كَهْفٍ

فَكَيْفَ أَشَقَى بِحُبِّ آلِ النَّبِيِّ

شک اور اختلاف بہت بڑھ گیا ہے اور ہر شخص کا دعویٰ ہے کہ وہ سیدھی راہ پر ہے۔ ایسے میں میں نے دو چیزوں کو مضبوطی سے تھام لیا ہے : ایک رسیمان لِّلَّهِ إِلَّا اللَّهُ کو اور دوسرے احمد و علیؑ کی محبت کو۔ اصحاب کھف سے محبت کے سبب اگر ایک گنا کا میاب ہو سکتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آل محمدؑ سے محبت کے باوجود مجھے دوزخ مقصد نہ ملے۔

سعدی گر عاشقی کنی و جوانی

عشق محمدؐ بس است و آل محمدؐ

اے اللہ ! تو ہمیں ان لوگوں میں سے بنادے جنہوں نے ولایت اہل بیت کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے، جو ان کے راستے پر گامزن ہیں، ان کی کشتی پر سوار ہیں، ان کی امامت کے قائل ہیں اور جو ان کی جماعت میں محشر ہوں گے۔ بیشک تو جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے دیتا ہے۔

خمس

یہ بھی اُن مسائل میں سے ہے جن پر شیعوں اور سنیوں میں اختلاف ہے اس سے قبل کہ ہم کس ایک فرقہ کے حق میں فیصلہ کریں، خمس کے موضوع پر مختصر بحث ضروری ہے، جس کی ابتدا ہم قرآن کریم سے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ
خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَ
الْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ .

اور یہ جان لو کہ جو مال تمہیں حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسولؐ کے لیے، رسولؐ کے قریبداروں کے لیے اور یتیموں ناداروں اور مسافروں کے لیے ہے۔ (سورہ انفال - آیت ۴۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

أَمَرَكُمْ بِأَرْبَعٍ : الْإِيمَانِ بِاللَّهِ فَلِإِقَامِ الصَّلَاةِ
وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ وَصِيَامِ رَمَضَانَ وَأَنْ تَوَدُّوا اللَّهَ
خُمْسَ مَا غَنِمْتُمْ .

اللہ تعالیٰ نے تمہیں چار چیزوں کا حکم دیا ہے : ایمان باللہ کا، نماز قائم کرنے کا، زکات دینے کا اور اس کا کہ تم جو کچھ

کماد اس کا پانچواں حصہ اللہ کو ادا کرو۔ لے چنانچہ شیعہ تو ائمہ اہل بیتؑ کی پیروی کرتے ہوئے جو مال انہیں سال بھر میں حاصل ہوتا ہے اس کا خمس نکالتے ہیں۔ اور غنیمت کی تشریح یہ کرتے ہیں

کہ اس سے مراد وہ نفع ہے جو آدمی کو عام طور پر حاصل ہوتا ہے۔
اس کے برخلاف اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ خمس اس مالِ غنیمت سے مخصوص ہے جو کفار سے جنگ کے دوران میں حاصل ہو۔ ان کے نزدیک مَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ کے معنی ہیں کہ جو کچھ تمہیں جنگ کے دوران میں لوٹ کے مال سے حاصل ہو (جبکہ آیت میں دارالحرب کا خصوصیت سے ذکر نہیں اور مِّنْ شَيْءٍ کے الفاظ عمومیت کے حامل ہیں)۔

لے خمس کے موضوع پر صریح تجاویز کے علاوہ صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسالت مآب نے نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ خمس کی ادائیگی کو بھی واجب قرار دیا تھا۔

اختصار کے پیش نظر ہم یہاں صرف صحیح مسلم سے ایک روایت کا متن درج کر رہے ہیں۔ طالبان تفصیل علامہ سید ابن حسن نجفی صاحب کی کتاب مسئلۃ خمس ملاحظہ فرمائیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبدالقیس کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہم ربیعہ کے قبیلے سے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان مَضَر کا کافر قبیلہ حائل ہے اور حرمت والے زمینوں کے علاوہ دوسرے زمانے میں ہم آپ تک نہیں پہنچ سکتے! لہذا آپ ہمیں کوئی ایسی ہدایت فرمائیں جس پر ہم خود بھی عمل پیرا ہوں اور اپنے دوسرے لوگوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی دعوت دیں۔ آپ نے فرمایا: تم کو حکم دیتا ہوں چار باتوں کے لیے اور منع کرتا ہوں چار باتوں سے۔ پھر آپ نے توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ گواہی دو اس بات کی کہ کوئی مسجود برحق نہیں سوائے خدا کے اور محمد اس کے رسول ہیں۔ نیز نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اپنی کمائی میں سے خمس ادا کرو۔

(صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۹۳ - مطبوعہ لاہور)

(ناشر)

برخلاف ہے شخص کے بارے میں فریقین کے اقوال کا۔ میں حیران ہوں کہ کیسے میں خود کو یا کسی اور کو اہل سنت کے قول کی صحت کا یقین دلاؤں جب کہ میرا خیال ہے کہ اس بارے میں اہل سنت نے اُنوسی حکمرانوں کے قول پر اعتماد کیا ہے خصوصاً معاویہ بن ابی سفیان کی رائے پر۔ جب کہ معاویہ بن ابی سفیان نے مسلمانوں کے اموال پر قبضہ کر کے سب سونا چاندی اپنے لیے اور اپنے مقربین کے لیے مخصوص کر لیا تھا اور اس کا نڈر اپنے بیٹے یزید کو بنایا تھا جو بندروں اور گٹوں کو سونے کے کنگن پہناتا تھا جب کہ بعض مسلمان بھوکے مرتے تھے۔

اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اہل سنت خمس کو دارالحرب سے مخصوص کرتے ہیں کیونکہ یہ آیت ان آیات کے درمیان واقع ہوئی ہے جن کا تعلق جنگ سے ہے۔ ایسی بہت سی آیات ہیں جن کی تفسیر اہل سنت اگر کوئی مصلحت اس کی مقتضی ہو تو ان سے پہلی یا بعد کی آیات کے معنی کی مناسبت سے کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ آیہ تطہیر ازواج رسول سے مخصوص ہے کیونکہ اس سے پہلی اور بعد کی آیات میں ازواج رسول ہیں کا ذکر ہے۔

اسی طرح اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ اہل کتاب سے مخصوص ہے:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔

جو لوگ سونا چاندی جوڑ کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دیجیے۔

(سورہ توبہ - آیت ۳۴)

اس سلسلے میں ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے معاویہ اور عثمان سے اختلاف کا اور ابوذر رضی اللہ عنہ میں شہر بدر کی جانے کا قصہ مشہور ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ جو سونا چاندی جمع کرنے پر اعتراض کرتے تھے وہ اسی آیت سے استدلال کرتے تھے۔ لیکن عثمان نے کعب الاحبار سے مشورہ کیا تو کعب الاحبار نے کہا کہ یہ آیت اہل کتاب سے مخصوص ہے۔ اس پر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ غصے سے بولے: یہ یہودی کے بچے! تیری ماں تجھے روتے اب تو ہمیں ہمارا دین سکھائے گا؟ اس پر عثمان ناراض ہو گئے اور ابوذر رضی اللہ عنہ کو ربذہ

میں شہر بدر کر دیا۔ وہ وہیں اکیلے پڑے پڑے کس مہرپسی کی حالت میں خالق حقیقی سے جاملے۔ ان کی بیٹی کو کوئی ایسا شخص بھی دستیاب نہ ہو سکا جو ان کو غسل کفن دے سکتا۔

اہل سنت نے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تاویل کو ایک فن بنا دیا، ان کی فقہ اس سلسلے میں مشہور ہے۔ اس معاملے میں وہ ان خلفائے اولین اور مشاہیر صحابہ کا اتباع کرتے ہیں جو نصوص صریحہ کی تاویل کرتے ہیں یہ اگر ہم ایسے تمام نصوص گنوائے لگیں تو ایک الگ کتاب کی ضرورت ہوگی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ النص والاجتہاد نامی کتاب کا مطالعہ کرے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ تاویل کرنے والوں نے کس طرح اللہ کے احکام کو کھیل بنا دیا۔

اگر میرا مقصد تحقیق ہے تو پھر مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی اپنی خواہش کے مطابق یا جس مذہب کی طرف میرا رجحان ہے اس کے تقاضوں کے مطابق تاویل کرنے لگوں۔

لیکن اس کا کیا علاج کہ اہل سنت نے خود ہی اپنی صحاح میں وہ روایات بیان کی ہیں جن کے مطابق دارالحرب سے باہر خمس کی فرضیت کا ثبوت ملتا ہے اور اس طرح اپنے مذہب اور اپنی تاویل کی خود ہی تنفیذ اور تردید کر دی ہے۔ مگر معما پھر بھی حل نہیں ہوتا۔

معاذ اللہ کہ آخر اہل سنت ایسی بات کیوں کہتے ہیں جس پر عمل نہیں کرتے۔ وہ اپنی حدیث کی کتابوں میں وہی اقوال بیان کرتے ہیں جن کے شیعہ قائل ہیں۔ لیکن ان کا عمل سراسر مختلف ہے۔ آخر کیوں؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ خمس کا موضوع بھی ان ہی مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں شیعہ خود اپنی روایات پر عمل نہیں کرتے۔

صحیح بخاری کے ایک باب میں ایک عنوان ہے: **فِي الرِّكَازِ الْخُمْسُ** (دفعینے میں خمس ہے)۔ مالک اور ابن ادریس کہتے ہیں کہ ریکاز وہ مال ہے جو قبض از اسلام دفن کیا گیا تھا۔ یہ تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں خمس ہے۔ جبکہ سعد بن خازر ریکاز یا دفعینہ نہیں ہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ ریکاز میں خمس ہے۔ ۱۰

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ عنبر ریکاز نہیں ہے۔ وہ تو ایک چیز ہے جسے سمندر پھینکتا ہے لیکن حسن بصری کہتے ہیں کہ عنبر اور موتی میں بھی خمس ہے۔ ۱۱

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غنیمت کا وہ مفہوم جس پر اللہ تعالیٰ نے خمس واجب کیا ہے دارالحرب سے مخصوص نہیں کیونکہ ریکاز یا دفعینہ وہ خزانہ ہے جو زمین کے اندر سے نکالا جائے۔ یہ خزانہ ملکیت ہوتا ہے اس کی جو اس کو نکالے لیکن اس پر خمس کی ادائیگی واجب ہے اس لیے کہ دفعینہ بھی مال غنیمت ہے۔ باسیط عنبر اور موتی جو سمندر سے نکالے جائیں ان پر بھی خمس نکالنا واجب ہے، کیونکہ وہ بھی مال غنیمت ہیں۔

بخاری نے اپنی صحیح میں جو روایات بیان کی ہیں ان سے اور مذکورہ بالا احادیث سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اہل سنت کے اقوال اور ان کے افعال میں تضاد ہے درنہ بخاری تو اہل سنت کے سب سے قریب ترین محدث ہیں، ان کی روایات پر عمل نہ کرنے کے کیا معنی؟

شیعوں کی راتے ہمیشہ مبنی برحقیقت ہوتی ہے۔ اس میں نہ کوئی تضاد ہوتا ہے نہ اختلاف۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد میں بھی اور احکام میں بھی ائمہ اربعین کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کی شان میں آیہ تطہیر اتری ہے اور جن کو رسول اللہ نے کتاب اللہ کے ہمدوش قرار دیا ہے۔ پس جس نے ان کا دامن پکڑ لیا وہ گمراہ نہیں ہو سکتا اور جس نے ان کی پناہ حاصل کر لی وہ محفوظ ہو گیا۔

علاوہ ازیں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ہم جنگوں پر بھر دسہ نہیں کر سکتے یہ بات

اسلام کی وسیع انفرسٹریکچر اور صلیح پسندی کے خلاف ہے۔ اسلام کوئی سامراجی حکومت نہیں ہے جس کا مقصد دوسری قوموں کا استحصال کرنا، ان کے وسائل سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور انھیں ٹوٹنا ہو۔ یہ تو وہ الزام ہے جو اہل مغرب ہم پر لگاتے ہیں جو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام طاقت اور تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور اس کا مقصد غیر قوموں کے وسائل پر ناجائز قبضہ کرنا ہے۔

مال زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اسلام کا اقتصادی نظریہ یہ ہے کہ لوگوں کو معاشی تحفظ کی ضمانت دی جائے جسے آج کل کی اصطلاح میں سوشل سیکیورٹی کہا جاتا ہے اور ہر فرد کی ماہوار یا سالانہ کفالت کا انتظام کیا جائے نیز معذوروں اور حاجت مندوں کو باعزت روزی کی ضمانت فراہم کی جائے۔

ایسی حالت میں اسلامی حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس آمدنی پر انحصار کرے جو اہل سنت زکات کے نام سے نکالتے ہیں جس کی مقدار زیادہ سے زیادہ ڈھائی فیصد ہوتی ہے۔ یہ تناسب اتنا کم ہوتا ہے کہ حکومت کی ایسی ضروریات کے لیے ناکافی ہے مثلاً افواج کو کیل کانٹے سے لیس کرنا، اسکول اور کالج بنانا، اسپتال اور ہسپتال قائم کرنا، سڑکیں اور پل تعمیر کرنا وغیرہ۔ حالانکہ حکومت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شہری کو اتنی آمدنی کی ضمانت دے جو اس کے گزر بسر کے لیے کافی ہو۔

اسلامی حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی اور اپنے اداروں اور افراد کی بقا اور ترقی کے لیے عوں ریز جنگوں پر انحصار کرے یا ان مقتولین کی قیمت پر ترقی کرے جو اسلام میں دلچسپی نہ رکھنے کی پاداش میں قتل کر دیے گئے ہوں۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ سب بڑی اور ترقی یافتہ حکومتیں تمام اشیائے صرف پر ٹیکس لگاتی ہیں جس کی مقدار تقریباً بیس فیصد ہوتی ہے۔ جس کی بھی اتنی ہی مقدار اسلام نے اپنے ماننے والوں پر فرض کی ہے۔ اہل فرانس جو ۲۷.۷۸ ادا کرتے ہیں اس کی مقدار ۱۸.۶۵ فیصد ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر انکم ٹیکس کا اضافہ کر لیا جائے تو یہ مقدار ۲۰ فیصد یا کچھ زیادہ ہو جاتی ہے۔

ائمہ اہل بیتؑ کو قرآن کے مقاصد کا دوسروں سے زیادہ علم تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ ترجمان قرآن تھے۔ اسلامی حکومت کی اقتصادی اور اجتماعی حکمت عملی وضع کرنا ان کا کام تھا بشرطیکہ ان کی بات مانی جاتی مگر افسوس کہ اقتدار اور اختیار دوسروں کے ہاتھ میں تھا، جنھوں نے طاقت کے بل پر زبردستی خلافت پر قبضہ کر لیا تھا اور متعدد صحابہ صالحین کو قتل کر دیا تھا اور اپنی سیاسی اور مذہبی مصلحتوں کے مطابق اللہ کے احکام میں رد و بدل کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ نتیجہً اُمت پستی کے تحت الشریٰ میں گر گئی جس سے وہ آج تک نہیں ابھر سکی۔

ائمہ کی تعلیمات نے ایسے افکار اور نظریات کی شکل اختیار کر لی جن پر شیعہ آج بھی یقین رکھتے ہیں لیکن عملی زندگی میں ان کی تطبیق کی کوئی صورت نہ رہی شیعوں کو مشرق و مغرب میں ہر طرف دھتکار دیا گیا۔ اُنہوں اور عباسی صدیوں تک ان کا پیچھا کرتے رہے۔

جب یہ دونوں حکومتیں ختم ہو گئیں تب جا کر شیعوں کو ایسا معاشرہ قائم کرنے کا موقع ملا جس میں وہ خمس ادا کر سکتے تھے۔ پہلے وہ خمس خفیہ طور پر ائمہ علیہم السلام کو ادا کرتے تھے، اب وہ اپنے مرجع تقلید کو امام مہدی علیہ السلام کے نائب کی حیثیت میں ادا کرتے ہیں۔ اور مراجع تقلید اس رقم کو شرعی کاسوں میں خرچ کرتے ہیں۔ مثلاً وہ اس رقم سے دینی مدارس، علمی مراکز، اشاعت اسلام کے لیے اشاعتی ادارے نیز خیراتی ادارے، پبلک لائبریریاں اور یتیم خانے وغیرہ قائم کرتے ہیں۔ دینی علوم کے طالب علموں کو ماہانہ وظائف وغیرہ بھی دیتے ہیں۔

اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ شیعہ علماء حکومت کے دست نگر نہیں اس لیے کہ خمس کی رقم ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں بلکہ وہ خود مستحقین کو ان کے حقوق پہنچاتے ہیں۔ اس لیے وہ حکمرانوں کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اس کے برخلاف، علمائے اہل سنت حکام وقت کے دست نگر اور ان کے ملازم ہیں۔ حکام اپنی مصالحت کے مطابق جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں اور جس کو

چاہتے ہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح علماء کا تعلق عوام سے کم اور ایوان اقتدار سے زیادہ ہو گیا ہے۔

اب آپ خود دیکھیے کہ خمس کے حکم کی تاویل کا اُمت کے معاملات پر کیا اثر پڑا۔ اس صورت میں ان مسلمان نوجوانوں کو کیسے الزام دیا جاسکتا ہے جنہوں نے اسلام کو چھوڑ کر کمیونزم کا راستہ اس لیے اختیار کر دیا کہ انہیں کمیونزم کے نظریہ میں اس نظام کی نسبت جو ہمارے یہاں رائج ہے، دولت کی تقسیم قوم کے تمام افراد میں زیادہ منصفانہ نظر آتی۔

ہمارے یہاں تو ایک ظالم طبقہ ایسا ہے جو ملک کی ساری دولت پر قبضہ جمائے ہوئے ہے جبکہ ملک کی غالب اکثریت افلاس میں دن گزار رہی ہے۔ جن دولت مندوں کے دل میں تھوڑا بہت اللہ کا خوف ہے، وہ بھی سال میں ایک مرتبہ زکات نکالنے کو کافی سمجھتے ہیں جو فقط ڈھائی فیصد ہوتی ہے اور جس سے غریبوں کی سالانہ ضرورت کا دسواں حصہ بھی پورا نہیں ہوتا۔

حَبِطَ الْبَلَدِ عَلَى حَقِّ نَبِيِّهِ

تقلید

شیعہ کہتے ہیں کہ فروع دین شریعت کے وہ احکام ہیں جن کا تعلق ان اعمال سے ہے جو عبادت ہیں جیسے: نماز، روزہ، زکات اور حج وغیرہ۔ ان کے بارے میں مندرجہ ذیل تین صورتوں میں سے کسی ایک پر عمل واجب ہے:-
الف۔ یا تو آدمی خود اجتہاد کرے اور احکام کے دلائل پر غور کرے (بشرطیکہ اس کا اہل ہو)۔

ب۔ یا احتیاط پر عمل کرے بشرطیکہ احتیاط کی گنجائش ہو۔

ج۔ یا پھر کسی جائز الشرائط مجتہد کی تقلید کرے۔

جس کی تقلید کی جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندہ، عاقل، عادل، پرہیزگار اور دین پر عاقل ہو۔ اپنی خواہشات نفسانی پر نہ چلتا ہو بلکہ احکامات الہی کی پیروی کرتا ہو۔
فروعی احکام میں اجتہاد تمام مسلمانوں پر واجب کفائی ہے، اگر کوئی ایک بھی

اجتہاد کی اصطلاح شیعوں کے ہاں بھی موجود ہے لیکن اس کے وہ معنی نہیں جو شیعوں نے علی طور پر اسے دے دیے ہیں۔ شیعوں کے ہاں عملاً اجتہاد میں ذاتی رائے کے اظہار کا غنصر بھی موجود ہے جبکہ شیعوں میں اجتہاد فقط احکام الہی کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے اور مجتہد کسی صورت میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار نہیں کرتا۔ البتہ اصطلاح کی تعریف کرتے وقت دونوں مکاتب کی اصول کتابوں میں ایک ہی جملہ استعمال ہوتا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے شیعوں میں فقیہ یا غیر معصوم صحابی کی رائے کا احکام میں دخل ہے۔ جبکہ شیعوں کا مکتب صرف خدا و رسول کے احکامات و ارشادات کو معتبر گردانتا ہے۔ مثلاً امام محمد باقرؑ یا امام جعفر صادقؑ یہ نہیں کہتے تھے کہ اَنَا أَقُولُ: (میں کہتا ہوں): یا اَنَا أَحَرِّمُ (میں حرام کرتا ہوں) بلکہ یہی کہتے تھے کہ رسول اللہؐ نے یوں فرمایا ہے: یا خدا نے یوں فرمایا ہے۔ یہ مکتب اہل بیت کا امتیاز ہے۔

مکتب اہل بیت کے اصولی فکر کے نمونے کے طور پر ہم آپ کے لیے ایک بزرگ عالم

مسلمان جس میں اس کام کی علمی لیاقت اور استعداد ہے، اس کام کو کر لے تو باقی مسلمانوں سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔

شیعہ ان علماء کا اجتہاد کافی سمجھتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اجتہاد کا رتبہ حاصل کرنے میں صرف کی ہو۔ مسلمانوں کے لیے ایسے مجتہد کی تقلید کرنا اور فروع دین میں اس کی طرف رجوع کرنا جائز ہے۔ لیکن اجتہاد کا رتبہ حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں اور نہ اس کا حصول سب کے لیے ممکن ہے۔ اس کے لیے بہت وقت اور بہت وسیع علمی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ سعادت صرف اسے ہی میسر آتی ہے جو سخت محنت اور کوشش کرتا اور اپنی عمر تحقیق و تعلم میں کھیلتا ہے۔ ان میں بھی اجتہاد کا رتبہ صرف خاص خاص خوش نصیبوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

مَنْ أَرَادَ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا أَتَقَفَّهْهُ فِي الْمَسْجِدِ.

اللہ جس کے ساتھ نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ

عطا کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں شیعوں کا یہ قول اہل سنت کے ایسے ہی قول سے مختلف

نہیں۔ صرف اس بارے میں اختلاف ہے کہ تقلید کے لیے مجتہد کا زندہ ہونا ضروری ہے یا نہیں۔

لیکن شیعوں اور سنٹیوں میں واضح اختلاف اس میں ہے کہ تقلید پر عمل کیسے

عثمان بن سعید غریؒ کا قول نقل کرتے ہیں جو حضرت ولی عصرؑ اور ائمہ الفداء کے نائب خاص تھے۔ جب انہوں نے ایک شیعہ کے سوال کے جواب میں ایک عمل کی حرمت کا فیصلہ دیا تو ان الفاظ کا اضافہ کیا :

”میں یہ فیصلہ اپنی طرف سے نہیں دے رہا۔ میرے لیے کسی صورت میں

رہا نہیں کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دوں“ (یعنی میں فقط امام علیہ السلام

کا قول نقل کر رہا ہوں) اصول کاں جلد ۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۸ صفحہ ۱۰۰

(ناشر)

کیا جائے۔ شیعوں کا اعتقاد ہے کہ وہ مجتہد جس میں مندرجہ بالا سب شرائط پائی جاتی ہوں امام علیہ السلام کا نائب ہے اور غیبت امام کے زمانے میں وہ حاکم اور سربراہ ہے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے اور لوگوں پر حکومت کرنے کے اسے وہی اختیارات حاصل ہیں جو امام کو ہیں۔ مجتہد کے احکام کا انکار خود امام کا انکار ہے۔

شیعوں کے نزدیک جامع الشرائط مجتہد کی طرف صرف فتوے کے لیے ہی رجوع نہیں کیا جاتا بلکہ اسے اپنے مقلدین پر ولایت عامہ بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے مقلدین اپنے مقدمات کے تصفیہ کے لیے بھی اپنے مجتہد ہی سے رجوع کرتے ہیں اور اپنے اموال کا خمس اور زکات بھی اپنے مزبج تقلید ہی کو ادا کرتے ہیں، جو خمس اور زکات میں امام زمانہؑ کے نائب کی حیثیت سے شریعت کے مطابق تصرف کرتا ہے۔ لیکن اہل سنت و الجماعت کے نزدیک مجتہد کا یہ مرتبہ نہیں۔ وہ یہ نہیں

مانتے کہ امام نائب رسول ہوتا ہے۔ فقہی مسائل میں البدۃ وہ صاحب مذاہب اربعہ میں کسی ایک کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان ائمہ اربعہ کے نام یہ ہیں :

(۱) ابو حنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ)

(۲) مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر اصبحی (۹۳ھ تا ۱۶۹ھ)

(۳) محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع (۱۵۰ھ تا ۱۹۸ھ)

(۴) احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال (۱۹۴ھ تا ۲۴۱ھ)

موجودہ دور کے بعض اہل سنت ان میں سے کسی ایک معین امام کی تقلید نہیں کرتے، بلکہ اپنی مصلحت کے مطابق بعض مسائل میں کسی ایک امام کی تقلید کرتے ہیں اور کچھ دوسرے مسائل میں کسی دوسرے امام کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ سیداق نے جنہوں نے چاروں اماموں کے فقہ سے ماخوذ ایک کتاب مرتب کی ہے، ایسا ہی کیا ہے۔ کیونکہ اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اصحاب مذاہب کا اختلاف رحمت ہے۔ اس لیے اگر کسی مالکی کو اپنی مشکل کا حل اپنے امام کے یہاں نہ ملے اور امام ابو حنیفہ کے یہاں مل جائے تو وہ امام ابو حنیفہ کے قول پر عمل کر لے۔

میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں تاکہ مطلب واضح ہو جائے :

پہلے زمانے میں تونس میں اکثر باپ مختلف وجوہ سے بیٹیوں کو عاق کر دیا کرتے تھے، جن میں سے ایک وجہ یہ ہوتی تھی کہ لڑکی جس سے شادی کرنا چاہتی تھی اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ عاق کرنے کا انجام بڑا خراب ہوتا ہے کیونکہ جب باپ بیٹی کو میراث سے محروم کر دیتا ہے تو لڑکی اپنے بھائیوں کی دشمن بن جاتی ہے اور بھائی خود بھی بہن کو چھوڑ دیتے ہیں، کیونکہ بہن کے بھاگنے کو بھائی اپنے لیے کلنک کا ٹیکہ سمجھتے ہیں۔

اس طرح معاملہ ویسا نہیں ہے جیسا کہ اہل سنت سمجھتے ہیں کہ اصحاب مذاہب فقہاء کا اختلاف ہمیشہ رحمت ہوتا ہے۔ کم از کم یہ اختلاف ہر مسئلے میں حُرمت نہیں ہے، کیونکہ ہمارے لیے معاشرتی اور قبائلی اختلافات اور روایات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

ایک ایسے معاشرے میں جس کی نشوونما بالکی افکار پر ہوتی ہو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ عورت کو یہ حق ہو کہ وہ گھر سے بھاگ جائے اور باپ کی اجازت کے بغیر کسی سے نکاح کر لے۔ جو عورت ایسا کرے گی اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ اس نے گویا اسلام کا انکار کیا یا ایک ناقابل معافی گناہ کا ارتکاب کیا۔ جبکہ دوسرے مذہب کی رو سے اس نے ایسا کام کیا جو نہ صرف جائز ہے بلکہ اسے اس کا حق بھی ہے۔ اسی لیے مالکی معاشرے کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حنفی معاشرے میں نسبتاً جنسی آزادی اور آوارگی ہے۔ ان مذہبی اختلافات کے نتیجے میں عورت اپنے بہت سے حقوق سے محروم ہے اور وہ اس صورت حال کا الزام دین اسلام کو دیتی ہے۔ اسی لیے ہم ان بعض نوجوان عورتوں کو الزام نہیں دے سکتے جو اپنے مذہب کا اس لیے انکار کرنے لگتی ہیں کیونکہ ان کے بڑے ان کے ساتھ خلاف شریعت ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔

اس مثال کے بعد ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں :-

اہل سنت کے نزدیک جس امام کی تقلید کی جائے اُسے اس تقلید سے وہ درجہ حاصل نہیں ہو جاتا جس کے شیعہ قائل ہیں یعنی نیابت رسول کا درجہ۔ اس کی وجہ شوری اور خلیفہ یا امام کے انتخاب کا نظریہ ہے۔ اہل سنت نے خود اپنے

جب یہاں قاضی کو رٹس ہوا کرتی تھیں۔ اس لڑکی کو ایک شخص سے محبت ہو گئی۔ یہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر اس کا باپ اللہ جانے کیوں اس سے اس کے نکاح پر راضی نہیں تھا۔ آخر لڑکی باپ کے گھر سے بھاگ گئی اور اس نے اس نوجوان سے باپ کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیا۔ باپ نے شوہر کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔

جب لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ عدالت میں پیش ہوئی تو قاضی نے اس سے گھر سے بھاگنے اور ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا : ”جناب عالی! میری عمر ۲۵ سال ہے۔ میں اس شخص سے اللہ رسول کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق شادی کرنا چاہتی تھی، لیکن میرا باپ میرا بیاہ ایسے شخص سے کرنا چاہتا تھا جو مجھے بالکل پسند نہیں تھا۔ میں نے امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق شادی کر لی کیونکہ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق مجھے بالغ ہونے کی وجہ سے حق ہے کہ میں جس سے چاہوں شادی کر لوں۔“

اللہ بخشنے قاضی صاحب جنھوں نے یہ قصہ مجھے خود سنایا تھا، کہنے لگے : جب ہم نے اس مسئلہ کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ لڑکی ٹھیک کہتی تھی۔ میرا خیال ہے شاید کسی جاننے والے عالم نے سکھایا تھا کہ عدالت میں جا کر کیا بیان دے۔

قاضی صاحب کہتے تھے کہ میں نے باپ کا دعویٰ خارج کر دیا اور نکاح کو باقی رکھا۔ باپ غصہ میں بھرا ہوا عدالت سے باہر نکلا۔ وہ ہاتھ مل رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ”کتیا حنفی ہو گئی“ یعنی امام مالک کو چھوڑ کر امام ابوحنیفہ کا مذہب اختیار کر لیا۔ بعد میں وہ شخص کہتا تھا کہ میں اس کتیا کو عاق کر دوں گا۔

یہ مسئلہ اجتہادی اختلاف کا ہے :-

امام مالک کی رائے ہے کہ کنواری باکرہ لڑکی کا نکاح سرپرست کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر مطلقہ یا بیوہ ہو تب بھی ولی کی اجازت ضروری ہے ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ بالغہ چاہے باکرہ ہو یا مطلقہ و بیوہ اسے خود اپنا شوہر پسند کرنے اور عقد کرنے کا اختیار ہے۔

تو اس فقہی مسئلے نے باپ بیٹی میں جدائی ڈال دی۔ یہاں تک کہ باپ نے بیٹی کو عاق کر دیا۔

آپ کو یہ حق دے دیا ہے کہ وہ جس کو چاہیں خلیفہ یا بہتر الفاظ میں امام بنادیں۔ اسی طرح ان کے خیال میں انھیں یہ بھی حق ہے کہ وہ چاہیں تو امام کو معزول کر دیں یا اس کے بجائے جسے اپنی دانست میں بہتر سمجھیں اسے مقرر کر دیں، اس طرح درحقیقت وہ امام کے بھی امام ہو گئے۔ یہ صورت شدید عقیدہ کے بالکل برعکس ہے، اگر ہم اہل سنت کے پہلے امام یعنی ابوبکر صدیق پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انھوں نے اُمت سے اپنے پہلے خطاب میں کہا تھا :

أَيُّهَا النَّاسُ لَقَدْ وُلِّيتُ عَلَيْكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ فَإِنْ أَطَعْتُمْ فَأَعِيتُونِي وَإِنْ عَصَيْتُمْ فَقَوْمُونِي....
”لوگو! مجھے تمھارا وال جن لیا گیا ہے اگرچہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ چنانچہ جب تک میں صبح راستے پر چلوں میرے ساتھ تعاون کرو اور جب میں بھٹک جاؤں، تو مجھے صبح راہ پر چلا دو....“

اس طرح ابوبکر خود اعتراف کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے ان کو پسند کیا ہے اور ان کی بیعت کی ہے انھیں یہ بھی حق ہے کہ مصیبت اور خطا کی صورت میں وہ ان کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

اس کے برعکس، جب ہم شیعوں کے پہلے امام یعنی علی بن ابی طالبؓ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ ان کی امامت کے قائل ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ان کو امام مان کر دراصل حکم خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک امام علیؓ کو ایسی ہی ولایت مطلقہ حاصل ہے جیسی اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہے۔ جس کو خود اللہ نے منتخب کیا ہو بھلا اس کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کوئی خطا کرے یا کسی مصیبت کا مرتکب ہو؟ اسی طرح اُمت کے لیے بھی یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ اس کے کسی حکم کی مخالفت کرے یا اس کا مقابلہ کرے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُمْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا.

چونکہ حضرت علیؓ کو مسلمانوں کا امام اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کیا تھا، اس لیے ان کی حکم عدولی نہیں کی جاسکتی تھی نہ یہ ممکن تھا کہ حضرت علیؓ کی مصیبت کا ارتکاب کریں اسی لیے رسول اللہؐ نے فرمایا تھا :

عَلَيْ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ وَلَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَى الْحَوْضِ.

”علیؓ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؓ کے ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے جب تک میرے پاس حوض پر نہ آجائیں۔“

تقلید کے بارے میں فریقین کا استدلال ان کے دو مختلف نظریوں کی بنیاد پر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مطلب ہے سنیوں کا شعوری کا نظریہ اور شیعوں کا نص کا نظریہ۔

اس کے بعد تقلید کے متعلق شیعوں اور سنیوں میں صرف ایک اور اختلافی مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے ”تقلیدِ میت کا مسئلہ“۔

اہل سنت جن ائمہ کی تقلید کرتے ہیں انھیں فوت ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ اسی زمانے کے بعد سے اہل سنت کے یہاں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ ان ائمہ کے بعد جو علماء ہوئے ان کی ساری توجہ صرف اگلی کتابوں کی شرحیں لکھنے اور مذاہبِ اربعہ کے مطابق فقہی مسائل کے نظم اور شرحیں مجموعے مرتب کرنے پر مرکوز رہی۔ اب چونکہ بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا ائمہ کے زمانے میں وجود بھی نہیں تھا، اس لیے بعض محاضریں آواز اٹھا رہے ہیں کہ زمانے کی مصلحت کا

۱۔ محمد بن عیسیٰ رزمی جامع فرمزدی جلد ۵ صفحہ ۲۹۷۔ علاء الدین شافعی ہندی کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۳۰۔ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۲۔ جلال اللہ زنجیری ربیع الاہل ابن جریثی مکی صواعق مخرقة صفحہ ۱۲۲۔ ابن ابی الحدید معتزل شرح منہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۵۷۲۔ حافظ ابوبکر خطیب ہندادی تاریخ بغداد جلد ۱۲ صفحہ ۳۲۱۔ حافظ ابی عساکر تاریخ دمشق جلد ۳ صفحہ ۱۱۹۔ ابن قتیبہ دینوری الإمامة والسياسة جلد ۳ صفحہ ۷۳۔

تقاضا یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ پھر سے کھول دیا جائے۔

اس کے برعکس، شیعہ میت کی تقلید جائز نہیں سمجھتے اور اپنے تمام احکام کے بارے میں ایسے زندہ مجتہد کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں وہ سب شرائط پائی جاتی ہوں جن کا ہم نے گزشتہ اوراق میں ذکر کیا ہے۔ یہ صورت امام معصومؑ کی غیبت کے زمانے میں ہے۔ جب تک امام معصوم دوبارہ ظاہر نہیں ہوتے، شیعہ قابل اعتماد علماء ہی سے رجوع کرتے رہیں گے۔

آج بھی ایک سنی مالکی مثلاً کہتا ہے کہ امام مالک کے قول کے مطابق یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ حالانکہ امام مالک کو فوت ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ یہی صورت امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے پیروکاروں کے ساتھ ہے کیونکہ یہ سب مذاہب اور ائمہ ایک ہی زمانے میں تھے اور ان کا ایک دوسرے سے استاد شاگرد کا تعلق تھا۔

اہل سنت اپنے ائمہ کے معصوم ہونے کے بھی قائل نہیں۔ نہ خود ان ائمہ نے کبھی عصمت کا دعویٰ کیا۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ ائمہ جو اجتہاد کرتے ہیں اس میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہے۔ صواب کی صورت میں انھیں دوا جرتے ہیں اور خطا کی صورت میں ایک آخر۔ بہر کیف آخر ہر اجتہاد پر ملتا ہے۔

شیعوں کے نزدیک تقلید کے دو دور ہیں :

xx پہلا دور ائمہ اثنا عشر کا دور ہے۔ یہ مرحلہ تقریباً ساڑھے تین سو سال پر محیط ہے۔ اس دور میں ہر شیعہ امام معصوم کی تقلید کرتا تھا اور امام کوئی بات اپنی رائے یا اپنے اجتہاد سے بیان نہیں کرتے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے تھے اسی علم اور ان روایات کی بنیاد پر کہتے تھے جو انھیں ابا عن جد رسول اللہ سے پہنچی تھیں۔ مثلاً وہ کسی سوال کے جواب میں اس طرح کہتے تھے :

”روایت بیان کی میرے والد نے، انھوں نے یہ روایت سنی

اپنے نانا سے، انھوں نے جبریلؑ سے، انھوں نے اللہ عزوجل سے“

xx دوسرا دور زمانہ غیبت امام کا دور ہے جو ابھی تک چل رہا ہے۔ اب شیعہ یہ کہتا ہے کہ یہ چیز آیت اللہ جوئی کی رائے کے مطابق یا آیت اللہ خمینی کی رائے کے مطابق حلال یا حرام ہے۔ یہ دونوں مجتہد زندہ ہیں۔ ان کی رائے سے مراد ہے قرآن اور ائمہ اہل بیت کی روایات کے مطابق سنت سے احکام کے استنباط میں ان کا اجتہاد ائمہ اہل بیت کی روایات کے بعد دوسرے درجے میں صحابہ عدول یعنی معتبر صحابہ کی روایات ہیں۔ ائمہ اہل بیت کو ترجیح اس لیے ہے کہ وہ شریعت کے بارے میں اپنی رائے سے قطعی احراز کرتے ہیں اور اس کے قائل ہیں کہ :

یہ فرماتے ہوئے شاکر :

”میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے اور میرے والد کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے اور میرے دادا کی حدیث حسین کی حدیث ہے اور حسین کی حدیث حسن کی حدیث ہے اور حسن کی حدیث امیر المومنین علیؑ کی حدیث ہے اور امیر المومنین کی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے اور رسول اللہ کی حدیث ارشاد الہی ہے“
(أصول کافی جلد ۱ صفحہ ۳۵)

غتبہ روایت کرتے ہیں کہ

”ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ نے جواب دیا۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ اگر ایسا اور ایسا ہوتا تو اس میں دوسرا قول نہ ہوتا۔ آپ نے فرمایا :
”جب کبھی ہم کسی مسئلے کا جواب دیں تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اور ہم کوئی جواب اپنی رائے سے نہیں دیتے“
(بصائر الدرجات صفحہ ۳۰۰-۳۰۱)

(نارشر)

لہ جن دنوں مصنف نے یہ کتاب لکھی تھی، آیت اللہ خمینی جات تھے۔

لہ ہشام بن سالم اور حماد بن عیسیٰ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم نے امام جعفر صادقؑ کو

مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا وَ لِلّٰهِ فِيْهِ حُكْمٌ

یعنی کوئی ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں اللہ کا حکم نہ ہو۔
اگر کسی مسئلہ کے بارے میں ہمیں یہ حکم دستیاب نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں
کہ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بلکہ یہ ہمارا قصور اور ناواقفیت
ہے جس کی وجہ سے ہمیں اس حکم کا علم نہیں ہو سکا۔ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس
کی دلیل نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں۔ اللہ سبحانہ کا قول ہے:
مَا قَدْ ظَنَّا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ
اس کتاب میں ہم نے کوئی چیز نظر انداز نہیں کی۔

(سورۃ انفصاف - آیت ۳۸)

وہ عقائد جن پر اہل سنت شیعوں کو الزام دیتے ہیں

شیعوں کے کچھ عقائد ایسے ہیں جن پر اہل سنت محض اس تبصیب کی وجہ
سے اعتراض کرتے ہیں جو امویوں اور عباسیوں نے اس لیے پھیلایا تھا کیونکہ وہ امام
علیؑ سے بغض اور کینہ رکھتے تھے یہاں تک کہ امویوں نے علی الاعلان ۸۰ برس تک
منبروں سے افتخار ہرنی دہرولی حضرت علیؑ پر لعنت کی یہ

اس لیے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ لوگ ہر اس شخص کو گالی
دیتے تھے اور اس پر ہر طرح کے بہتان باندھتے تھے جس کا ذرا بھی علیؑ کی جماعت سے
تعلق ہو۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کسی کو یہ کہا جاتا تھا کہ تو یہودی ہے
تو وہ اس کا اتنا بُرا نہیں مانتا تھا جتنا اگر اس کو یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ تو شیعوں ہے۔
ان کے حامیوں اور پیروکاروں کا بھی ہر زمانے میں اور ہر ملک میں یہی طریقہ رہا۔
یہاں تک کہ اہل سنت کے لیے لفظ شیعوں ایک گالی بن گیا، کیونکہ شیعوں کے عقائد
مختلف تھے اور شیعوں کی جماعت سے باہر تھے، اس لیے شیعیان ان پر جو چاہتے الزام
لگادیتے تھے، جس طرح چاہتے نام دھرتے تھے اور ہر بات میں ان کے طریقے کے

لے تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ عاشوراء - مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی کراچی پاکستان۔

خلاف کرتے تھے یہ

آپ کو شاید علم ہو کہ علمائے اہل سنت میں سے ایک مشہور عالم کا کہنا تھا
کہ اگرچہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا سنت رسولؐ ہے، لیکن چونکہ یہ شیعوں کا شعار
بن گیا ہے اس لیے اس کا ترک واجب ہے۔
اور سنیہ! حُجَّۃ الاسلام ابو حامد غزالی کہتے ہیں کہ قبر کی سطح کو مہوار کرنا اسلام
میں مشروع ہے مگر رافضیوں نے اسے اپنا شعار بنالیا ہے، اس لیے ہم نے اسے چھوڑ
کر قبروں کو اُونٹ کے کوبان کی شکل دے دی۔

لے آج بھی بعض انتہا پسند حلقے یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ شیعہ کافر ہیں، سبائی ہیں اور ان کی جان
اور ان کا مال محترم نہیں ہے، ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ اس طرح انھوں نے
نفرت اور افتراق کا پنڈورا کھول دیا ہے۔ لیکن ہمارے علماء ہمیشہ ہمت کی وحدت و یکجہالت
کے داعی رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کون لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مَحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ کہہ دے
وہ مسلمان ہے اور اس کی جان اور آئینہ محترم ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جمال الدین افغانی سے لے کر آیت اللہ خمینیؑ تک ہمارے علماء نے اتحاد
اسلامی کیلئے بھرپور کوشش کی ہیں۔ ہمارے ان ہی علماء میں سے ایک آیت اللہ کا شیفہ انظاء ہیں
جنھوں نے قابل قدر سیاسی و سماجی خدمات انجام دی ہیں۔ مسئلہ میں جب آیت اللہ
کا شیفہ انظاء موقر عالم اسلامی میں شرکت کے لیے القدس الشریف پہنچے تو موتمر کے بیشتر مندوبین
نے آپ کی اقتدا میں مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی تھی۔ (ناشر)

لے یہ الہدایہ کے مؤلف شیخ الاسلام برہان الدین علی بن ابی بکر الرغینانی (۵۹۳ھ) ہیں۔

زمختری نے اپنی کتاب ریح الاربار میں لکھا ہے کہ

”مناویہ بن ابی سفیان نے سب سے پہلے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شروع
کی جو خلاف سنت ہے“

لہذا ہم معاویہ کے طرفدار سے اتنا ہی عرض کریں گے کہ

اتنی نہ بڑھا پاکی دامن کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندہ قہا دیکھ

اور ابن تیمیہ کہتے ہیں : بعض فقہار کا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مستحب شیعوں کا شعار

بن جائے تو اس مستحب کو ترک کر دینا بہتر ہے گو ترک کرنا واجب نہیں۔ کیونکہ اس مستحب پر عمل میں بہ ظاہر شیعوں سے مشابہت ہے۔ سننیوں اور رافضیوں میں فرق کی مصلحت مستحب پر عمل کی مصلحت سے زیادہ قوی ہے۔ ۱۷

حافظ عراقی سے جب یہ پوچھا گیا کہ تحت الحنک کس طرف کیا جاتے ؟ تو انھوں نے کہا کہ

مجھے کوئی ایسی دلیل نہیں ملی جس سے داہنی طرف کی تعیین ہوتی ہو، سوائے اس کے طہرائی کے یہاں ایک ضعیف حدیث ضرور ہے، لیکن اگر یہ ثابت بھی ہو تو شاید آپ داہنی طرف لٹکا کر باتیں طرف لپیٹ لیتے ہوں جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں مگر چونکہ یہ شیعوں کا شعار بن گیا ہے، اس لیے تشبہ سے بچنے کے لیے اس سے احتراز ہی مناسب ہے۔ ۱۸

شیحان اللہ ! یہ اندھا تعصب ملاحظہ ہو۔ یہ علماء کیسے سنت رسول ص کی مخالفت کی اجازت صرف اس بنا پر دیتے ہیں کہ اس پر شیعوں نے پابندی سے عمل کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ ان کا شعار بن گئی ہے۔ پھر دیدہ دلیری دیکھیے

۱۷ کہا جاتا ہے کہ برطانوی سامراج نے جب سرزمینِ حجاز میں ”وہابی تحریک“ کا آغاز کیا تو انھوں نے۔ مستشرقین کی تجویز کے بموجب جو اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس تحریک کے ذریعہ، ابوالعباس تقی الدین احمد بن عبدالحلیم المعروف بہ ابن تیمیہ حجازی کے انکار و نظریات کو فروغ دیا کیونکہ وہ اپنے انکار و نظریات کی بنا پر مطعون تھا لیکن بیسویں صدی کے لوگوں نے اسے ”مجدد“ اور ”مصلح“ کا خطاب دے دیا۔ (ناشر)

۱۸ منہاج السنۃ النبویہ ابن تیمیہ۔

۱۹ شرح المواہب، زرقانی۔

کہ وہ اس بات کا علانیہ اعتراف کرتے ہوئے بھی ذرا نہیں شرماتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ شکر خدا کہ ہر صاحب بصیرت اور بخوبی حقیقت پر حق واضح ہو گیا۔ سنت کا نام لینے والا دیکھ لو سنت کا دامن کس نے تھاما ہوا ہے۔

الحمد للہ کہ ظاہر ہو گیا کہ یہ شیعہ ہی ہیں جو سنت رسول کا اتباع کرتے ہیں جس کی گواہی تم خود دے رہے ہو۔ اور تم خود ہی اس کے بھی اقرار ہی مجرم ہو کہ تم نے سنت رسول کو عمداً اور دیدہ و دانستہ محض اس لیے چھوڑ دیا تاکہ تم اہل بیت اور ان کے شیعیان با اخلاص کی روش کی مخالفت کر سکو۔ تم نے معاویہ بن ابی سفیان کی سنت اختیار کر لی جس کے شاہد عادل امام زنجبیری ہیں جو کہتے ہیں کہ سنت رسول کے برخلاف سب سے پہلے باتیں ہاتھ میں انگوٹھی معاویہ بن ابی سفیان نے پہنی تھی۔ تم نے باجماعت ترویج کی بدعت میں سنت عمر کی پیروی کی۔ حالانکہ جیسا کہ صیح بخاری میں ہے مسلمانوں کو نافلہ نمازیں گھر میں فرادنی پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے خود اعتراف کیا تھا کہ یہ نماز بدعت ہے :

”بخاری میں عبدالرحمن بن عبدالقاری سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ماہ رمضان میں ایک دن رات کے وقت، میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد کی طرف گیا تو وہاں دیکھا کہ لوگ متفرق طور پر نماز پڑھ رہے ہیں۔ کہیں کوئی اکیلا ہی نماز پڑھ رہا تھا اور کہیں چند لوگ مل کر۔ عمرؓ نے کہا کہ میرے خیال میں یہ بہتر ہو گا کہ میں ایسا انتظام کر دوں کہ یہ سب ایک قاری کے پیچھے نماز پڑھیں۔ چنانچہ عمرؓ نے ایسا ہی کیا اور ابی بن کعب کو امام مقرر کر دیا۔ ایک رات پھر میں عمرؓ کے ساتھ گیا۔ اُس وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر عمرؓ نے کہا : کتنی اچھی بدعت ہے یہ ۱۷

عمرؓ جب آپ نے یہ بدعت شروع کی تھی تو آپ خود کیوں اس میں شریک نہیں ہوئے ؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب آپ ان کے امیر تھے تو آپ بھی ان کے

۱۷ صیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۹۹ باب ما یؤثر من النصب والشدۃ لا یر اللہ عز وجل۔

۱۸ صیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۲۵۲ کتاب صلاۃ التراويح۔

”علیؑ کا مجھ سے وہی تعلق ہے جو میرا میرے پروردگار سے ہے۔“
یعنی جس طرح کہ تنہا محمدؐ ہی وہ شخص تھے جو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے تھے
ایسے ہی تنہا علیؑ وہ شخص تھے جو رسول اللہؐ کا پیغام پہنچاتے تھے۔

علیؑ کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے اپنے سے سابق خلفاء کی خلافت تسلیم نہیں
کی اور شیعوں کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں علیؑ کی پیروی کی اور
ابوبکر، عمرؓ اور عثمان کے جھنڈے تلے جمع ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی سے اہل سنت
انھیں ”رافضی“ یعنی منکر کہنے لگے۔

اگر اہل سنت شیعہ عقائد اور شیعہ اقوال کا انکار کرتے ہیں، تو اس کے
دو سبب ہیں :

پہلا سبب تو وہ دشمنی ہے جس کی آگ اموی حکمرانوں نے جھوٹے پروپیگنڈے
اور منکھرت روایات کے ذریعے سے بھڑکانی تھی۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اہل سنت جو خلفاء کی تائید کرتے ہیں اور ان کی غلطیوں
اور ان کے اجتہادات کو صیح ٹھہراتے ہیں، خصوصاً اموی حکمرانوں کی غلطیوں کو جن میں
معاویہ کا نام سرفہرست ہے شیعہ عقائد ان کے اس طرز عمل کے منافی ہیں۔

جو شخص واقعات کا تتبع کرے گا، اس پر واضح ہو جائے گا کہ شیعہ، سنی
اختلافات کی دان بیل تو سقیفہ کے دن ہی پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد اختلافات کی خلیج
براہرویہم ہوتی چلی گئی۔ بعد میں جو بھی اختلاف پیدا ہوا اس کی اصل سقیفہ کا واقعہ
ہی تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ شیعوں کے وہ سب عقائد جن پر اہل سنت
اعتراض کرتے ہیں، ان کا خلافت کے معاملے سے گہرا تعلق ہے اور ان سب کی جڑ خلافت
ہے۔ مثلاً: ائمہ کی تعداد، امام کا منصوص ہونا، ائمہ کی عصمت، ان کا علم ہدایہ
لغیہ، مہدی منتظر وغیرہ

اگر ہم طرفین کے اقوال پر غیر جذباتی ہو کر غور کریں تو ہمیں طرفین کے عقائد میں
بہت زیادہ بُعد نظر نہیں آئے گا اور نہ ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کا کوئی جواز ملے گا کیونکہ
گو جب آپ اہل سنت کی وہ کتابیں پڑھتے ہیں جن میں شیعوں کو گالیاں دی گئی ہیں
تو آپ کو ذرا دیر کے لیے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شیعہ اسلامی اصولوں اور اسلامی احکام

ساتھ نماز پڑھتے۔ یہ کیا کہ آپ ان کا تماشا دیکھنے نکل کھڑے ہوتے؟ آپ کہتے ہیں کہ
یہ اچھی بدعت ہے۔ یہ اچھی کیسے ہو سکتی ہے جب رسول اللہؐ نے اس سے اس وقت
منع کر دیا تھا جب لوگوں نے آپ کے دروازے پر جمع ہو کر شور مچایا تھا کہ آپ اگر
نافلہ رمضان پڑھادیں۔ اس پر رسول اللہؐ غصے میں بھرے ہوئے نکلے اور آپ نے
فرمایا: ”مجھے اندیشہ تھا کہ یہ نماز تم پر فرض ہو جائے گی۔ جاؤ، اپنے گھروں میں جا کر
نماز پڑھو۔ فرض نمازوں کے علاوہ ہر نماز آدمی کے لیے گھر میں پڑھنا ہی بہتر ہے۔“
تم نے سفر کی حالت میں پوری نماز پڑھنے کی بدعت میں عثمان بن عفان
کی سنت کی پیروی کی ہے۔ تمہارا یہ عمل سنت رسولؐ کے خلاف ہے۔ کیونکہ رسول اللہؐ
تو سفر میں قصر نماز پڑھا کرتے تھے لیہ

اگر میں وہ سب مثالیں گمانے لگوں جہاں تم نے سنت رسولؐ کے خلاف طریقہ
اختیار کیا ہے تو اس کے لیے ایک پوری کتاب کی ضرورت ہوگی۔ لیکن تمہارے خلاف
تو تمہاری اپنی شہادت ہی کافی ہے جو تمہارے اپنے اقرار پر مبنی ہے۔ تم نے
یہ بھی اقرار کیا ہے کہ یہ شیعہ رافضی ہیں جو سنت رسولؐ کو اپنا شعار بنائے ہوئے
ہیں!

کیا اس کے بعد بھی ان جاہلوں کی تردید کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہے جو
یہ کہتے ہیں کہ شیعہ علی بن ابی طالبؑ کا اتباع کرتے ہیں اور اہل سنت رسول اکرمؐ کا؟
کیا یہ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علیؑ، رسول اللہؐ کے مخالف تھے اور
انھوں نے کوئی نیا دین ایجاد کیا تھا؟ کیسی سخت بات ان کے منہ سے نکلتی ہے۔
علیؑ تو سب سے پہلے شیعہ رسول تھے۔ وہ سنت رسولؐ کے شارح تھے اور سنت پر
سنحتی سے قائم تھے۔ ان کے تعلق رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ
عَلِيٌّ مَوْجِيٌّ بِمَا نَزَلَ لِي مِنْ رَّبِّي . ۱۰

۱۰ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۳۵ وَكَذَلِكَ تَأَوَّلَتْ عَائِشَةُ فَصَلَّتْ آدْبَعًا ص ۳۶

۱۱ ابن جریر مسقلائی، لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۱۶۱ - محبت طبری، ذخائر العقبیٰ صفحہ ۶۴
نور اللہ حبیبی مرعشی، اخلاق الحق جلد ۱ صفحہ ۲۱۷

احتمقانہ اور غلط بات تو یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ نبی غلطی کرتا ہے اور اس کی اصلاح دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

عصمت از روئے قرآن

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ
الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا

اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اے اہل بیت تم سے رجس کو دور رکھے اور تمہیں خوب پاک و پاکیزہ رکھے۔ (سورۃ احزاب - آیت ۳۳)
اگر رجس سے دور رکھنے کے معنی سب برائیوں اور گناہوں سے حفاظت ہے تو کیا اس کا مطلب عصمت نہیں؟ ورنہ پھر اس کا مطلب اور کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ
تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ

جو لوگ متقی ہیں، جب انہیں کوئی شیطانی خیال ستاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں جس سے انہیں یکایک صبح راستہ سمجھائی دینے لگتا ہے۔ (سورۃ اعراف - آیت ۲۰۱)

جب شیطان کسی متقی شخص کو بہکانا اور گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اگر وہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ اسے شیطان کے دایم فریب سے بچا لیتا ہے اور اسے راہ حق دکھا دیتا ہے جس پر وہ چل پڑتا ہے۔ جب عام مومن کی یہ صورت ہے تو ان لوگوں کا کیا کہنا جو اللہ کے چنیدہ بندے ہیں جنہیں اللہ نے ہر آلودگی سے پاک رکھا ہے۔
ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا

پھر ہم نے وارث بنا دیا کتاب کا ان کو جنہیں ہم نے اپنے

(سورۃ فاطر - آیت ۳۲)

بندوں میں سے چن لیا۔
جسے اللہ چننے کا وہ بلا شک معصوم عن الخطا ہوگا۔ خاص اسی آیت سے

کے مخالف ہیں اور انہوں نے کوئی نیا دین گھڑا ہوا ہے۔ حالانکہ جو بھی مُتصِف مزاج شخص شیعہ عقائد پر غور کرے گا وہ ان کی اصل قرآن و سنت میں پائیگا حتیٰ کہ جو مخالفین ان عقائد پر اعتراض کرتے ہیں خود ان کی کتابوں سے بھی ان ہی عقائد کی تائید ہوتی ہے۔ پھر ان عقائد میں کوئی بات خلاف عقل و نقل اور مُنافی اخلاق نہیں ہے! آئیے ان عقائد پر ایک نظر ڈالیں تاکہ میرے دعوے کی صحت ظاہر ہو جائے اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ مخالفین کے اعتراضات دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں!

ائمہ کی عصمت

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ نبی کی طرح امام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ تمام ظاہری اور باطنی برائیوں سے بچپن سے لے کر موت تک محفوظ رہے۔ اس سے عہد یا سہواً کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور بھول چوک اور خطا سے محفوظ ہو۔ کیونکہ ائمہ شریعت کے نگران اور محافظ ہیں اور اس لحاظ سے ان کی حیثیت وہی ہے جو نبی کی ہے۔ جس دلیل کی رو سے ہمارے لیے انبیاء کے معصوم ہونے کا اعتقاد ضروری ہے، اُسی دلیل کی رو سے ہمارے لیے ائمہ کے معصوم ہونے کا عقیدہ بھی ضروری ہے۔ اس معاملے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہ عصمت کے بارے میں شیعوں کی رائے ہے۔ لیکن کیا اس میں کوئی ایسی بات ہے جو قرآن و سنت کے منافی ہو یا عقلاً محال ہو یا جس سے اسلام پر حرف آتا ہو اور اس کے شایان شان نہ ہو یا جس سے کسی نبی یا امام کی قدر و منزلت میں فرق آتا ہو؟ ہرگز نہیں!

بلکہ اس عقیدے سے تو کتاب و سنت کی تائید ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ عقل سلیم کے عین مطابق ہے اور اس سے نبی اور امام کی شان میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۔ شیخ محمد رضا مظفر عقائد اہل مابینہ صفحہ ۶۷ - یہ کتاب جامع تعلیمات اسلامی نے مکتب نشتیغ کے نام سے شائع کر دی ہے۔

امام رضاؑ نے ان علماء کے سامنے استدلال کیا تھا جنھیں عباسی خلیفہ مامون نے جمع کیا تھا۔ امام رضاؑ نے یہ ثابت کیا تھا کہ اس آیت میں چُنیدہ بندوں سے مراد ائمہ اہل بیت ہی ہیں جنھیں اللہ نے کتاب کا وارث بنایا ہے۔ جو علماء وہاں موجود تھے انھوں نے امام کی یہ بات تسلیم کر لی تھی یہ

یہ قرآن کریم سے بعض شائیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جن سے ائمہ کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔ جیسے شَلَّا اَيْمَةً يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وغیرہ۔ لیکن ہم بہ نظر اختصار اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

عصمت از رُئی حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

لوگو! میں تمہارے درمیان وہ چیزیں چھوڑ رہا ہوں کہ جب تک تم ان سے بچو رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، اور وہ ہیں اللہ کی کتاب اور میری عمرت یعنی میرے اہل بیت علیہ السلام جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ حدیث ائمہ اہل بیت کے معصوم ہونے کے بارے میں صریح شہادت ہے :

اولاً : اس لیے کہ اللہ کی کتاب معصوم ہے، اس میں باطل کا کس طرف سے کوئی دخل نہیں کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے اور جو اس میں شک کرے، وہ کافر ہے۔ ثانیاً : اس لیے کہ جو کتاب اور عمرت کو تھامے رہے، وہ گمراہی سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کتاب و عمرت میں غلطی کی گنجائش نہیں۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے جو اس پر

سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جس نے گریز کیا وہ ڈوب گیا۔ ۱۷ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، اس حدیث میں تصریح ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام معصوم ہیں، اس وجہ سے جو ان کی کشتی میں سوار ہو جائے گا وہ نجات پا جائے گا اور جو پیچھے رہ جائے گا، گمراہی کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

جو میری طرح کی زندگی چاہتا ہے اور میری طرح مرنا چاہتا ہے

اور اس جنت النجۃ میں جانا چاہتا ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے

وعدہ کیا ہے، تو وہ علیؑ سے اور ان کے بعد ان کی اولاد سے دوستی

رکھے۔ اس لیے کہ وہ تمہیں ہدایت کے دروازے سے باہر نکلنے نہیں

دیں گے اور گمراہی کے دروازے میں گھسنے نہیں دیں گے۔ ۱۸

اس حدیث میں تصریح ہے کہ ائمہ اہل بیت جو علیؑ اور اولاد علیؑ ہیں وہ معصوم عن الخطا ہیں کیونکہ جو لوگ ان کا اتباع کریں گے وہ انھیں گمراہی کے دروازے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ ظاہر ہے کہ جو خود غلط کر سکتا ہے وہ دوسروں کو ہدایت کیسے کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

اَنَا الْمُنْذِرُ وَعَلَىٰ الْهَادِي وَبِكَ يَا عَلِيُّ يَهْتَدِي

الْمُهْتَدُونَ مِنْ بَعْدِي .

میں ڈرانے والا ہوں اور علیؑ ہدایت دینے والے ہیں۔ اے

علیؑ! ہدایت کے طالب میرے بعد تم سے ہدایت حاصل کریں گے ۱۹

۱۷ مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۴۳ - کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۹۵ - صواعق محرقہ صفحہ ۱۸۴

۱۸ کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۵۵ - مجمع الزوائد جلد ۹ صفحہ ۱۰۸ - تاتاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۹۹ - مستدرک حاکم

جلد ۳ صفحہ ۱۲۸ - حلیۃ الاولیاء جلد ۲ صفحہ ۳۴۹ - احقاق الحق جلد ۵ صفحہ ۱۰۸

۱۹ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۸ - رازی، تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۲۴ - ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم جلد ۲ صفحہ ۵۲

شروکانی، تفسیر نوح القدر جلد ۳ صفحہ ۷ - سیوطی، تفسیر درثور جلد ۴ صفحہ ۴۵ - حکانی، شواہد التنزیل جلد ۱ صفحہ ۲۹۳ -

۱۷ ابن عبید بن عبد اللہ العقیل الفرید جلد ۳ صفحہ ۴۲

۱۸ محمد بن عیسیٰ ترمذی جامع الترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۸

اجتماع اور غلط بات تو یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ نبی غلط کرتا ہے اور اس ل
اصلاح دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

عصمت از روئے قرآن

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :
اِنَّمَّا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ
الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا
اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ اہل بیت تم سے رِجس کو دور
رکھے اور تمہیں خوب پاک و پاکیزہ رکھے۔ (سورہ آزاب- آیت ۳۳)
اگر رِجس سے دور رکھنے کے معنی سب برائیوں اور گناہوں سے حفاظت ہے
تو کیا اس کا مطلب عصمت نہیں ؟ ورنہ پھر اس کا مطلب اور کیا ہے ؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :
اِنَّ الَّذِيْنَ اَتَقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ
تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُبْصِرُوْنَ

جو لوگ متقی ہیں، جب انہیں کوئی شیطانی خیال ستاتا
ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں جس سے انہیں یکایک صبح راستہ
(سورہ اعراف- آیت ۲۰۱)

سمجھاتی دینے لگتا ہے۔ شیعہ شخص کو بہکانا اور گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اگر وہ اللہ
کو یاد کرتا ہے تو اللہ اسے شیطان کے دام فریب سے بچالیتا ہے اور اسے راہِ حق دکھا
دیتا ہے جس پر وہ چل پڑتا ہے۔ جب عام مومن کی یہ صورت ہے تو ان لوگوں کا
کیا کہنا جو اللہ کے چنیدہ بندے ہیں جنہیں اللہ نے ہر آلودگی سے پاک رکھا ہے۔
ثُمَّ اَوْفَدْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا

پھر ہم نے وارث بنا دیا کتاب کا ان کو جنہیں ہم نے اپنے
(سورہ فاطر- آیت ۳۲)

بندوں میں سے چُن لیا۔
جسے اللہ چُنے گا وہ بلا شک مَعْصُوْمٌ عَنِ الْخَطَا ہوگا۔ خاص اسی آیت سے
۲۲۳

کے مخالف ہیں اور انہوں نے کوئی نیا دین گھڑا ہوا ہے۔ حالانکہ جو بھی مُنصف مزاج
شخص شیعہ عقائد پر غور کرے گا وہ ان کی اصل قرآن و سنت میں پائیکا حتیٰ کہ جو مخالفین
ان عقائد پر اعتراض کرتے ہیں خود ان کی کتابوں سے بھی ان ہی عقائد کی تائید ہوتی
ہے۔ پھر ان عقائد میں کوئی بات خلاف عقل و نقل اور منافی اخلاق نہیں ہے !
آئیے ان عقائد پر ایک نظر ڈالیں تاکہ میرے دعوے کی صحت ظاہر ہو جائے اور
آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ مخالفین کے اعتراضات دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ
نہیں !

ائمہ کی عصمت

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ نبی کی طرح امام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ
تمام ظاہری اور باطنی برائیوں سے بچیں سے لے کر موت تک محفوظ رہے۔ اس سے عدا
یا سبھو کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور بھول چوک اور خطا سے محفوظ ہو۔ کیونکہ ائمہ
شریعت کے نگراں اور محافظ ہیں اور اس لحاظ سے ان کی حیثیت وہی ہے جو نبی
کی ہے۔ جس دلیل کی رو سے ہمارے لیے انبیاء کے معصوم ہونے کا اعتقاد ضروری
ہے، اُسی دلیل کی رو سے ہمارے لیے ائمہ کے معصوم ہونے کا عقیدہ بھی ضروری
ہے۔ اس معاملے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہ عصمت کے بارے میں شیعوں کی رائے ہے۔ لیکن کیا اس میں کوئی ایسی
بات ہے جو قرآن و سنت کے منافی ہو یا عقلاً محال ہو یا جس سے اسلام پر حرف
آتا ہو اور اس کے شایانِ شان نہ ہو یا جس سے کسی نبی یا امام کی قدر و منزلت
میں فرق آتا ہو ؟ ہرگز نہیں !
بلکہ اس عقیدے سے تو کتاب و سنت کی تائید ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ عقل
سلیم کے عین مطابق ہے اور اس سے نبی اور امام کی شان میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۔ شیخ محمد رضا مظفر عقائد الإمامیہ صفحہ ۶۷ - یہ کتاب جامع تعلیمات اسلامی نے مکتبہ نشتیج کے نام
سے شائع کر دی ہے۔

امام رضاؑ نے ان علماء کے سامنے استدلال کیا تھا جنہیں عباسی خلیفہ مائون نے جمع کیا تھا۔ امام رضاؑ نے یہ ثابت کیا تھا کہ اس آیت میں چنیدہ بندوں سے مراد ائمہ اہل بیت ہی ہیں جنہیں اللہ نے کتاب کا وارث بنایا ہے۔ جو علماء وہاں موجود تھے انہوں نے امام کی یہ بات تسلیم کر لی تھی۔

یہ قرآن کریم سے بعض شائیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جن سے ائمہ کی عصمت ثابت ہوتی ہے۔ جیسے **مَثَلًا لِّآئِمَّةٍ يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا** وغیرہ۔ لیکن ہم بہ نظر اختصار اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

عصمت از روئے حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

لوگو! میں تمہارے درمیان وہ چیزیں چھوڑ رہا ہوں کہ جب تک تم ان سے جڑے رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، اور وہ ہیں اللہ کی کتاب اور میری بعثت یعنی میرے اہل بیت علیہم السلام جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ حدیث ائمہ اہل بیت کے معصوم ہونے کے بارے میں صریح شہادت ہے :

أَوَّلًا : اس لیے کہ اللہ کی کتاب معصوم ہے، اس میں باطل کا کسی طرف سے کوئی دخل نہیں کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے اور جو اس میں شک کرے، وہ کافر ہے۔ **ثَانِيًا :** اس لیے کہ جو کتاب اور بعثت کو تھامے رہے، وہ گمراہی سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کتاب و بعثت میں غلطی کی گنجائش نہیں۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے جو اس پر

۱۔ ابن عبید بن جریج القندری جلد ۳ صفحہ ۲۲

۲۔ محمد بن عیسیٰ ترمذی جامع الترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۸

۲۲۲

سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جس نے گریز کیا وہ ڈوب گیا۔" لہٰذا جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، اس حدیث میں تصریح ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام معصوم ہیں، اس وجہ سے جو ان کی کشتی میں سوار ہو جائے گا وہ نجات پا جائے گا اور جو پیچھے رہ جائے گا، گمراہی کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

جو میری طرح کی زندگی چاہتا ہے اور میری طرح مرنا چاہتا ہے اور اس جنتِ النخل میں جانا چاہتا ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، تو وہ علیؑ سے اور ان کے بعد ان کی اولاد سے ہوتی رکھے۔ اس لیے کہ وہ تمہیں ہدایت کے دروازے سے باہر نکلے نہیں دیں گے اور گمراہی کے دروازے میں گھسنے نہیں دیں گے۔

اس حدیث میں تصریح ہے کہ ائمہ اہل بیت جو علیؑ اور اولاد علیؑ ہیں وہ معصوم عن الخطا ہیں کیونکہ جو لوگ ان کا اتباع کریں گے وہ انہیں گمراہی کے دروازے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ ظاہر ہے کہ جو خود غلطی کر سکتا ہے وہ دوسروں کو ہدایت کیسے کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

أَنَا الْمُنْتَدَرُ وَعَلَىٰ نَا الْهَادِي وَبِكَ يَا عَلِيُّ يَهْتَدِي الْمُهْتَدُونَ مِنْ بَعْدِي.

میں ڈرانے والا ہوں اور علیؑ ہدایت دینے والے ہیں۔ اے علیؑ! ہدایت کے طالب میرے بعد تم سے ہدایت حاصل کریں گے۔

۱۔ مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۲۲۳ - کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۹۵ - صواعق محرقہ صفحہ ۱۸۲

۲۔ کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۵۵ - مجمع الزوائد جلد ۹ صفحہ ۱۰۸ - تاریخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۹۹ - مستدرک حاکم

جلد ۳ صفحہ ۱۲۸ - جلیۃ الاولیاء جلد ۲ صفحہ ۳۲۹ - احقاق الحق جلد ۵ صفحہ ۱۰۸

۳۔ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۸ - رازی، تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۲۷۱ - ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم جلد ۵ صفحہ ۵۲ - شروکانی، تفسیر فتح القدر جلد ۳ صفحہ ۷۱ - سیوطی، تفسیر درمثور جلد ۲ صفحہ ۲۵ - حکمان، شراہ التذیل جلد ۱ صفحہ ۲۹۳ -

اہل نظر پر مخفی نہیں کہ اس حدیث میں بھی عصمتِ امام کی تصریح ہے۔ امام علیؑ نے خود بھی اپنے معصوم ہونے اور اپنی اولاد میں سے دوسرے ائمہ کے معصوم ہونے کی تصریح کی ہے۔ آپ نے کہا :

”تم کہاں جا رہے ہو اور تمہیں کدھر موڑا جا رہا ہے ؟ حالانکہ ہدایت کے پرچم اڑ رہے ہیں ، نشانیاں صاف اور واضح ہیں ، منارۂ نور ایستادہ ہے تم کہاں بھٹک رہے ہو اور کیوں بہک رہے ہو ؟ نبیؐ کی عزت تمہارے درمیان موجود ہے ، جو حق کی باگ ڈور ہیں ، دین کے نشان ہیں اور سچائی کی زبان ہیں ۔ جو قرآن کی بہتر سے بہتر منزل سمجھ سکو ، وہیں ان کو بھی جگہ دو ۔ ان کی طرف اس طرح دوڑو جیسے پیاسے پانی کی طرف دوڑتے ہیں ۔

لے لوگو ! خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کو سنو کہ (انھوں نے فرمایا) :

ہم میں سے جو مرتا ہے وہ مرتو جاتا ہے مگر مردہ نہیں ہوتا ۔ ہم میں سے جو بظاہر مر کر بوسیدہ ہو جاتا ہے ، وہ درحقیقت کبھی بوسیدہ نہیں ہوتا ۔ تم وہ بات نہ کہو جو تمہیں معلوم نہیں ۔ کیونکہ اکثر وہی بات صحیح ہوتی ہے جس کا تم انکار کرتے ہو ۔ جس کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل نہ ہو اسے معذور سمجھو ۔ اور میں ایسا ہی شخص ہوں ۔ کیا میں نے تمہارے درمیان ثقلِ اکبر (قرآن) پر عمل نہیں کیا ؟ اب میں تمہارے درمیان ثقلِ اصغر چھوڑ رہا ہوں میں نے تمہارے درمیان ایمان کا جھنڈا گاڑ دیا ہے ”

کیا ان تمام آیاتِ قرآنی ، احادیثِ نبوی اور اقوالِ علیؑ کے بعد بھی عقل

ان ائمہ کی عصمت کا انکار کر سکتی ہے جنہیں اللہ نے چنیدہ و برگزیدہ قرار دیا ہے ۔ جواب یہ ہے کہ نہیں ، ہرگز نہیں ۔ بلکہ عقل تو یہ کہتی ہے کہ ان کی عصمت ایک حتمی اور لائبرڈی آئمہ ہے ۔ اس لیے کہ انسانوں کی قیادت و ہدایت کا منصب جن کے سپرد کیا گیا ہو ممکن نہیں کہ وہ معمولی انسان ہوں ، جو بھول چوک اور غلطی کا شکار ہوتے ہوں اور جن کی پیٹھ پر گناہوں کی گٹھڑی لدی ہوئی ہو جن پر لوگ نکتہ چینی کرتے ہوں ، عیب لگاتے ہوں اور کھڑے نکالتے ہوں ، بلکہ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عالم ، سب سے زیادہ نیک ، سب سے زیادہ بہادر اور سب سے بڑھ کر متقی اور پرہیزگار ہوں کہ رض

یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

یہی وہ صفات ہیں جن سے قائد کی شان بڑھتی ہے ، لوگوں کی نگاہ میں اس کی عزت و عظمت میں اضافہ ہوتا ہے ، سب اس کا احترام کرتے ہیں اور پھر دل و جان سے ، کسی بچکا ہٹ اور خوشامد کے بغیر ، اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں ۔ جب یہ بات ہے تو پھر اس کے ماننے والوں کے خلاف یہ طعن و تشنیع کیوں اور یہ شور و غوغا کیسا ؟ !

اس سلسلے میں اہلسنت نے شیعوں پر جو تنقید کی ہے اگر وہ آپ نہیں اور پڑھیں تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا شیعہ جس کو چاہتے ہیں تمہارے عصمت پہناتے ہیں ، یا جو عصمت کا قائل ہے وہ کوئی کلمہ کفر منہ سے نکال رہا ہے یا گویا وہ معصوم کے متعلق کہہ رہا ہے کہ یہ ایسا دیوتا ہے کہ نہ اس کو اُونگھ آتی ہے نہ نیند ۔ درحقیقت ایسی کوئی بھی بات نہیں ۔

عصمتِ ائمہ نہ کوئی عجیب و غریب بات ہے نہ محال و ناممکن ۔ شیعوں کے نزدیک عصمت کے معنی فقط یہ ہیں کہ معصوم اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت و حفاظت میں ہوتا ہے کہ شیطان اس کو درغلا نہیں سکتا اور نفسِ آمارہ اس پر غلبہ پا نہیں سکتا کہ اسے معصیت کی طرف کھینچ لے جائے ۔ یہ وہ بات ہے جس سے اللہ کے دوسرے متقی بندے بھی محروم نہیں ۔ ابھی یہ آیت گزر چکی ہے : اِنَّ الَّذِیْنَ اَلْفَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّیْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ بِحُجْرٍ ۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا

اقبال

ترے دُجو کے مرکز سے دور رہتا ہے

۵۰ بیخِ البلاغہ خطبہ ۸۵

مگر عام اہل تقویٰ کی یہ عصمت وقتی اور عارضی ہوتی ہے اور اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہوتا ہے۔ اگر بندہ تقویٰ کی کیفیت سے دور ہٹ جائے تو اللہ تعالیٰ پھر اسے گناہوں سے محفوظ نہیں رکھتا مگر امام جیسے اللہ منتخب کرتا ہے کسی حالت میں بھی تقویٰ اور خوفِ خدا کی راہ سے بال برابر بھی نہیں سرکتا۔ ہمیشہ گناہوں اور خطاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت یوسفؑ کے قصے میں ہے :

وَلَقَدْ هَمَمْتُ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ .

اس عورت نے ان کا قصد کیا اور وہ بھی اگر اپنے پروردگار کی دلیل نہ دیکھ چکے ہوتے تو قصد کر بیٹھتے۔ پس ہم نے انھیں بچا لیا تاکہ ہم ان سے بُرائی اور بے حیائی کو دور رکھیں بیشک وہ ہمارے خاص بندوں میں سے تھے۔ (سورہ یوسف - آیت ۲۳)

واضح رہے کہ حضرت یوسفؑ نے ہرگز زنا کا قصد نہیں کیا تھا، کیونکہ معاذ اللہ اس قبیح فعل کا قصد انبیاء کی شان نہیں ہے۔ البتہ آپ نے اس عورت کو روکنے، دھکا دینے اور ضرورت ہو تو اس کو مارنے کا قصد ضرور کیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسی غلطی کے ارتکاب سے آپ کو بچا لیا۔ کیونکہ اگر یہ غلطی ہو جاتی تو آپ پر زنا کی کوشش کا الزام لگ جاتا اور ان لوگوں سے آپ کو نقصان پہنچتا۔

قرآن شریف میں آیا ہے :

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي .

میں اپنے نفس کی برائت کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ نفس تو بُرائی ہی سکھاتا رہتا ہے مگر یہ کہ جس پر پروردگار رحم کرے۔

(سورہ یوسف - آیت ۵۳)

جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اپنے دوستوں کو چُن لیتا ہے تو پھر

ان کو سکھاتا ہے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ اور ان کو بُرائی اور گندمی باتوں سے بچاتا ہے اور جب ان پر رحم کرتا ہے، تو انھیں کسی بُرائی میں ملوث نہیں ہونے دیتا۔ یہ سب اس لیے کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے ہر معنی میں خاص بندے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ تسلیم کرنا ہی نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص انخاص بندوں کو بُرائیوں سے بچاتا اور گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے تو وہ آزاد ہے، اس پر کوئی زبردستی نہیں۔ ہم اس کی رٹنے کا بھی احترام کرتے ہیں۔

لیکن ان کا بھی فرض ہے کہ وہ دوسروں کی رٹنے کا احترام کرے جو عصمتِ ائمہ کے قائل ہیں اور جن کے پاس اپنے دلائل ہیں۔ خواہ مخواہ انھیں بدنام کرنے کی کوشش نہ کرے۔ جیسا کہ ایک شخص نے کی تھی جو پیرس میں لکچر دینے آیا تھا، یا جیسا کہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اکثر علمائے اہل سنت کرتے ہیں جب وہ اپنی تحریروں میں اس موضوع کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ائمہ کی تعداد

شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ائمہ معصومین کی تعداد بارہ ہے۔ یہ تعداد نہ کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ۔ رسول اللہ نے ان ائمہ کی تعداد کے ساتھ ان کے نام بھی گنوائے ہیں لہٰذا ان کے نام یہ ہیں :

- ۱ - امام علی بن ابی طالبؑ
- ۲ - امام حسن بن علیؑ
- ۳ - امام حسین بن علیؑ
- ۴ - امام علی بن الحسینؑ (زین العابدین)
- ۵ - امام محمد بن علیؑ (باقر)
- ۶ - امام جعفر بن محمدؑ (صادق)
- ۷ - امام موسیٰ بن جعفرؑ (کاظم)

۸ - امام علی بن موسیٰ (رضا)

۹ - امام محمد بن علی (تقی)

۱۰ - امام علی بن محمد (نقی)

۱۱ - امام حسن بن علی (عسکری)

۱۲ - امام محمد بن حسن (مہدی منتظر)

یہ ہیں ائمہ اثنا عشر! جن کی عصمت کے شیعہ قائل ہیں۔

بعض افراد پر داز یہ کہہ کر کچھ مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ شیعہ اہل بیت کی عصمت کے قائل ہیں اور دیکھو شاہ حسین بادشاہ اردن بھی اہل بیت میں سے ہیں اور اسی طرح شاہ حسن ثانی بادشاہ مراکش بھی اہل بیت میں سے ہیں۔ اب تو کچھ لوگ یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ شیعہ امام خمینی کو بھی معصوم مانتے ہیں۔

یہ ہے مسخر اپنا، افتراء اور سفید جھوٹ۔ شیعہ علماء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تو درکنار، ایسی بات تو شیعہ عوام بھی نہیں کہتے۔ ان سخروں کی جب اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو وہ سوچتے ہیں کہ شاید اسی طرح وہ لوگوں کو، خصوصاً نوجوانوں کو جو اس قسم کے پروپیگنڈے پر آسانی سے یقین کر لیتے ہیں، شیعوں سے متنفر کر سکیں۔ شیعہ پہلے بھی اور آج بھی فقط ان ہی ائمہ کے معصوم ہونے کے قائل ہیں جن کے نام رسول اللہ نے اس وقت بتلادیے تھے جب وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، خود بعض علمائے اہل سنت نے ایسی روایات نقل کی ہیں جن میں ان ائمہ کے نام آئے ہیں۔ بخاری و مسلم نے اپنی صحیحین میں ائمہ کی تعداد سے متعلق حدیث نقل کی ہے جس کے مطابق ائمہ بارہ ہیں اور وہ سب قریش میں سے ہیں۔

ان احادیث کا مطلب اسی وقت ٹھیک بیٹھتا ہے جب ہم بارہ اہل بیت سے مراد وہ ائمہ اہل بیت لیں جن کے شیعہ قائل ہیں۔ ورنہ تو اہل سنت بتلاتے ہیں کہ

اس چیتان کا حل کیا ہے؟

اہل سنت نے اپنی صحاح میں ائمہ اثنا عشر والی احادیث تو نقل کی ہیں لیکن یہ آج تک معما ہے کہ ان سے مراد کون سے بارہ امام ہیں۔ مگر پھر بھی سنتوں کو یہ توفیق کہاں کہ وہ اس بات کو مان لیں جس کے شیعہ قائل ہیں۔

ائمہ کا علم

اہل سنت کا ایک اور اعتراض یہ ہے کہ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ ائمہ اہل بیت سلام اللہ علیہم کو اللہ تعالیٰ نے ایسا خصوصی علم عطا کیا ہے جس میں کوئی ان کا شریک و شہید نہیں ہے۔ اور یہ کہ امام اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم ہوتا ہے اس لیے یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص امام سے کوئی سوال کرے اور امام سے اس کا جواب بن نہ پڑے۔

تو کیا شیعوں کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے؟
ہم حسب معمول اپنی اس بحث کا آغاز بھی قرآن کریم سے کرتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا.

پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے ان کو کتاب کا وارث بنایا جن کو ہم نے چن لیا۔

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ نے اپنے کچھ بندوں کو چن لیا ہے اور انھیں کتاب کا وارث بنادیا ہے۔ کیا ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ چنیدہ بندے کون ہیں؟

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ امام علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ آیت ائمہ اہل بیت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ اس موقع کی بات ہے جب مامون نے چالیس مشہور قاضیوں کو جمع کیا تھا اور ان میں سے ہر قاضی نے ۴۰ سوال امام شامی کے لیے تیار کیے تھے۔ امام نے ان سب سوالوں

کے مُکیت جواب دیے اور بالآخر سب قاضیوں کو ان کی اعلیٰیت کا اعتراف کرنا پڑا۔

جس وقت ان قاضیوں اور امام کے درمیان یہ مناظرہ ہوا اور قاضیوں نے ان کی اعلیٰیت کا اقرار کیا، اس وقت امام کی عمر چودہ سال سے بھی کم تھی۔ پھر اگر شیخ ان ائمہ کی اعلیٰیت کے قائل ہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے جبکہ خود اہل سنت علماء بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں۔

اگر ہم قرآن کی تفسیر قرآن سے کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ متعدد آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ سُبحانہ نے اپنی حکمت بالغہ سے ائمہ اہل بیت کو وہ علم لدنی عطا کیا تھا جو ان ہی سے مختص تھا اور یہ ائمہ واقعی ہادیوں کے پیشوا اور اندھیروں کے چراغ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ۔
وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت عطا ہوگئی اسے بڑی نعمت عطا ہوگئی۔ اور نصیحت تو صاحبان عقل و فہم ہی قبول کرتے ہیں۔ (سورہ بقرہ - آیت ۲۶۹)

ایک اور جگہ ارشاد ہے :

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّو تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ۔

پس میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کی جگہ کی اور اگر تم سمجھو تو یہ ایک بڑی قسم ہے۔ واقعی یہ قابل احترام قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں جسے کوئی مَس نہیں کر سکتا مجازان کے جو پاک

کیے گئے ہیں۔“

(سورہ واقعہ - آیت ۷۵-۷۹)

اس آیت میں اللہ نے ایک بڑی قسم کھا کر کہا ہے کہ قرآن کریم میں ایسے باطنی اسرار ہیں جن کی حقیقت صرف ان کو معلوم ہے جو پاک کیے گئے ہیں۔ یہ بالکل حضرات اہل بیت ہیں جن سے اللہ نے ہر طرح کی آلودگی کو دُور رکھا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے متعلق کچھ باطنی علوم ہیں، جن کو اللہ سُبحانہ نے صرف ائمہ اہل بیت سے مختص کیا ہے۔ کسی دوسرے کو اگر ان علوم سے آگہی حاصل کرنا ہو تو فقط ان ائمہ کے واسطے سے ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ۔
وہ اللہ ہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری۔ اس کی بعض آیتیں محکم ہیں جو اس کتاب کا مدار ہیں اور بعض متشابہ ہیں۔ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو متشابہ ہے تاکہ فتنہ برپا کریں اور غلط مطلب نکالیں، جبکہ اس کا صحیح مطلب کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان لوگوں کے جو علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت تو عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

(سورہ آل عمران - آیت ۷)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے، اللہ سُبحانہ نے قرآن میں ایسے اسرار و رموز رکھے ہیں جن کی تاویل یا وہ خود جانتا ہے یا وہ لوگ جو علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں

جیسا کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے جو گزشتہ ادراک میں نقل کی جا چکی ہیں، علم میں دستگاہ کامل رکھنے والے یعنی راسخون فی العلم سے مراد اہل بیت رسول ہیں۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا ہے :

”ان سے آگے نہ بڑھو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی

نہ ہو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے اور انھیں پڑھانے کی کوشش نہ کرو

کہ یہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔“

امام علیؑ نے خود بھی کہا تھا :

”کہاں ہیں وہ جو یہ جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں کہ راسخون فی العلم

ہم نہیں وہ ہیں۔ وہ ہماری مخالفت اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے

ہمیں اونچا درجہ دیا ہے اور ان کو ادنیٰ درجہ۔ ہمیں اللہ نے منصب

امامت دیا اور ان کو محروم رکھا۔ ہمیں (زمرہ خواص میں) داخل

کیا اور ان کو باہر نکال دیا۔ ہم ہی ہیں جن سے ہدایت طلب

کی جاسکتی ہے اور جن سے بے بصیرتی دور کرنے کے لیے روشنی

مانگی جاسکتی ہے۔ بلاشبہ ائمہ قریش میں سے ہوں گے جو اسی

قبیلے کی ایک شاخ بنی ہاشم کی کشت زار سے ابھرے گئے۔ نہ

امامت کسی کو زیب دیتی ہے اور نہ کوئی اس کا اہل ہو سکتا ہے۔“

اگر ائمہ اہلبیت راسخون فی العلم نہیں، تو پھر کون ہے ؟ میرا تو یقین

ہے کہ اُمت میں سے آج تک ان سے بڑھ کر عالم ہونے کا دعویٰ کسی نے نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ .

اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھ لو۔

۱۔ صواعق مخرقہ صفحہ ۱۳۸ - دُرُغْثُور جلد ۲ صفحہ ۶۰ - کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۱۶۸ - اُسد الغابہ فی

معرفۃ الصحابہ جلد ۳ صفحہ ۱۳۷ -

۲۔ بیح البلاغہ خطبہ ۱۳۲ -

یہ آیت بھی اہل بیت کی شان میں نازل ہوئی تھی۔ ۱۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اُمت کے

لیے ضروری ہے کہ وہ حقائق معلوم کرنے کے لیے اہل بیت سے رجوع کرے۔ چنانچہ

صحابہ کو جب کوئی بات مشکل معلوم ہوتی تھی تو وہ اس کی وضاحت کے لیے امام

علیؑ سے رجوع کرتے تھے۔ اسی طرح عوامِ مَدَنی اہل بیت سے حلال و حرام

معلوم کرنے کے لیے رجوع کرتے رہے اور ان کے علوم و معارف کے چشموں سے فیضِ یاب

ہوتے رہے۔

ابو حنیفہؒ کہا کرتے تھے :

”اگر وہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہو گیا ہوتا۔“

یہ ان دو سالوں کی طرف اشارہ تھا جن کے دوران میں انھوں نے امام

جعفر صادقؑ سے تعلیم حاصل کی تھی۔

امام مالکؒ کہتے تھے کہ :

”علم و فضل، عبادت اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے جعفر صادقؑ

سے بہتر کوئی شخص نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا

اور نہ کسی کے تصور میں آیا۔“

جب ائمہ اہل سنت کے اعتراف کے بموجب یہ صورت ہو تو ان تمام لائل

کے باوجود شیعوں پر طعن و تشنیع کیوں ؟ جب اسلامی تاریخ سے ثابت ہے کہ ائمہ

اہل بیت اپنے زمانے میں علم میں سب سے برتر تھے، تو پھر اس میں حیرت کی کیا

بات ہے کہ اللہ سبحانہ نے اپنے ان اولیاء کو جنہیں اس نے چُن لیا تھا مخصوص حکمت

اور عِلْمِ لَدُنّی سے نوازا اور انھیں مومنین کا پیشوا اور مسلمانوں کا امام مقرر کر دیا۔

اگر مسلمان ایک دوسرے کے دلائل نہیں تو وہ ضرور اللہ اور رسول کے فرمان

۱۔ تفسیر طبری جلد ۱۴ صفحہ ۱۳۲ - تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۵۷۰ - تفسیر قرطبی جلد ۱۱ صفحہ ۲۷۷ -

۲۔ شبلی نعمانی، ہیئت نعمان -

۳۔ علامہ ابن شہر آشوب، مناقب آلِ ابی طالب حالات امام صادقؑ -

کو تسلیم کر لیں اور ایسی اُمت واحدہ بن جائیں جو ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہو، پھر نہ کوئی اختلاف ہے نہ تفرقہ، نہ مختلف نظریات و مذاہب، نہ مسالک۔ یہ سب ہوگا اور ضرور ہوگا اور جو ہونے والا ہے اس کے مطابق اللہ اپنا فیصلہ ضرور دے گا۔

”تاکہ جسے برباد ہونا ہو وہ کھلی نشانیاں آنے کے بعد برباد ہو اور جسے زندہ رہنا ہو وہ بھی کھلی نشانیاں آنے کے بعد زندہ رہے۔“
(سورۃ انفال - آیت ۳۸)

بَدَا

اس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی بات آئے جس کو کرنے کا ارادہ ہو پھر اس کی رٹے بدل جائے اور پہلے جس کام کا ارادہ تھا، وہ اس کے بجائے کچھ اور کر لے۔

اہل سنت شیعوں کو مطعون کرنے کے لیے بَدَا کا مطلب اس طرح لیتے ہیں کہ گویا یہ نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات میں جہل یا نقص کا۔ اور پھر کہتے ہیں کہ ”شیعہ اللہ تعالیٰ کے جہل کے قائل ہیں“

در اصل بَدَا کا یہ مطلب بالکل غلط ہے۔ شیعہ اس کے کبھی قائل نہیں ہے۔ اور جو شخص اس طرح کا عقیدہ ان سے منسوب کرتا ہے، وہ افتراء پر داری کرتا ہے۔ قدیم و جدید شیعہ علماء کے اقوال اس کے گواہ ہیں۔

شیخ محمد رضا مظفر اپنی کتاب عقائد الإمامیہ میں کہتے ہیں :
”اس معنی میں اللہ تعالیٰ کے لیے بَدَا محال ہے کیونکہ یہ نقص ہے اور اللہ تعالیٰ کی لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔ شیعہ اس معنی میں بَدَا کے ہرگز قائل نہیں۔“

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

”جو شخص یہ کہتا ہے کہ بَدَا کے معنی اِبْدَاءِ نَدَامَہ کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی کسی رٹے کو غلط پاکر اور اس پر نادم ہو کر

اپنی وہ رٹے بدل دیتا ہے تو ایسا شخص کافر ہے“
امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ

”جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بَدَا کی وجہ اس کی لاعلمی ہے، تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں“

بالفاظ دیگر شیعہ جس بَدَا کے قائل ہیں وہ اس قرآنی آیت کے حدود کے اندر ہے :

يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَعِنْدَهُ أُمْرُ الْكِتَابِ
اور اللہ جس حکم کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اس کے پاس ہے۔

(سورۃ رعد - آیت ۳۹)

اس بات کے اہل سنت بھی اسی طرح قائل ہیں جس طرح شیعہ۔ پھر شیعوں ہی پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے شیعوں پر کیوں نہیں۔ وہ بھی تو یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ احکام میں تغیر کر دیتا ہے، موت کا وقت بدل دیتا ہے اور رزق گھٹا بڑھا دیتا ہے۔

کیا کوئی پوچھنے والا اہل سنت سے پوچھ سکتا ہے کہ جب سب کچھ ازل سے اُم الکتاب میں لکھا ہوا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے مطابق یہ تغیر و تبدل کیوں کرتا رہتا ہے ؟

ابن مَرْدُوۡتِیہ اور ابن عساکر نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ :
حضرت علیؑ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَعِنْدَهُ أُمْرُ الْكِتَابِ کے
بارے میں دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : میں اس کا ایسا
مطلب بیان کروں گا کہ خوش ہو جاؤ گے اور میرے بعد میری امت
کی آنکھیں بھی اس سے ٹھنڈی ہوں گی۔ اگر صدقہ صبیح طریقے
سے دیا جائے، والدین کے ساتھ نیکی کی جائے، کسی پراچان کیا
جائے، تو یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ ان سے بد بختی خوش بختی

میں بدل جاتی ہے، عمر بڑھتی ہے اور بُری موت سے حفاظت
رہتی ہے۔“

ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے اور بیہقی نے شعب الایمان میں قیس بن عباد
رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَشْہَرُ حُرْمٍ میں سے ہر مہینے کی دسویں
تاریخ کی رات کو اللہ تعالیٰ کا ایک خاص معاملہ ہوتا ہے۔ جب
کی دسویں تاریخ کو اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا
باقی رکھتا ہے۔“

عبدالرحمن بن حمید، ابن جدیر اور ابن منذر نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے
روایت بیان کی ہے کہ

”عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا طواف کر رہے تھے اور کہتے جاتے
تھے کہ ”یا اہلبی! اگر تو نے میری قسمت میں کوئی بُرائی یا گناہ لکھا
ہو تو اسے مٹا دے اور اسے سعادت و مغفرت سے بدل دے۔ کیونکہ
تو جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور
تیرے ہی پاس اُمّ الکتاب ہے۔“

بخاری نے اپنی صحیح میں ایک عجیب و غریب قصہ بیان کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے دوران اپنے پروردگار سے ملاقات کا واقعہ بیان کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے
ہیں :

”اس کے بعد مجھ پر پچاس نمازیں فرض کر دی گئیں۔ میں چلتا ہوا
موسیٰؑ کے پاس آیا۔ انھوں نے پوچھا : کیا گزری ؟ میں نے کہا : مجھ
پر پچاس نمازیں فرض کر دی گئی ہیں۔ موسیٰؑ نے کہا : مجھے لوگوں کی
حالت کا آپ سے زیادہ علم ہے۔ مجھے بنی اسرائیل کو قابو میں لانے
میں بڑی محنت و شجاعت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مناسب یہ ہے

کہ آپ اپنے پروردگار کے پاس دوبارہ جائیے اور اس سے کچھ
تخفیف کی درخواست کیجیے۔

چنانچہ میں نے واپس جا کر تخفیف کی درخواست کی۔ اللہ تعالیٰ
نے چالیس نمازیں کر دیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس پہنچا تو انھوں
نے پھر وہی بات کہی۔ میں نے واپس جا کر پھر درخواست کی تو
تیس نمازیں ہو گئیں۔ پھر یہی کچھ ہوا تو بیس ہو گئیں پھر دس
ہوئیں۔ میں موسیٰؑ کے پاس گیا تو انھوں نے پھر وہی بات کہی
اب کے پانچ ہو گئیں۔ میں پھر موسیٰؑ کے پاس پہنچا، انھوں نے
پوچھا کہ کیا کیا ؟ میں نے کہا : اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں کر دیں
موسیٰؑ نے پھر وہی بات کہی۔ اس مرتبہ جو میں نے سلام کیا تو
آواز آئی : ”اب میں نے اپنے فریضہ کے بارے میں نچتہ حکم دے
دیا ہے۔ میں نے اپنے بندوں کا بوجھ کم کر دیا ہے اور میں ہر نیکی
کا دس گنا اجر دوں گا۔“

بخاری ہی میں ایک اور روایت ہے۔ اس میں ہے کہ :
”کئی مرتبہ کی مراجعت کے بعد جب پانچ نمازیں فرض رہ گئیں
تو حضرت موسیٰؑ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار پھر مراجعت کرنے
کے لیے کہا۔ اور یہ بھی کہا کہ آپ کی اُمت پانچ نمازوں کی بھی طاقت
نہیں رکھتی۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اب مجھے اپنے رب سے کہتے
ہوئے شرم آتی ہے۔“

جی ہاں پڑھیے اور علمائے اہل سنت کے ان عقائد پر سر دھنیے۔ اس پر بھی
وہ ائمہ اہل بیت کے پیروکار شیعوں پر اس لیے اعتراض کرتے ہیں کہ وہ بداء کے
قائل ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۷۸ کتاب بداء الخلق باب ذکر اللہ

۲۔ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۲۵۰ باب المعراج۔ صحیح مسلم جلد ۱۱ باب الإشراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفرض الصلوات۔

اس قصے میں اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد اور اُمت محمد پر اول پچاس نمازیں فرض کی تھیں پھر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مراجعت کرنے پر اسے یہ مناسب معلوم ہوا کہ نمازوں کی تعداد چالیس کرے۔ پھر دوسری دفعہ مراجعت کرنے پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ نمازوں کی تعداد تیس کرے۔ تیسری دفعہ مراجعت کرنے پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس تعداد کو گھٹا کر بیس کرے۔ پھر چوتھی دفعہ مراجعت کرنے پر مناسب معلوم ہوا کہ دس کرے۔ پانچویں دفعہ مراجعت کرنے پر مناسب معلوم ہوا کہ پانچ کرے۔

اور کون جانتا ہے کہ اگر محمد اپنے رب سے شرم نہ جاتے تو وہ یہ تعداد ایک ہی کر دیتا یا بالکل معاف کر دیتا۔

استغفر اللہ۔ کیسی شرمناک بات ہے!

میرا اعتراض اس پر نہیں کہ اس قصے میں بداء کیوں ہے؟ نہیں، بالکل نہیں۔ يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ۔ ہم پہلے اہل سنت کا یہ عقیدہ بیان کر چکے ہیں کہ والدین سے خشن ہونے کے صدقات اور دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان سے بدبختی، نیک بختی میں بدل جاتی ہے، عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور برے طریقے سے موت سے حفاظت ہو جاتی ہے۔ — ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ اسلامی اصولوں اور قرآن کی روح کے عین مطابق ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ
اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک

وہ لوگ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔

اگر ہمارا سب کا یعنی شیعہ اور سنی دونوں کا یہ عقیدہ نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ تغیر و تبدل کرتا رہتا ہے، تو ہماری یہ نمازیں اور دعائیں سب بیکار تھیں، ان کا نہ کوئی فائدہ تھا اور نہ کوئی مقصد۔

ہم سب اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ احکام تبدیل کرتا ہے۔ اسی لیے ہم نبی کی شریعت جتنا ہے بلکہ خود ہمارے نبی کی شریعت میں بھی ناسخ و منسوخ کا

سلسلہ رہا ہے، ایسی صورت میں بداء کا عقیدہ نہ کفر ہے نہ دین سے بغاوت۔ اہل سنت کو کوئی حق نہیں کہ اس عقیدے کی وجہ سے شیعوں کو طعن دیں۔ اسی طرح شیعوں کو بھی حق نہیں کہ اہل سنت پر اعتراض کریں۔

لیکن مجھے مذکورہ بالا قصے پر ضرور اعتراض ہے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کے بارے میں اپنے پروردگار سے سووے بازی پر۔ کیونکہ اس میں اللہ جل شانہ کی طرف جہل کی نسبت لازم آتی ہے اور تاریخ بشریت کے سب سے بڑے انسان یعنی ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کی توہین ہوتی ہے۔ اس روایت میں جناب موسیٰؑ حضرت محمدؐ سے کہتے ہیں کہ:

أَنَا آغْلَمُ بِالنَّاسِ مِنْكَ .

میں لوگوں کے حالات اور مزاج سے تمھاری نسبت زیادہ

واقف ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ موسیٰؑ زیادہ افضل ہیں اور اگر وہ نہ ہوتے تو اُمت محمدیہ کی عبادت کے بوجھ میں تخفیف نہ ہوتی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت موسیٰؑ کو کیسے معلوم ہوا کہ اُمت محمدیہ پانچ نمازوں کا بھی بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی جبکہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم نہیں تھی، کیونکہ اس نے ناقابل برداشت عبادت کا بوجھ اپنے بندوں پر ڈال دیا تھا اور پچاس نمازیں ان پر فرض کر دی تھیں۔

میرے بھائی ذرا تصور کیجیے! پچاس نمازیں ایک دن میں کیسے ادا کی جاسکتی ہیں؟ ایسا ہوا تو پھر نہ کوئی مشغلہ ہوگا، نہ کوئی کام، نہ تعلیم نہ کمائی، نہ کوشش نہ ذمہ داری۔ سب آدمی فرشتے بن جائیں گے، جن کا کام صرف نمازیں پڑھنا اور عبادت کرنا ہوگا۔ آپ معمول حساب لگائیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک نماز میں دس منٹ بھی لگیں اور یہ ایک باجماعت نماز کے وقت کا معقول اندازہ ہے، تو دس منٹ کو پچاس سے ضرب دے لیجیے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچاس نمازیں ادا کرنے میں تقریباً دس گھنٹے لگیں گے۔ اب یا تو آپ اس افتاد پر صبر کریں یا اس دین کا ہی انکار کر دیں جو اپنے ماننے والوں پر یہ ناقابل برداشت

بوجھ ڈالتا ہے۔

ہو سکتا ہے یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے خلاف سرکشی کی کوئی قابل قبول وجہ ہو۔ لیکن اب تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا بوجھ اتار دیا ہے اور ان کی سب زنجیریں کاٹ دی ہیں۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع نہ کرنے کا ان کے پاس کیا بہانہ ہے۔

اگر اہل سنت شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ شیعہ بداء کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ جیسے مناسب سمجھتا ہے تغیر تبدیل کر لیتا ہے تو وہ اپنے اوپر کیوں اعتراض نہیں کرتے جب وہ خود یہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے جب مناسب سمجھا تو ایک ہی حکم ایک ہی رات یعنی شب معراج میں پانچ دفعہ بدل دیا۔
بڑا ہوا اندھے تعصب اور عناد کا جو حقائق کو چھپاتا اور اٹا کر کے پیش کرتا ہے۔ متعصب اپنے مخالف پر حملہ کرنے کے لیے صاف اور واضح امور کا انکار کر گزرتا ہے اور بات بے بات مخالف پر اعتراض کرتا ہے، اس کے خلاف افواہیں پھیلاتا ہے اور ذرا سی بات کا تشویش بنا دیتا ہے جبکہ خود بہت زیادہ قابل اعتراض باتیں کہتا ہے۔

یہاں مجھے وہ بات یاد آگئی جو حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام نے یہود سے کہی تھی۔

آپ نے کہا تھا :

”تم دوسروں کی آنکھ کا تشویش دیکھتے ہو اور اپنی آنکھ کا تشویش نہیں دیکھتے“

ایک مثال ہے کہ :

”بیماری تو اسے تھی مگر وہ مجھ سے یہ کہہ کر کہ یہ بیماری تمہیں ہے

خود کھسک گئی“

شاید کوئی یہ کہے کہ اہل سنت کے یہاں بداء کا لفظ نہیں آیا، گو اس کے معنی تو حکم بدلنے ہی کے ہیں لیکن پھر بھی بداء اللہ کے الفاظ اہل سنت کے یہاں نہیں۔

میں اکثر دلیل کے طور پر کہ بداء اہل سنت کے یہاں بھی ہے، معراج

کا قصہ پیش کیا کرتا تھا۔ اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس میں بداء کا لفظ نہیں ہے، لیکن بعد میں جب میں نے انھیں صحیح بخاری کی ایک روایت دکھائی جس میں صراحت کے ساتھ بداء کا لفظ ہے اور اس میں کسی شک کی گنجائش بھی نہیں، تو وہ مان گئے۔

روایت حسب ذیل ہے :

بخاری نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

”بنی اسرائیل میں تین آدمی تھے : ایک کے جسم پر برص کے سفید داغ تھے، دوسرا نابینا تھا اور تیسرا گنجا تھا۔ بَدَا يَلَهُ اَن يَكُنْتِ يَهُمُّهُ اللّٰهُ كُوَيْه (مناسب) معلوم ہوا کہ ان کا امتحان لے۔ چنانچہ ایک فرشتے کو بھیجا، جو پہلے مبروص کے پاس آیا اور اس سے پوچھا : تمہیں سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہے ؟ اس نے کہا : صاف ستھری جلد اور اچھا رنگ، کیونکہ لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں۔ فرشتے نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو اس کی بیماری جاتی رہی اور خوبصورت رنگ نکل آیا۔ پھر فرشتے نے پوچھا : تمہیں کس قسم کا مال پسند ہے ؟ اس نے کہا : اُونٹ۔ فرشتے نے اسے ایک دس مہینے کی گنجا بھن اُونٹنی دے دی۔

اس کے بعد فرشتہ گنچے کے پاس آیا۔ اس سے پوچھا : تمہیں سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہے ؟ اس نے کہا : خوبصورت بال اور میری یہ بیماری جاتی رہے، مجھ سے لوگ گھن کرتے ہیں۔ فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کا گنج جاتا رہا اور عمدہ بال نکل آئے۔ اس کے بعد فرشتے نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کون سا مال سب سے زیادہ پسند ہے ؟ اس شخص نے کہا : گائیں۔ فرشتے نے اسے ایک گنجا بھن گائے دے دی۔

اس کے بعد فرشتہ اندھے کے پاس آیا۔ اس سے پوچھا : تمہیں

کون سی چیز سب سے زیادہ پسند ہے ؟ اس نے کہا : میں تو بس یہی چاہتا ہوں کہ اللہ میری بنیائے لوٹا دے۔ فرشتے نے ہاتھ پھیرا تو بنیائے واپس آگئی۔ فرشتے نے پوچھا تمہیں کونسا مال پسند ہے ؟ اس شخص نے کہا : بھیڑیں۔ فرشتے نے اسے ایک بچوں والی بھیڑ دے دی۔

ایک مدت کے بعد جب ان لوگوں کے پاس اونٹ آگائیں اور بھیڑیں خوب ہو گئیں اور ہر ایک کے پاس پورا گلہ ہو گیا تو وہ فرشتہ اسی شکل میں پھر آیا اور مبروص، گنجے اور نابینا میں سے ہر ایک کے پاس جا کر ان کے پاس جو جانور تھے ان میں سے کچھ جانور مانگے۔ مبروص اور گنجے نے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ نے ان کو پھر ان کی شکل پر لوٹا دیا۔ نابینا نے جانور دیدیے تو حق تعالیٰ نے اس کے مال میں اور برکت دی اور اس کی بنیائے بھی بحال رکھی۔

اس لیے میں اپنے بھائیوں کو یہ ارشاد ربانی یاد دلاتا ہوں :
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ

اے ایمان والو! نہ مرد مردوں کا مذاق اڑائیں، کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا، کیا عجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کا نام رکھو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام ہی بُرا ہے

اور جواب بھی تو بہ نہ کریں گے، وہی ظالم ٹھہریں گے۔ !

(سورۃ حجرات - آیت ۱۱)

میری دلی خواہش ہے کہ کاش مسلمانوں کو عقل آجائے، وہ قصص کو چھوڑ دیں اور دشمن کے مقابلے میں بھی جذبات سے کام نہ لیں تاکہ ہر بحث میں فیصلہ جذبات کے بجائے عقل سے ہو۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بحث وجدال میں قرآن کریم کا اسلوب اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر وحی نازل کی تھی کہ وہ اپنے مخالفین سے کہہ دیں کہ :

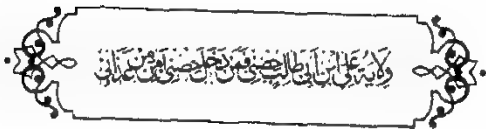
وَأَنَّا آوَيْنَاكُمْ لَعَلَّيْ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ .

کہہ دیجیے : یا ہم راہ راست پر ہیں یا تم، اسی طرح یا ہم گمراہی میں ہیں یا تم۔

(سورۃ سبا - آیت ۲۴)

یہ کہہ کر رسول اللہؐ نے مشرکین کی قدر و منزلت بڑھا دی اور خود ان کی سطح پر آنا منظور کر لیا تاکہ مشرکین کے ساتھ انصاف ہو اور اگر وہ سچے ہوں تو انہیں بھی اپنے دلائل پیش کرنے کا موقع مل سکے۔

اب ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم ان اعلیٰ اخلاق پر کہاں تک عمل پیرا ہیں !



تقیہ

ہم گزشتہ بحث میں کہہ چکے ہیں کہ اہل سنت کے نزدیک ”بذاء“ بہت ہی قابل اعتراض اور مکروہ عقیدہ ہے، اسی طرح تقیہ کو بھی وہ بُرا سمجھتے ہیں اور اس پر شیعہ بھائیوں کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ شیعوں کو منافق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعوں کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور ظاہر کچھ اور کرتے ہیں۔ میں نے اکثر اہل سنت سے گفتگو کر کے انھیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ تقیہ نفاق نہیں ہے لیکن انھیں تو کسی بات کا یقین ہی نہیں آتا سوائے اس کے کہ جو انھیں ان کی مذہبی عصبیت نے سکھا دیا ہے یا جو ان کے بڑوں بزرگوں نے ان کے دل میں بٹھا دیا ہے۔

یہ بڑے چوری کوشش کرتے ہیں کہ ان انصاف پسند اور تحقیق کے طالب لوگوں سے جو شیعوں اور شیعہ عقائد کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، حقائق کو چھپاتیں اور یہ کہہ کر انھیں شیعوں سے متنفر کرنے کی کوشش کریں کہ یہ عبد اللہ بن سبا یہودی کا فرقہ ہے جو زحمت، بداء، تقیہ، عصمت اور مُتہ کا قائل ہے اور اس کے عقائد میں بہت سے خرافات اور فرضی باتیں شامل ہیں جیسے مثلاً تہمدی منتظر وغیرہ کا عقیدہ۔ جو شخص ان کی باتوں کو سنتا ہے وہ کبھی اظہار نفرت کرتا ہے اور کبھی اظہار حیرت۔ اور یہی سمجھتا ہے کہ ان خیالات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ سب شیعوں کی منگھڑت اور فرضی باتیں ہیں۔

مگر جب کوئی شخص تحقیق کرتا ہے اور انصاف سے کام لیتا ہے تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب عقائد کا اسلام سے گہرا تعلق ہے اور یہ قرآن و سنت کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی عقائد و تصورات ان کے بغیر اپنی صحیح شکل اختیار ہی نہیں کر سکتے۔

اہل سنت میں عجیب بات یہ ہے کہ جن عقائد کو وہ بُرا سمجھتے ہیں، ان ہی

عقائد سے ان کی کتا ہیں اور احادیث کے معتبر مجموعے بھرے ہوئے ہیں۔ اب ایسے لوگوں کا کیا علاج جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔ اور جو خود اپنے عقائد کی اس بے ہنسی اڑاتے ہیں کیونکہ شیعہ ان پر عامل ہیں۔

ہم بداء کی بحث میں ثابت کر چکے ہیں کہ اہل سنت خود بداء کے قائل ہیں لیکن اگر دوسرے بداء کے قائل ہوں تو ان پر اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے۔ اب آئیے دیکھیں تقیہ کے مسئلہ میں اہل سنت و جماعت کیا کہتے ہیں؟ اس کی بنا پر تو وہ شیعوں پر منافق ہونے تک کا الزام لگاتے ہیں۔

ابن جریر طبری اور ابن ابی حاتم نے عون بن عباس سے واسطے سے ابن عباس سے بیان کیا ہے کہ اس آیت **إِلَّا أَنْ تَشْفُوا مِنْهُمْ نَفْسًا** کے بارے میں ابن عباس کہتے تھے کہ:

”تقیہ زبان سے ہوتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی کسی شخص کو ایسی بات کہنے پر مجبور کرے جو اصل میں محصیت ہے تو وہ اگر لوگوں کے ڈر کے مارے وہ بات کہہ دے جب کہ اس کا دل پوری طرح ایمان پر قائم ہو تو اسے کچھ نقصان نہیں ہوگا یہ بھی یاد رکھو کہ تقیہ محض زبان سے ہوتا ہے۔“

یہ روایت حاکم نے نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ بیہقی نے بھی اپنی سنن میں عطاء بن ابی ریحان سے روایت کی ہے کہ ابن عباس کے حوالے سے **إِلَّا أَنْ تَشْفُوا مِنْهُمْ نَفْسًا** (مگر ہاں ایسی صورت میں کہ تم کو ان سے کچھ اندیشہ ضرور ہو۔) (سورۃ آل عمران - آیت ۲۸) کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابن عباس کہتے تھے کہ **نَفْسًا** کا تعلق زبان سے کہنے سے ہے بشرطیکہ دل ایمان پر قائم ہو۔

عبد بن حمید نے حسن بصری سے روایت بیان کی ہے کہ

”حسن بصری کہتے تھے کہ تقیہ روز قیامت تک جائز ہے۔“

۱۔ سیوطی تفسیر درمنثور

۲۔ سنن بیہقی - مستدرک حاکم

عبد بن ابی رجاہ نے نقل کیا ہے کہ حسن بصری اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے: **إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقِيَّةً**۔ لہ

عبدالرزاق، ابن سعد، ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم اور ابن مردؤنیہ نے مندرجہ ذیل روایت بیان کی ہے، حاکم نے مستدرک میں اسے صحیح کہا ہے، بیہقی نے دلائل میں اس کو نقل کیا ہے۔ روایت یہ ہے:

مشرکین نے عمار بن یاسر کو پکڑ لیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک عمار نے نبی اکرمؐ کو گالی نہ دی اور مشرکین کے معبودوں کی تعریف نہ کی۔

آخر جب عمار کو مشرکین نے چھوڑ دیا تو وہ رسول اللہؐ کے پاس آئے۔ رسول اللہؐ نے پوچھا: کہو کیا گزری؟ عمار نے کہا: بہت بُری گزری، انھوں نے مجھے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک میں نے آپ کی شان میں گستاخی نہ کی اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی۔ رسول اکرمؐ نے پوچھا: تمہارا دل کیا کہتا ہے؟ عمار نے کہا: میرا دل تو ایمان پر پختہ اور قائم ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: اگر وہ لوگ تم پر پھر زبردستی کریں تو پھر ایسے ہی کہہ دینا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مِنْ اَكْبَرَةٍ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِاِلَٰهِيْمَٰنٍ۔

یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے مگر وہ نہیں جو کفر پر زبردستی مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ (سورہ نحل - آیت ۱۰۶)

ابن سعد نے محمد بن یسیر سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہؐ نے دیکھا کہ عمارؓ رو رہے ہیں۔ آپ نے ان کے آنسو پونچھے اور کہا: (مجھے معلوم ہے کہ) کفار

نے تمہیں پانی میں ڈبو دیا تھا تب تم نے ایسا کہا۔ اگر وہ پھر تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں، تو پھر یہی کہہ دینا۔ لہ

ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم نے اور بیہقی نے اپنی سنن میں عن علیؓ ابن عباسؓ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ

ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں کہتے تھے: **مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ** کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ جس نے ایمان کے بعد کفر کیا، اس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور اس کے لیے سخت عذاب ہے مگر جسے مجبور کیا گیا اور اس نے دشمن سے بچنے کے لیے زبان سے کچھ کہہ دیا مگر اس کے دل میں ایمان ہے اور اس کا دل اس کی زبان کے ساتھ نہیں، تو کوئی بات نہیں کیونکہ اللہ اپنے بندوں سے صرف اس بات کا مواخذہ کرتا ہے جس پر ان کا دل جم جائے۔

ابن ابی شیبہ، ابن جریر طبری، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت مکے کے کچھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ یہ لوگ ایمان لے آئے تو انھیں بعض صحابہ نے مدینہ سے لکھا کہ ہجرت کر کے یہاں آ جاؤ۔ جب تک تم ہجرت کر کے یہاں نہیں آؤ گے، ہم تمہیں اپنا سنا نہیں سمجھیں گے۔ اس پر وہ مدینہ کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں انھیں قریش نے پکڑ لیا اور ان پر سختی کی۔ مجبوراً انھیں کچھ کلمات کفر کہنے پڑے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: **إِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِاِلَٰهِيْمَٰنٍ**۔ بخاری نے اپنی صحیح میں باب المداۃ مع الناس میں ایک روایت نقل کی ہے، جس کے مطابق ابوالدرداء کہتے تھے:

کچھ لوگ ہیں جن سے ہم بڑی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں،

لہ ابن سعد، طبقات الکبریٰ

لہ حافظ احمد بن حنین، بیہقی، سنن الکبریٰ

لہ سیوطی، تفسیر درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۷۸

لیکن ہمارے دل ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لہ
 حلبی نے اپنی سیرت میں یہ روایت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ
 ”جب رسول اللہؐ نے شہر خیبر فتح کیا تو حجاج بن علاط نے
 آپ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! مکے میں میرا کچھ سامان ہے
 اور وہاں میرے گھر والے بھی ہیں، میں انھیں لانا چاہتا ہوں،
 کیا مجھے اجازت ہے اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دوں جو آپ
 کی شان میں گستاخی ہو؟ رسول اللہؐ نے اجازت دے دی
 اور کہا: جو چاہے کہو۔“ لہ

امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم میں ہے کہ:
 مسلمان کی جان بچانا واجب ہے۔ اگر کوئی ظالم کیسی مسلمان
 کو قتل کرنا چاہتا ہو اور وہ شخص چھپ جاتے تو ایسے موقع پر
 جھوٹ بول دینا واجب ہے۔“ لہ
 جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب الآشباہ والنظائر میں ایک روایت
 بیان کی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

”فاقد کشی کی حالت میں مزار کھانا، شراب میں لقمہ بولنا
 اور کفر کا کلمہ زبان سے نکلانا جائز ہے۔ اگر کسی جگہ حرام ہی
 حرام ہو اور حلال شاذ و نادر ہی ملتا ہو تو حسب ضرورت حرام
 کا استعمال جائز ہے۔“
 ابوبکر رازی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں اس آیت اِلَّا اَنْ تَتَّقُوا
 مِنْهُمْ تُقَاةً کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
 مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں جان جانے یا کسی عضو کے تلف

ہو جانے کا اندیشہ ہو تو تم کفار سے بظاہر دوستی کا اظہار کر کے
 اپنی جان بچا سکتے ہو۔ آیت کے الفاظ سے یہی معنی نکلتے ہیں
 اور اکثر اہل علم اس کے قائل ہیں۔ قتادہ نے بھی لَا يَتَّخِذُ
 الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ
 کی تفسیر کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ مؤمن کے لیے جائز نہیں کہ
 کسی کافر کو دین کے معاملے میں اپنا دوست یا سرپرست بنائے
 ہونے اس کے کہ ضرر کا اندیشہ ہو۔ قتادہ نے مزید کہا ہے کہ
 اِلَّا اَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقیہ کی
 صورت میں زبانی کفر کا اظہار جائز ہے۔“ لہ

صحیح بخاری میں غزوہ بن ربیع سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے
 انھیں بتلایا کہ

ایک دفعہ ایک شخص نے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر
 ہونے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا: لغو آدمی ہے، خیر
 آنے دو۔ جب وہ شخص آیا تو آپ نے بڑی نرمی سے اس
 سے بات چیت کی۔ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! ابھی تو
 آپ نے کیا فرمایا تھا پھر آپ نے اس سے گفتگو اتنی خوش اخلاقی
 سے کی؟ آپ نے جواب دیا: عائشہ! اللہ کے نزدیک وہ بدترین
 آدمی ہے جس سے لوگ اس کی بدزبانی کی وجہ سے بچیں یا اس
 کی بدزبانی کی وجہ سے اسے چھوڑ دیں۔“ لہ

اس قدر تبصرہ یہ دکھانے کے لیے کافی ہے کہ اہل سنت تقیہ کے جواز کے
 پوری طرح قائل ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ تقیہ قیامت تک جائز رہے گا اور
 ۔۔۔ جیسا کہ غزالی نے کہا ہے، ان کے نزدیک بعض صورتوں میں جھوٹ بولنا واجب

لہ ابوبکر رازی، احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۰
 لہ صحیح بخاری جلد ۱ باب لَمَّا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ فَاحْشًا وَلَا مَفْجَسًا۔

جیسے سلاً عمار بن یاسرؓ۔ بعض کو تو عمار بن یاسرؓ سے بھی زیادہ تکلیف اٹھانی پڑی۔ اہل سنت ان مصائب سے محفوظ تھے کیونکہ ان کا ظالم حکمرانوں کے ساتھ مکمل اتحاد تھا۔ اس لیے انھیں نہ قتل کا سامنا کرنا پڑا، نہ ٹوٹ کھسوٹ کا، نہ ظلم و ستم کا۔ اس لیے یہ قدرتی امر ہے کہ وہ نہ صرف تقیہ کا انکار کرتے ہیں بلکہ تقیہ کرنے والوں پر طعن و تشنیع بھی کرتے ہیں۔ دراصل بنی امیہ اور بنی عباس کے حکمرانوں نے تقیہ کی بنا پر شیعوں کو بدنام کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ان ہی کی پیروی اہل سنت و جماعت نے کی ہے۔

جب اللہ سبحانہ نے قرآن میں تقیہ کا حکم نازل فرمایا ہے اور جب خود رسول اللہؐ نے اس پر عمل کیا ہے، جیسا کہ بخاری کی روایت میں آپؐ پڑھ چکے ہیں اس کے علاوہ رسول اللہؐ نے عمار بن یاسرؓ کو اجازت دی کہ اگر کفار پھر ان پر تشدد کریں اور اذیت دیں تو جو کلمات کفر کفار کہلوانا چاہیں وہ کہہ دیں۔ نیز یہ کہ قرآن و سنت پر عمل کرتے ہوئے علماء نے بھی تقیہ کی اجازت دی ہے تو پھر آپ ہی انصاف سے بتائیں کہ کیا اس کے بعد بھی شیعوں پر طعن کرنا اور ان پر اعتراض کرنا درست ہے؟

صحابہ کرام نے ظالم حکمرانوں کے عہد میں تقیہ پر عمل کیا ہے۔ اس وقت جبکہ ہر شخص کو جو علی بن ابی طالبؓ پر لعنت کرنے سے انکار کرتا تھا قتل کر دیا جاتا تھا حجر بن عدیؓ کی کندی اور ان کے ساتھیوں کا قصہ تو مشہور ہے۔ اگر میں صحابہ کے تقیہ کی مثالیں جمع کروں تو ایک الگ کتاب کی ضرورت ہوگی۔ لیکن میں نے اہل سنت کے حوالوں سے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ بخیر اللہ کافی ہیں۔

لیکن اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ ضرور بیان کروں گا جو خود میرے ساتھ پیش آیا۔ ایک دفعہ ہوائی جہاز میں میری ملاقات اہل سنت کے ایک عالم سے ہوئی ہم دونوں برطانیہ میں منتقل ہونے والی ایک اسلامی کانفرنس میں مدعو تھے۔ دو گھنٹے تک ہم شیعہ سنتی مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ صاحب اسلامی اتحاد کے داعی اور حامی تھے۔ مجھے بھی ان میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی لیکن اس وقت مجھے بڑا معلوم ہوا جب انھوں نے یہ کہا کہ شیعوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بعض ایسے عقائد چھوڑ دیں جو

ہے اور بقول رازی جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ بعض صورتوں میں اظہار کفر بھی جائز ہے اور۔ جیسا کہ بخاری اعتراف کرتے ہیں یہ ظاہر مسکراتا اور دل میں لعنت کرنا بھی جائز ہے اور۔ جیسا کہ صاحب سیرۃ حلبیہ نے لکھا ہے، اپنے مال کے ضائع ہو جانے کے خوف سے رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی کرنا بلکہ کچھ بھی کہہ دینا روا ہے۔ اور۔ جیسا کہ شیوطی نے اعتراف کیا ہے لوگوں کے خوف سے ایسی باتیں کہنا بھی جائز ہے جو گناہ ہیں۔

اب اہل سنت کے لیے اس کا قطعاً جواز نہیں کہ وہ شیعوں پر ایک ایسے عقیدے کی وجہ سے اعتراض کریں جس کے وہ خود بھی قائل ہیں اور جس کی روایات ان کی مستند حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جو تقیہ کو نہ صرف جائز بلکہ واجب بتلاتی ہیں جن باتوں کے اہل سنت قائل ہیں، شیعہ ان سے زیادہ کچھ نہیں کہتے۔ یہ بات البتہ ہے کہ وہ تقیہ پر عمل کرنے میں دوسروں سے زیادہ مشہور ہو گئے ہیں۔ اور وجہ اس کی وہ ظلم و تشدد ہے جس سے شیعوں کو اموی اور عباسی دور میں سابقہ پڑا۔ اس دور میں کسی شخص کے قتل کر دیے جانے کے لیے کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ ”یہ بھی شیعہ ان اہل بیت میں سے ہے“

ایسی صورت میں شیعوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا کہ وہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں تقیہ پر عمل کریں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

الَّتَقِيَّةُ دِينِي وَ دِينُ آبَائِي .

تقیہ میرا اور میرے آباء و اجداد کا دین ہے۔

اور یہ بھی فرمایا کہ

مَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ لَا دِينَ لَهُ .

جو تقیہ نہیں کرتا، اس کا دین ہی نہیں۔

تقیہ خود ائمہ اہل بیت کا شعار تھا، اور اس کا مقصد اپنے آپ کو اور اپنے پیڑ کاروں اور دوستوں کو ضرر سے محفوظ رکھنا، ان کی جانیں بچانا اور ان مسلمانوں کی بہتری کا سامان کرنا تھا جو اپنے معتقدات کی وجہ سے تشدد کا شکار ہو رہے تھے،

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالتے اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کا سبب بنتے ہیں۔ میں نے پوچھا: مثلاً؟

انہوں نے بے دھڑک جواب دیا: مثلاً مُتَقِیَّہ اور تَقِیَّہ۔

میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ مُتَقِیَّہ تو جائز ہے اور قانونی نکاح کی ایک صورت ہے اور تَقِیَّہ اللہ کی طرف سے ایک رعایت اور اجازت ہے۔ لیکن وہ حضرت اپنی بات پر اڑے لیے اور میری ایک نہ مانے، نہ ہی میرے دلائل انہیں قائل کر سکے۔

کہنے لگے: جو کچھ آپ نے کہا ہے، ممکن ہے کہ وہ صحیح ہو، لیکن مصلحت یہی ہے کہ مسلمانوں کی وحدت کی خاطر ان چیزوں کو ترک کر دیا جائے۔ مجھے ان کی منطق عجیب معلوم ہوئی، کیونکہ وہ مسلمانوں کی وحدت کی خاطر اللہ کے احکام کو ترک کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ پھر بھی میں نے ان کا دل رکھنے کو کہا: اگر مسلمانوں کا اتحاد اسی پر موقوف ہوتا تو میں پہلا شخص ہوتا جو یہ بات مان جاتا۔

ہم لندن ایئرپورٹ پر اترے تو میں ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ جب ہم ایئرپورٹ پولیس کے پاس پہنچے تو ہم سے برطانیہ آنے کی وجہ پوچھی گئی۔

ان صاحب نے کہا: میں علاج کے لیے آیا ہوں۔

میں نے کہا کہ میں اپنے کچھ دوستوں سے ملنے آیا ہوں۔

اس طرح ہم دونوں کسی دقت کے بغیر وہاں سے گزر کر اس مال میں پہنچ گئے جہاں سامان وصول کرنا تھا۔ اس وقت میں نے چپکے سے ان کے کان میں کہا کہ:

آپ نے دیکھا کہ کیسے تَقِیَّہ (نظریہ ضرورت) ہر زمانے میں کارآمد ہے؟

کہنے لگے: کیسے؟

میں نے کہا: ہم دونوں نے پولیس سے جھوٹ بولا۔ میں نے کہا میں دوستوں

سے ملاقات کے لیے آیا ہوں، اور آپ نے کہا کہ میں علاج کے لیے آیا ہوں۔ حالانکہ

ہم دونوں کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔

وہ صاحب کچھ دیر مسکراتے رہے۔ سمجھ گئے تھے کہ میں نے ان کا جھوٹ سُن لیا۔

پھر کہنے لگے: کیا اسلام کانفرنسوں میں ہمارا روحانی علاج نہیں ہوتا؟ میں نے ہنس کر کہا: تو کیا ان کانفرنسوں میں ہماری اپنے دوستوں سے

ملاقات نہیں ہوتی؟

اب میں پھر اپنے موضوع پر واپس آتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اہل سنت کا یہ کہنا غلط ہے کہ تَقِیَّہ نفاق کی کوئی شکل ہے بلکہ بات اس کی اُلٹ ہے، کیونکہ نفاق کے معنی ہیں: ظاہر میں ایمان اور باطن میں کفر۔ اور تَقِیَّہ کے معنی ہیں ظاہر میں کفر اور باطن میں ایمان۔ ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

نفاق کے متعلق اللہ سُبحانہ نے فرمایا ہے:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُتَقِضُونَ .

جب وہ مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے۔

(سورہ بقرہ - آیت ۱۴)

اس کا مطلب ہوا: ایمان ظاہر + کفر باطن = نفاق

تَقِیَّہ کے بارے میں اللہ سُبحانہ نے کہا ہے:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ

فِرْعَوْنِ كِ قَوْمِ مِیْن سِیْ اِیْکِ مَوْسٰی شَخْصِ نِیْ جِو اِیْنا اِیْمان

چھپائے ہوئے تھا، کہا:۔۔۔۔۔

اس کا مطلب ہوا: کفر ظاہر + ایمان باطن = تَقِیَّہ

یہ مومن آلِ فرعون اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا جس کا علم سوائے اللہ

کے کسی کو نہیں تھا، وہ فرعون اور دوسرے سب لوگوں کے سامنے یہی ظاہر کرتا تھا

کہ وہ فرعون کے دین پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر قرآنِ کریم میں تعریف کے انداز

میں کیا ہے۔

اب قارئین باتمکین آئیے دیکھیں! خود شیعہ تقیہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں تاکہ ان کے بارے میں جو غلط سلط باتیں مشہور ہیں، جو جھوٹ بولا جاتا اور طوفان اٹھایا جاتا ہے، ہم اس سے دھوکا نہ کھانے پائیں۔

شیخ محمد رضا مظفر اپنی کتاب عقائد اہل مایہ میں لکھتے ہیں :
تقیہ بعض موقعوں پر واجب ہے اور بعض موقعوں پر واجب نہیں۔ اس کا دار و مدار اس پر ہے کہ ضرر کا کتنا خوف ہے۔
تقیہ کے احکام فقہی کتابوں کے مختلف ابواب میں علماء نے لکھے ہیں۔ ہر حالت میں تقیہ واجب نہیں۔ صرف بعض صورتوں میں تقیہ کرنا جائز ہے۔

بعض صورتوں میں تو تقیہ نہ کرنا واجب ہے، مثلاً اس صورت میں جب کہ حق کا اظہار، دین کی مدد، اسلام کی خدمت اور جہاد ہو۔ ایسے موقع پر جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ بعض صورتوں میں تقیہ حرام ہے یعنی ان صورتوں میں جب تقیہ کا نتیجہ خون ناحق، باطل کا رواج یا دین میں بگاڑ ہو یا تقیہ کے باعث مسلمانوں کا سخت نقصان ہونے، مسلمانوں میں گمراہی پھیلنے یا ظلم و جور کے فروغ پانے کا اندیشہ ہو۔

بہر حال شیعوں کے نزدیک تقیہ کا جو مطلب ہے وہ ایسا نہیں کہ اس کی بنا پر شیعوں کو تخریبی مقاصد کی کوئی خفیہ پارٹی سمجھ لیا جائے، جیسا کہ شیعوں کے بعض وہ غیر محتاط دشمن چاہتے ہیں جو ضمیمہ بات کو سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ (ہم غیر محتاط شیعوں سے بھی کہیں گے کہ)

اقوال غیر جو پتے اسلام میں مضمر
اپنی زباں سے ان کی حکایت نہ کیجیے

اسی طرح تقیہ کے یہ بھی معنی نہیں کہ اس کی وجہ سے دین اور اس کے احکام ایسا راز بن جائیں جسے شیعہ مذہب کو نہ

ماننے والوں کے سامنے ظاہر نہ کیا جاسکے۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ شیعہ علماء کی تصانیف خصوصاً ان کی فقہ، احکام عقائد اور علم کلام سے متعلق کتابیں مشرق و مغرب میں ہر جگہ اتنی تعداد میں پھیلی ہوئی ہیں کہ اس سے زیادہ تعداد کی کسی مذہب کے ماننے والوں سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

اب آپ خود دیکھ لیجیے کہ دشمنوں کے خیال کے برخلاف یہاں نہ اتفاق ہے نہ مکرو فریب، نہ دھوکا ہے نہ جھوٹ!

مفتی: معینہ مدت کا نکاح

جس طرح تمام مسلمان فقہوں میں نکاح کے لیے یہ شرط ہے کہ لڑکی اور لڑکے کی طرف سے ایجاب و قبول کیا جائے اور ہر معین کیا جائے، اسی طرح سے مفتہ میں بھی ہر کو معین کیا جانا ضروری ہے۔ نیز طرفین کی طرف سے ایجاب و قبول بھی شرط ہے، مثلاً:

لڑکی لڑکے سے کہے: زَوَّجْتُكَ نَفْسِي بِمَهْرٍ قَدْرُهُ كَذَا وَ لِمُدَّةٍ كَذَا۔

اس پر لڑکا کہے: قَبِلْتُ یا کہے: رَضِيتُ۔

شرعیات اسلام میں عام طور سے جتنی شرطیں نکاح کے لیے مقرر کی گئی ہیں کم و بیش وہ تمام شرطیں مفتہ کے لیے بھی مقرر کی گئی ہیں۔ مثلاً جس طرح محرم سے (یا ایک ہی وقت میں دو بہنوں سے) نکاح نہیں ہو سکتا اسی طرح مفتہ بھی نہیں ہو سکتا (اور جس طرح بعض فقہاء کے نزدیک اہل کتاب سے نکاح جائز ہے اسی طرح مفتہ بھی جائز ہے) اور جس طرح نکاح کے بعد طلاق ہو جانے پر منکوحہ کے لیے عدت ضروری ہے جس کے بعد ہی وہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے اسی طرح مفتہ بھی مفتہ کے بعد

لے کذا و کذا کی بجائے ہر کی رقم اور مفتہ کی مدت بولے۔

عَدَّت میں بیٹھتی ہے اور عَدَّت پوری کرنے کے بعد ہی دوسرا مُتْعہ یا نکاح کر سکتی ہے۔ مَتْنُوْعَةُ كِی عَدَّت دُوْ طَهْر (یا پینتالیس دن) ہے لیکن شوہر کے مرجانے کی صورت میں یہ مدت چار ماہ دس دن ہے۔

مُتْعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ نَفَقہ ہے نہ میراث، اس لیے مُتْعہ کرنے والے مرد اور عورت ایک دوسرے سے میراث نہیں پاتے۔

مُتْعہ سے پیدا ہونے والے بچے نکاح سے پیدا ہونے والے بچوں کی طرح حَلَال ہوتے ہیں اور انھیں عام بچوں کی طرح میراث اور نَفَقہ (روٹ، کپڑا، مکان، دوا دارو وغیرہ) کے تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں اور ان کا نسب اپنے باپ سے چلتا ہے۔ یہ ہیں مُتْعہ کی شرائط اور حدود۔ اس کا حرام کاری سے دُور کا بھی تعلق نہیں، جیسا کہ بعض غلط الزام لگانے والے اور بیجا شور مچانے والے سمجھتے ہیں۔

اپنے شیعہ بھائیوں کی طرح اہل سنت و اجماعت کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ سورۃ نسا کی آیت ۲۴ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مُتْعہ کی تشریع کی گئی ہے آیت یہ ہے:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ
فَرِيضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا تَرَا ضَيْتُمْ بِهِ مِنْ
بَعْدِ الْفَرِيضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔

پس جن عورتوں سے تم نے مُتْعہ کیا ہے تو انھیں جو مقرر کیا ہے دے دو اور ہر کے مقرر ہونے کے بعد اگر آپس میں رُکم و بیش پر راضی ہو جاؤ تو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں بیشک خدا ہر چیز سے واقف اور مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

اسی طرح اس پر بھی شیعہ اور سُنی دونوں کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ نے مُتْعہ کی اجازت دی تھی اور صحابہ نے عہد نبوی میں مُتْعہ کیا تھا۔

اختلاف صرف اس پر ہے کہ کیا مُتْعہ کا حکم منسوخ ہو گیا یا اب بھی باقی ہے۔ اہل سنت اس کے منسوخ ہو جانے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلے مُتْعہ حلال تھا پھر حرام کر دیا گیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نسخ حدیث سے ہوا ہے قرآن سے نہیں۔

اس کے برخلاف شیعہ کہتے ہیں کہ مُتْعہ منسوخ ہی نہیں ہوا۔ یہ قیامت تک جائز رہے گا۔

فریقین کے اقوال پر ایک نظر ڈالنے سے حقیقت واضح ہو جائے گی اور قارئین باتمکین کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ تعصب اور جذبات سے بالاتر ہو کر حق کا اتباع کر سکیں۔

شیعہ جو یہ کہتے ہیں کہ مُتْعہ منسوخ نہیں ہوا اور یہ قیامت تک جائز رہے گا اس کے متعلق ان کی اپنی دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ نے کبھی مُتْعہ سے منع کیا ہو۔

اس کے علاوہ ہمارے ائمہ جو عِزَّتِ طاہرہ سے ہیں اس کے حلال اور جائز ہونے کے قائل ہیں۔ اگر مُتْعہ منسوخ ہو گیا ہوتا تو ائمہ اہل بیت کو اور خصوصاً امام علیؑ کو ضرور اس کا علم ہوتا کیونکہ گھر کا حال گھر والوں سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔ !

ہمارے نزدیک جو بات ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ عمر بن خطاب نے اپنے عہد خلافت میں اسے حرام قرار دیا تھا، لیکن یہ ان کا اپنا اجتہاد تھا۔ اس بات کو علمائے اہل سنت بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو عمر بن خطاب کی رائے اور اجتہاد کی بنا پر نہیں چھوڑ سکتے۔

یہ ہے مُتْعہ کے بارے میں شیعوں کی رائے کا خلاصہ، جو بظاہر بالکل درست اور صحیح ہے۔ کیونکہ سب مسلمان اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پیروی کرنے کے مُکلف ہیں کسی اور کی رائے کی نہیں، خواہ اس کا رتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو خصوصاً اگر اس کا اجتہاد قرآن و حدیث کے نصوص کے خلاف ہو۔

اس کے برعکس، اہل سنت و اجماعت یہ کہتے ہیں کہ مُتْعہ پہلے حلال تھا، اس کے متعلق قرآن میں آیت بھی آئی تھی، رسول اللہؐ نے اس کی اجازت بھی دی تھی، صحابہ نے اس پر عمل بھی کیا تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ کس نے منسوخ کیا، اس میں اختلاف ہے:

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی وفات

سے قبل منسوخ کر دیا تھا یہ
کچھ کا کہنا ہے کہ عُمر بن خطاب نے مُتَع کو حرام کیا اور ان کا حرام کرنا ہمارے
لیے حُجَّت ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ
”میری سُنَّت اور میرے بعد آنے والے خلفائے راشدین کی سنت
پر چلو اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔“

اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مُتَع اس لیے حرام ہے کہ عُمر بن خطاب نے اسے
حرام کیا تھا اور سُنَّتِ عمر کی پابندی اور پاسداری ضروری ہے، تو ایسے لوگوں سے تو کوئی
گفتگو اور بحث بیکار ہے، کیونکہ ان کا یہ قول محض تعصب اور تکلف بے جا ہے، ورنہ
یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان اللہ اور رسولؐ کا قول چھوڑ کر اور ان کی مخالفت
کر کے کسی ایسے مجتہد کی رائے پر چلنے لگے جس کی رائے بنا بر بشریت صحیح کم ہوتی ہے
اور غلط زیادہ۔ یہ صورت بھی اس وقت ہے جب اجتہاد کسی ایسے مسئلے میں ہو
جس کے بارے میں قرآن و سُنَّت میں کوئی تصریح نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی تصریح موجود
ہو تو پھر حکم خداوندی یہ ہے :

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ
وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا.

جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو
پھر اس بات میں کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو کوئی اختیار
نہیں۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی وہ بالکل
گمراہ ہو گیا۔
(سورۃ احزاب - آیت ۳۶)

جسے اس قاعدہ پر مجھ سے اتفاق نہ ہو، اس کے لیے اسلامی قوانین کے

لے یہ بات وثوق سے معلوم نہیں کہ رسول اللہؐ نے کب منسوخ کیا تھا : کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بعد از خیر اور
کچھ کہتے ہیں کہ روز فتح مکہ اور کچھ کہتے ہیں کہ غزوہ تبوک میں اور کچھ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں اور
کچھ کہتے ہیں غزوۃ القضا میں رسول اللہؐ نے اسے منسوخ کیا تھا۔ (ناشر)

ہائے میں اپنی معلومات پر نظر ثانی کرنی اور قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنا ضروری ہے
کیونکہ قرآن خود مذکورہ بالا آیت میں بتلاتا ہے کہ جو قرآن و سُنَّت کو حُجَّت نہیں مانتا
وہ کافر اور گمراہ ہے۔ اور ایک اسی آیت پر کیا موقوف ہے قرآن میں ایسی متعدد
آیات موجود ہیں۔

اسی طرح اس بارے میں احادیث بھی بہت ہیں، ہم صرف ایک حدیث
نبویؐ پر اکتفا کریں گے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا :

”جس چیز کو محمدؐ نے حلال کیا وہ قیامت تک کے لیے حلال

ہے اور جس چیز کو محمدؐ نے حرام کیا وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے۔“

اس لیے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی ایسی چیز کے حلال یا حرام ہونے
کے بارے میں فیصلہ کرے جس کے متعلق اللہ یا اس کے رسولؐ کا حکم موجود ہو۔
تکمیلِ دین کے بعد نہ ترمیم سونچئے

بندہ نواز! آپ رسالت نہ سیکھیے

اس سب کے باوجود بھی جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ مان لیں کہ خلفائے
راشدین کے افعال و اقوال اور ان کے اجتہادات پر عمل ہمارے لیے ضروری ہے،
ہم ان سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ :

”کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حُجَّت کرتے ہو ؟ وہ تو ہمارا

بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے

ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ اور ہم تو اس کے لیے

خالص ہیں۔
(سورۃ بقرہ - آیت ۱۳۹)

لہذا ہماری بحث کا تعلق صرف اس گروہ سے ہے جو یہ کہتا ہے کہ رسول اللہؐ
نے خود مُتَع کو حرام قرار دیا تھا اور یہ کہ قرآن کا حکم حدیث سے منسوخ ہو گیا یہ

لے واضح ہے کہ حدیث سے قرآن کا حکم منسوخ نہیں ہوتا کیونکہ قانون سازی انبیاء کا کام نہیں ہے، ان کا کام تو
بس یہ ہے کہ اللہ کے بنائے ہوئے قانون اس کے بندوں تک پہنچا دیں وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (ناشر)

مگر ان لوگوں کے اقوال میں بھی تضاد ہے اور ان کی دلیل کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں۔ اگرچہ ممانعت کی روایت صحیح مسلم میں آئی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خود رسول اللہ ﷺ نے متعہ کی ممانعت فرمادی تھی تو اس کا علم ان صحابہ کو کیوں نہیں ہوا جنہوں نے عہد ابوبکر میں اور عہد عمر کے اوائل میں متعہ کیا، جیسا کہ اس کی روایت خود صحیح مسلم میں ہے یہ :

عطاء کہتے ہیں کہ جابر بن عبد اللہ انصاری عمرہ کے لیے آئے تو ہم ان کی قیام گاہ پر گئے۔ لوگ ان سے ادھر ادھر کی باتیں پوچھتے رہے۔ پھر متعہ کا ذکر چھڑ گیا۔ جابر نے کہا : ہاں ہم نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی متعہ کیا ہے اور ابوبکر اور عمر کے عہد میں بھی۔

اگر رسول اللہ ﷺ متعہ کی ممانعت کر چکے ہوتے تو پھر ابوبکر اور عمر کے زمانے میں صحابہ گئے لیے متعہ کرنا جائز نہ ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ متعہ کی ممانعت کی تھی اور نہ اسے حرام قرار دیا تھا۔ ممانعت تو عمر بن خطاب نے کی۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں آیا ہے :

ابو رجاہ نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ ابن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ متعہ کی آیت کتاب اللہ میں نازل ہوئی تھی چنانچہ ہم نے اس وقت متعہ کیا جب ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ قرآن میں کبھی متعہ کی حرمت نازل نہیں ہوئی، اور نہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات تک متعہ سے منع کیا۔ اس کے بعد ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کیا۔ محمد کہتے ہیں کہ لوگ یہ کہتے تھے کہ ایک شخص سے مراد عمر

۱۔ صحیح مسلم جلد ۴ صفحہ ۱۵۸۔

۲۔ مثلاً زبیر بن العوام نے حضرت ابوبکر کی بیٹی اسماء سے متعہ کیا تھا۔ اس متعہ کے نتیجے میں عبد اللہ بن زبیر اور عروہ بن زبیر پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ امام اہلسنت راجب اصفہانی نے محاضرات الادب میں لکھا ہے۔

(الاشتر)

ہیں یہ

اب دیکھیے ! رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات تک متعہ سے منع نہیں کیا۔ جیسا کہ یہ صحابی تصریح کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ نہایت صاف الفاظ میں اور بغیر کسی ابہام کے متعہ کی حرمت کو عمر سے منسوب کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عمر نے جو کچھ کہا اپنی رائے سے کہا۔

اور دیکھیے :

جابر بن عبد اللہ انصاری صاف کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور ابوبکر کے عہد خلافت میں ایک مٹھی کھجور یا ایک مٹھی آٹے کے عوض متعہ کیا کرتے تھے۔ آخر عمر نے عمرو بن حریث کے قصے میں اس کی ممانعت کر دی یہ

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چند دوسرے صحابہ بھی حضرت عمر کی رائے سے متفق تھے لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ بعض صحابہ تو اس وقت بھی عمر کے ساتھ تھے جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر ہذیان گوئی کی تہمت لگائی تھی اور کہا تھا کہ ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے۔

اور سنئے !

ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں جابر کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا : ابن عباس اور ابن زبیر کے درمیان شعتین کے بارے میں اختلاف ہو گیا ہے۔ اس پر جابر نے کہا : ہم نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دونوں متعہ کیے ہیں، بعد میں عمر نے ہمیں منع کر دیا تو پھر ہم نے کوئی متعہ نہیں کیا یہ

اس لیے ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ بعض صحابہ نے جو شے کی

۱۔ صحیح بخاری جلد ۵ صفحہ ۱۵۸

۲۔ صحیح مسلم جلد ۴ صفحہ ۱۳۱

مانعت رسول اللہ ﷺ سے منسوب کی ہے اس کا مقصد محض عمر کی رائے کی تصویب اور تائید تھا۔ ورنہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کسی ایسی چیز کو حرام قرار دیں جسے قرآن نے حلال ٹھہرایا ہو۔ تمام اسلامی احکام میں ہمیں ایک بھی ایسا حکم معلوم نہیں کہ اللہ جل شانہ نے کسی چیز کو حلال کیا ہو اور رسول اللہ ﷺ نے اسے حرام کر دیا ہو۔ اس کا کوئی قائل بھی نہیں۔ البتہ مخاند اور متعصب کی بات اور ہے۔

اگر ہم برائے بحث یہ مان بھی لیں کہ رسول اللہ ﷺ نے متعہ کی مانعت فرمادی تھی، تو امام علیؑ کو کیا ہو گیا تھا کہ انھوں نے نبی اکرمؐ کے خاص مقرب ہونے کے باوجود اور اسلامی احکام کی سب سے زیادہ واقفیت رکھنے کے باوصف فرما دیا کہ

”متعہ تو اللہ کی رحمت اور بندوں پر اس کا خاص احسان ہے

اگر عمر اس کی مانعت نہ کر دیتے تو کوئی بد بخت ہی زنا کرتا۔“ لے

اس کے علاوہ خود عمر بن خطاب نے بھی یہ نہیں کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے متعہ کی مانعت کر دی تھی بلکہ صاف صاف یہ کہا تھا کہ

مُتَعَتَانِ كَانَتَا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَنَا أَنْهَى عَنْهُمَا وَأَعَاقِبُ عَلَيْهِمَا: مُتْعَةُ الْحَجِّ وَ مُتْعَةُ الْبَيْتَاءِ .

دو متعے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے، اب میں ان کی

مانعت کرتا ہوں اور جو یہ متعے کرے گا اسے سزا دوں گا۔ ان

میں ایک متعہ حج ہے اور دوسرا عورتوں کے ساتھ متعہ ہے لے

حضرت عمر کا یہ قول مشہور ہے۔

مسند امام احمد بن حنبل اس بات کی بہترین گواہ ہے کہ اہل سنت و جماعت

میں متعہ کے بارے میں سخت اختلاف ہے، کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرتے ہوئے

اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں اور کچھ لوگ عمر بن خطاب کی پیروی میں اسے

حرام کہتے ہیں۔ امام احمد نے روایت کی ہے :

ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ انھوں نے کہہ دیا کہ

رسول اللہ ﷺ نے متعہ کرنے کو کہا ہے، تو عروہ بن زبیر نے کہا : متعہ

سے تو ابوبکر اور عمر نے منع کر دیا تھا۔ ابن عباس بولے : یہ عروہ

کا بچہ کیا کہتا ہے ؟ کسی نے کہا : یہ کہتے ہیں کہ ابوبکر اور عمر نے

متعہ سے منع کر دیا تھا۔ ابن عباس نے کہا : مجھے تو ایسا نظر آ رہا

ہے کہ یہ لوگ جلد ہی ہلاک ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں :

رسول اللہ ﷺ نے کہا۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ابوبکر اور عمر نے منع

کر دیا۔ لے

جامع ترمذی میں ہے کہ

عبداللہ بن عمر سے حج کے متعہ کے بارے میں کسی نے سوال کیا

تو انھوں نے کہا : جائز ہے۔ پوچھنے والے نے کہا : آپ کے والد نے

تو اس سے منع کیا تھا۔ ابن عمر نے کہا : تمہارا کیا خیال ہے، اگر

میرے والد تم سے منع کریں اور رسول اللہ ﷺ نے خود تمتع کیا ہو تو

میں اپنے والد کی پیروی کروں یا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی ؟ اس نے

کہا : ظاہر ہے، رسول اللہ ﷺ کے حکم کی۔ لے

اہل سنت و الجماعت نے عورتوں کے متعہ کے بارے میں تو عمر کی بات مان

لی لیکن متعہ حج کے بارے میں ان کی بات نہ مانی۔ حالانکہ عمر نے ان دونوں سے

ایک ہی موقع پر منع کیا تھا، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اس پورے قصبے میں اہم بات یہ ہے کہ ائمہ اہل بیت اور ان کے شیعوں

نے عمر کی بات کو غلط بتایا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ دونوں متعے قیامت تک حلال اور

جائز رہیں گے۔ کچھ علمائے اہل سنت نے بھی اس بارے میں ائمہ اہل بیت

کا اتباع کیا ہے۔ میں ان میں سے تیونس کے مشہور عالم اور زیتونہ یونیورسٹی کے سربراہ شیخ طاہر بن عاشور رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کروں گا۔ انھوں نے اپنی مشہور تفسیر الخبر والنور میں آیت فَمَا اسْتَمَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ کی تفسیر کے ذیل میں منقہ کو حلال کہا ہے۔

علماء کو اسی طرح اپنے عقیدے میں آزاد ہونا چاہیے اور جذبات اور عصبیت سے متاثر نہیں ہونا چاہیے اور نہ کسی کی مخالفت کی پروا کرنی چاہیے۔

اس معاملے میں فیصلہ کُن اور ناقابل تردید دلائل شیعوں کی تائید میں موجود ہیں جن کے سامنے انصاف پسند اور ضدی طبیعت دونوں کو سرسری تسلیم خم کرنا پڑتا ہے

الْحَقُّ يَعْلَمُوْا وَلَا يُعْلَمٰۤى عَلَيْهِ .

حق ہی غالب رہتا ہے، کوئی ایسے مغلوب نہیں کر سکتا !
مسلمانوں کو تو امام علیؑ کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ
”مقتدر رحمت ہے اور یہ اللہ کا احسان ہے جو اس نے

اپنے بندوں پر کیا ہے۔“

اور واقعی اس سے بڑی رحمت کیا ہو سکتی ہے کہ مُتعد شہوت کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھاتا ہے جو کبھی کبھی انسان کو مرد ہو یا عورت اس طرح بے بس کر دیتی ہے کہ وہ درندہ بن جاتا ہے۔ کتنی ہی عورتوں کو مرد اپنی شہوت کی آگ بجھانے کے بعد قتل کر دیتے ہیں !!

مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ سبحانہ نے زانی اور زانیہ کے لیے اگر شادی شدہ ہوں تو سنگسار کیے جانے کی سزا مقرر کی ہے، اس لیے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی رحمت سے محروم رکھے جبکہ اسی نے ان کو اور ان کی فطری خواہشات کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ان کی بہتری کس چیز میں ہے۔

جب خدائے غفور الرحیم نے اپنے بندوں کو اپنے فضل و کرم سے متعین کیا

دے دی ہے تو اب زنا وہی کرے گا جو بالکل ہی بدبخت ہوگا۔ یہی صورت چوری کی ہے۔ چور کی سزا قطعید ہے لیکن اگر مفلسوں اور محتاجوں کے لیے بیٹ الماں موجود ہے تو کوئی بدبخت ہی چوری کرے گا۔

بیت الماں موجود ہے تو کون بدست ہیں پھر؟
 اہلی! میں معافی کا طلبگار ہوں اور توبہ کرتا ہوں کیونکہ میں نوجوانی میں
 دین اسلام سے سخت خفا تھا اور اپنے دل میں کہتا تھا کہ ”اسلام کے احکام بہت
 سخت اور ظالمانہ ہیں جو مرد عورت دونوں کے لیے جنسی عمل پر سزائے موت
 تجویز کرتے ہیں، حالانکہ ہو سکتا ہے کہ یہ جنسی عمل طرفین کی ایک دوسرے سے
 محبت کا نتیجہ ہو۔ پھر سزائے موت بھی کیسی؟ بدترین موت! شگسار کرنے
 کی سزا اور وہ بھی مجمع عام میں کہ کُل عالم دیکھے۔“

اس طرح کا احساس اکثر مسلمان نوجوانوں میں پایا جاتا ہے، خصوصاً آجکل کے زمانے میں، جبکہ مخلوط سوسائٹی، بے پردگی اور بے ہودہ طور طریقوں کی وجہ سے ان نوجوانوں کی لڑکیوں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے، اسکول کالج میں، سڑک پر اور ہر جگہ۔

یہ کوئی معقول بات نہیں ہوگی اگر ہم ایسے مسلمان کا موازنہ جس نے قدیم طرز کے اسلامی معاشرے میں تربیت پائی ہو اس مسلمان سے کریں جو نسبتاً ترقی یافتہ ملک میں رہتا ہو جہاں ہر معاملے میں مغرب کی تقلید کی جاتی ہو۔

اکثر نوجوانوں کی طرح میری بھی جوانی مغرب تہذیب اور دین کے درمیان یا یوں کہہ لیجئے کہ جنسی جبلت اور خواہش اور خوفِ خدا و آخرت کے درمیان مستقل اور دائمی کشمکش میں گزری ہے۔ ہمارے ملکوں میں خوفِ خدا ہی رہ گیا ہے، زنا کی دُنوی سزا تو غائب ہو چکی ہے اس لیے مسلمان صرف اپنے ضمیر کو جواب دہ ہے۔ اب یا تو وہ گھٹن میں وقت گزاریے جس سے ایسے نفسیاتی امراض کا اندیشہ ہوتا ہے جو خطرناک ہو سکتے ہیں یا پھر اپنے آپ کو اور اپنے پروردگار کو دیکر وقتاً فوقتاً بدکاری کے گڑھے میں گرتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی شریعت کے آثار جب ہی میری سمجھ میں آئے جب مجھے تشیع سے واقفیت ہوئی۔

بڑھ چڑھ کر کوشش کرتے رہے ہیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس لیے سی ۲۲
گروہ یا حکومت کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ قرآن میں تحریف کرے یا قرآن کو
بدل دے۔

اگر ہم مشرق، مغرب، شمال، جنوب ہر طرف اسلامی ممالک میں گھوم پھر
کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ساری دنیا میں بغیر ایک حرف کی کسی بیشی کے وہی
ایک قرآن ہے۔ اگرچہ مسلمان خود مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن قرآن وہ واحد
محکم ہے جو انھیں اکٹھا رکھے ہوئے ہے۔ خود قرآن میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ
جہاں تک اس کی تفسیر یا تاویل کا تعلق ہے، ہر فرقے کی اپنی تفسیر ہے جس پر
وہ نازاں اور مطمئن ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ شیعہ تحریف کے قاتل ہیں، یہ محض شیور
پر بہتان ہے۔ شیعہ عقائد میں اس قسم کی کسی بات کا وجود نہیں۔

اگر ہم قرآن کریم کے بارے میں شیعہ عقیدے کے متعلق پڑھیں تو ہمیں معلوم
ہوگا کہ شیعوں کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن پاک ہر طرح کی تحریف سے پاک ہے۔
عقائد الامامیہ کے مؤلف شیخ مظفر کہتے ہیں :

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن وحی الہی ہے جو نبی اکرمؐ پر نازل
ہوئی اور ان کی زبان سے ادا ہوئی۔ اس میں ہر چیز کا واضح بیان
ہے۔ قرآن آپؐ کا لافانی معجزہ ہے۔ انسان اس کا مقابلہ کرنے
سے عاجز ہے، وہ نہ فصاحت و بلاغت میں اس کا مقابلہ کر سکتا
ہے اور نہ وہ ایسے حقائق و معارف بیان کر سکتا ہے جیسے قرآن میں
موجود ہیں۔ اس میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہو سکتی۔

یہ قرآن جو ہمارے پاس موجود ہے اور جس کی ہم تلاوت کرتے
ہیں، یقیناً وہی قرآن ہے جو رسول اکرمؐ پر نازل ہوا۔ جو شخص
اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے وہ گمراہ ہے یا اس کو غلط فہمی ہوئی ہے
بہر حال وہ صحیح راستے پر نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک اللہ کا
کلام ہے، باطل اس میں دخل انداز نہیں ہو سکتا، نہ آگے سے نہ
پیچھے سے۔

میں نے شیعہ عقائد کو ایک رحمت جانا اور ان عقائد میں سماجی، اقتصادی
اور سیاسی مشکلات کا حل پایا۔ ان ہی عقائد کے ذریعے سے مجھے معلوم ہوا کہ اللہ
کے دین میں آسانی ہی آسانی ہے، مشکل کا نام نہیں۔ اللہ نے ہمارے لیے دین میں
تنگی نہیں رکھی۔ امامت رحمت ہے۔ عصمت ائمہ کا عقیدہ رحمت ہے۔ ہزار
رحمت ہے۔ قضا و قدر سے متعلق شیعہ جو کچھ کہتے ہیں رحمت ہے۔ تقدیر رحمت
ہے۔ نکاحِ مُتہ رحمت ہے۔ مختصر بات یہ کہ یہ سب کچھ وہ حق ہے جس کی تعلیم
خاتم النبیین حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی جو رَحْمَةُ الرَّحْمٰن
بنا کر بھیجے گئے تھے۔

مسئلہ تحریفِ قرآن

یہ کہنا کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے بذاتِ خود ایسی شرمناک بات ہے،
جسے کوئی مسلمان جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتا ہو
خواہ شیعہ ہو یا سنی، برداشت نہیں کر سکتا۔

قرآن کی حفاظت کا ذمہ دار خود رب العزت ہے جس نے کہا ہے :
إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ.
”ہم نے ہی یہ قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت
کرنے والے ہیں۔“

اس لیے کسی شخص کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ قرآن میں ایک حرف کی بھی
کمی بیشی کر سکے۔ یہ ہمارے نبیؐ محترمؐ کا غیر فانی معجزہ ہے۔ قرآن میں باطل کا کسی
طرف سے دخل نہیں ہو سکتا، نہ آگے سے نہ پیچھے سے، کیونکہ یہ خدائے حکیم و حمید کی
طرف سے نازل ہوا ہے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عملی طور پر قرآن میں تحریف
کا ہونا ممکن ہی نہیں تھا، کیونکہ بہت سے صحابہ کو قرآن زبانی یاد تھا۔ مسلمان شروع
ہی سے قرآن کو خود حفظ کرنے اور اپنے بچوں کو حفظ کرنے میں ایک دوسرے سے

اس کے علاوہ یہ معلوم ہے کہ شیعہ کہاں کہاں آباد ہیں، ان کے فقہی احکام بھی معلوم ہیں۔ اگر شیعوں کا کوئی اور قرآن ہوتا تو لوگوں کو ضرور اس کا پتہ چل گیا ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی مرتبہ ایک شیعہ ملک میں گیا تو میرے دماغ میں اس قسم کی کچھ افواہیں تھیں۔ جہاں کہیں مجھے کوئی سوئی سیں کتاب نظر آتی، میں اس کو اس خیال سے اٹھا لیتا کہ یہ شاید شیعوں کا نام نہاد قرآن ہو۔ لیکن جلد ہی میرا یہ خیال خام بھاپ بن کر ہوا میں اڑ گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ محض جھوٹا الزام ہے جو شیعوں پر اس لیے لگایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو ان سے نفرت ہو جائے۔ لیکن بہر حال ایک قابل اعتراض کتاب ضرور موجود ہے اور اس کی وجہ سے شیعوں پر ہمیشہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے: **فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب**۔ اس کے مؤلف کا نام محمد تقی نور علی طبرسی (متوفی ۱۳۲۲ھ) ہے۔ یہ شخص شیعہ تھا۔ معترضین یہ چاہتے ہیں کہ اس کتاب کی ذمہ داری شیعوں پر ڈال دی جائے۔ لیکن یہ بات بعید از انصاف ہے۔

کتنی ہی ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جو صرف اپنے مُصنّف یا مؤلف کے سوا کسی کی رستے کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ ان کتابوں میں ہر قسم کی کچی پکی باتیں اور غلط صحیح مضامین ہوتے ہیں۔ اور یہ کوئی شیعوں کی خصوصیت نہیں، سب فرقوں میں اس قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ الزام تو اہل سنت پر زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔ اب کیا یہ درست ہوگا کہ ہم قرآن اور زمانہ جاہلیت کے اشعار سے متعلق مصر کے سابق وزیر تعلیم **عبد الادب النورانی** ڈاکٹر طہ احسین کی تحریروں کی ذمہ داری اہل سنت پر ڈال دیں؟

یا قرآن میں کئی ہمیشی سے متعلق ان روایات کی ذمہ داری جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں اہل سنت پر ڈال دیں؟
اس سلسلے میں جامع ازہر کے شریعت کالج کے پرنسپل پروفیسر مدنی نے بڑی

لے **فصل الخطاب** کی تو شیعوں کے یہاں کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ سنیوں کے یہاں قرآن میں کئی ہمیشی کی روایات ان کی معتبر ترین کتابوں بخاری، مسلم وغیرہ میں موجود ہیں۔

اچھی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہ کہنا کہ شیعہ امامیہ اس کے قائل ہیں کہ موجود قرآن میں **مَعَاذَ اللہ** کچھ کس ہے، تو یہ نہایت لغو بات ہے۔ ان کی کتابوں میں کچھ ایسی روایات ضرور ہیں لیکن ایسی روایات تو ہماری کتابوں میں بھی ہیں۔ مگر فریقین کے اہل تحقیق نے ان روایات کو ناقابل اعتبار اور وضعی کہا ہے۔ جس طرح اہل سنت میں کوئی قرآن مجید میں کئی ہمیشی کا قائل نہیں اسی طرح اثنا عشری شیعوں اور زیدی شیعوں میں بھی کوئی اس کا قائل نہیں۔“
جو کوئی اس طرح کی روایات دیکھنا چاہے وہ شیعوں کی **الاتقان فی علوم القرآن** میں دیکھ سکتا ہے۔

۱۲۹۸ء میں ایک مصری نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام **الفرقان** ہے اس کتاب میں اس نے اس قسم کی بہت سی موضوع اور ناقابل اعتبار روایات سنیوں کی کتابوں سے نقل کی ہیں۔ جامعہ ازہر نے اس کتاب کی روایات کے بطلان اور فساد کو علمی دلائل سے ثابت کرنے کے بعد حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب کو ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ حکومت مصر نے یہ مطالبہ منظور کر کے کتاب کو ضبط کر لیا۔ کتاب کے مُصنّف نے معاوضے کے لیے دعویٰ دائر کیا لیکن کونسل آف اسٹیٹ کی عدالتی کمیٹی نے یہ دعویٰ مسترد کر دیا۔

کیا ایسی کتابوں کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہل سنت قرآن کے تقدس کے کُنکر ہیں یا چونکہ فلاں شخص نے ایسی روایت بیان کی ہے یا ایسی کتاب لکھی ہے اس لیے اہل سنت قرآن میں نقص کے قائل ہیں؟

یہی صورت شیعہ امامیہ کے ساتھ ہے۔ جس طرح ہماری بعض کتابوں میں کچھ روایات ہیں، اسی طرح ان کی بعض کتابوں میں بھی کچھ روایات ہیں۔ اس بارے میں علامہ شیخ **ابوالفضل بن حسن طبرسی** جو چھٹی صدی ہجری کے بہت بڑے شیعہ عالم تھے اپنی کتاب **مجمع البیان فی تفسیر القرآن** میں لکھتے ہیں:

”اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ قرآن میں کوئی زیادتی نہیں“

ہوتی۔ جہاں تک کسی کا تعلق ہے، تو ہمارے ایک گروہ کا اور اہل سنت میں سے حشوتیہ کا یہ کہنا ہے کہ قرآن میں کسی ہوتی ہے لیکن ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب اس کے خلاف ہے۔ اسی کی تائید سید مرتضیٰ علم الہدی (رحمہ اللہ) نے کی ہے اور اس مسئلہ پر بڑی تفصیل کے ساتھ مسائل الطرابلسیات کے جواب میں کئی جگہ روشنی ڈال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :

”یہ قرآن بالکل صحیح نقل ہوتا چلا آیا ہے، اس کا ہمیں ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ مختلف ملکوں کے وجود کا یقین، بڑے بڑے واقعات کا یقین، مشہور کتابوں کا یقین اور عربوں کے اشعار کا یقین۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن کی نقل میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ متعدد دعوے سے یہ ضروری تھا کہ قرآن کو نقل کرتے ہوئے اس کی حفاظت اور نگرانی پر خاص توجہ دی جائے، کیونکہ قرآن رسول اللہ کا معجزہ ہے اور علوم شرعیہ اور احکام دینیہ کا ماخذ ہے۔ مسلمان علماء نے قرآن شریف کی حفاظت اور حمایت میں انتہائی کوشش صرف کی ہے۔ انھیں ہر اختلافی معاملے کا مکمل علم ہے، جیسے اعراب کا اختلاف، مختلف قرائتیں، قرآن شریف کے حروف اور آیات کی تعداد۔ ان تمام امور پر اس قدر دل جان سے توجہ اور احتیاط کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن کے کسی حصے کو بدل دیا جائے یا حذف کر دیا جائے“

ہم ذیل میں کچھ روایات پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام! آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ قرآن میں کسی بیشی کی تہمت اہل سنت پر زیادہ چسپاں ہوتی ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اہل سنت کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی کمزوری کو دوسروں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنے تمام عقائد پر نظر ثانی

کرنی پڑی، کیونکہ میں جب بھی کسی بات پر شیعوں پر نکتہ چینی یا اعتراض کرتا تھا شیعہ یہ ثابت کر دیتے تھے کہ یہ کمزوری ان میں نہیں بلکہ اہل سنت میں ہے اور مجھے جلد معلوم ہو جاتا کہ شیعہ سچ کہتے ہیں۔ وقت گزرنے اور بحث و مباحثہ کے نتیجے میں مجھے اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ شاید آپ کو بھی یہ معلوم کرنے کا شوق ہو کہ اہل سنت کی اپنی کتابوں سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ اہل سنت قرآن میں تحریف اور کمی زیادتی کے قائل ہیں۔ تو بھیجیے نیچے :

طبرانی اور بیہقی کی روایت ہے کہ قرآن میں دو سورتیں ہیں : ایک یہ ہے :

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ . اِنَّا نَسْتَغْفِرُكَ
وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُنْنِيْ عَلَيْكَ الْخَيْرَ كُلَّهُ وَلَا
نُكَفِّرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَفْجُرُكَ .

دوسری سورت یہ ہے :

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ . اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ
تَعْبُدُ وَلكَ نَصْلِيْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰی وَنَعْبُدُ
تَرْجُوْ رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ
بِالْكَافِرِیْنَ مُلْحَقٌ .

ان دونوں سورتوں کو ابوالقاسم حسین بن محمد المعروف بہ راغب اصفہانی (رحمہ اللہ) نے محاضرات الادباء میں قنوت کی سورتیں کہا ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب ان ہی سورتوں کو دُعائے قنوت کے طور پر پڑھتے تھے۔ یہ دونوں سورتیں ابن عباس کے مصنف اور زید بن ثابت کے مصنف میں موجود تھیں۔
امام احمد بن حنبل شیبانی (رحمہ اللہ) نے اپنی مسند میں ابی بن کعب سے روایت بیان کی ہے کہ
ابی بن کعب نے پوچھا کہ سورۃ اخراہ تم کتنی پڑھتے ہو؟

کسی نے کہا: ستر سے کچھ اوپر آئیں ہیں۔ اُبی بن کعب نے کہا کہ میں نے یہ سُورت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھی ہے، یہ سُورۃ بقرہ کے برابر یا اس سے بھی کچھ بڑی ہے، اسی میں آیۃ رُجم ہے۔ لہ

اب آپ دیکھیے کہ یہ دونوں سُورتیں جو سیوطی کی اِتقان اور دُرْمُتور میں موجود ہیں اور جن کے متعلق طبرانی اور بیہقی نے روایت بیان کی ہے اور جن کو قنوت کی سُورتیں کہا ہے ان کا کتاب اللہ میں کہیں کوئی وجود نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو قرآن ہمارے پاس ہے وہ ان دو سُورتوں کی حد تک جو مصحف ابن عباس اور مصحف زید بن ثابت میں موجود تھیں، ناقص ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس مصحف کے علاوہ جو ہمارے پاس ہے اور بھی کئی مصحف تھے۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ اہل سنت طعنہ دیا کرتے ہیں کہ شیعہ مصحفِ فاطمہ کے قائل ہیں۔ اب دیکھ لیجیے!

اہل سنت یہ دونوں سُورتیں ہر روز صبح کو دعائے قنوت میں پڑھتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر یہ دونوں سُورتیں زبانی یاد تھیں اور میں فجر کے وقت دعائے قنوت میں پڑھا کرتا تھا۔

دوسری روایت جو امام احمد نے اپنی مُسند میں بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ آخزاب تین چوتھائی کم ہے، کیونکہ سورۃ بقرہ میں ۲۸۶ آیات ہیں جبکہ موجودہ سورۃ آخزاب میں صرف ۷۳ آیات ہیں۔ اگر ہم حزب کے اعتبار سے شمار کریں تو سورۃ بقرہ پانچ سے زیادہ احزاب پر مشتمل ہے جبکہ سورۃ آخزاب صرف ایک حزب شمار ہوتی ہے۔ (ایک حزب تقریباً نصف پائے کا ہوتا ہے۔)

حیرت کا مقام ہے کہ اُبی بن کعب یہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سورۃ آخزاب پڑھا کرتا تھا، یہ سُورت، سورۃ بقرہ کے مُساوی یا اس سے کچھ بڑی

تھی۔ یہ اُبی بن کعب زمانہ نبوی کے مشہور ترین قاریوں میں سے ہیں۔ حافظ قرآن تھے، خلیفہ ثانی نے نماز تراویح کی امامت کے لیے انھی کا انتخاب کیا تھا۔ ان کے اس قول سے شک بھی پیدا ہوتا ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے حیرت بھی ہوتی ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی مُسند میں اُبی بن کعب سے ایک اور روایت بیان کی ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں قرآن پڑھ کر سناؤں۔ چنانچہ آپ نے کَمُرَکِیْنِ الذِّنِّ کَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْکِتَابِ سے پڑھنا شروع کیا۔ اس میں آپ نے یہ بھی پڑھا:

وَلَوْ أَنَّ ابْنَ آدَمَ سَأَلَ وَادِيًا مِنْ مَّالٍ فَأُعْطِيَهُ لَسَأَلَ ثَانِيًا فَلَوْ سَأَلَ ثَانِيًا فَأُعْطِيَهُ لَسَأَلَ ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التَّرَابُ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ تَابَ وَإِنَّ ذَلِكَ الْذِّنُّ الْقَتِيمُ عِنْدَ اللَّهِ

حافظ ابن عساکر نے اُبی بن کعب کے حالات کے ضمن میں روایت بیان کی ہے کہ

أَبُو الدَّرْدَاءِ چند اہل دمشق کے ساتھ مدینہ گئے، وہاں عمر بن خطاب کے سامنے یہ آیت پڑھی:

إِنْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَلَوْ حَمِيَّتُمْ كَمَا حَمَوْا لَفَسَدَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ

عمر بن خطاب نے پوچھا: تمہیں یہ قرأت کس نے سکھائی ہے۔ ان لوگوں نے کہا: اُبی بن کعب نے۔ عمر نے ان کو بلایا۔

جب وہ آگئے تو ان لوگوں سے کہا : اب پڑھو، انھوں نے پھر اسی طرح پڑھا :

وَلَوْ حَمَيْتُمْ كَمَا حَمَوْا لَفَسَدَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ .

ابن کعب نے کہا کہ ہاں یہ میں نے ان کو پڑھایا ہے عمر بن خطاب نے زید بن ثابت سے کہا : زید تم پڑھو ! زید نے وہی معمول کی قرات کے مطابق تلاوت کی۔ عمر نے کہا مجھے بھی بس یہی قرات معلوم ہے۔ اس پر ابی بن کعب نے کہا کہ عمر آپ جانتے ہیں کہ میں رسول اللہ کی خدمت میں رہتا تھا اور یہ غائب ہوتے تھے۔ میں رسول اللہ کے قریب تھا یہ دور تھے۔ آپ چاہیں تو واللہ میں اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو جاؤں، پھر نہ کسی سے بات کروں گا نہ تم سے دم تک کسی کو پڑھاؤں گا۔ عمر نے کہا : اللہ مجھے شاف کرے ! ابی تم جانتے ہو کہ اللہ نے تمھیں علم عطا کیا ہے، تو جو کچھ تمھیں معلوم ہے لوگوں کو سکھاؤ۔

کہتے ہیں ایک دفعہ ایک لڑکا حضرت عمر کے سامنے سے گزرا، وہ قرآن میں دیکھ کر پڑھ رہا تھا :

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ وَهُوَ أَبْلَغُهُمْ .

حضرت عمر نے کہا : لڑکے اس کو کاٹ دو۔ لڑکے نے جواب دیا یہ ابی بن کعب کا مصنف ہے۔ جب وہ لڑکا ابی بن کعب کے پاس پہنچا تو ان سے جا کر اس آیت کے بارے میں پوچھا۔ ابی نے کہا : مجھے تو قرآن میں مزا آتا تھا تم بازاروں میں تالیاں بجاتے پھرتے ہو۔ لے

ایسی ہی روایت ابن اثیر نے جامع الاصول میں، ابو داؤد نے اپنی سنن میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں بیان کی ہے۔

قارئین کرام ! اب کی دفعہ یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ ان روایات پر کیا تبصرہ کرتے ہیں۔ ایسی روایات سے اہل سنت کی کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن انھیں اس کا احساس نہیں۔ وہ شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں جن کی کتابوں میں اس کا عشر عشر بھی نہیں۔

ممکن ہے کہ اہل سنت میں سے بعض ضدی طبیعت کے لوگ حسب عادہ ان روایات کا انکار کر دیں اور امام احمد بن حنبل پر اعتراض کریں کہ انھوں نے ایسی ضعیف سند کی روایات کو اپنی کتاب میں شامل کیا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ بھی کہیں کہ مسند امام احمد اہل سنت کے نزدیک صحاح میں شامل نہیں ہے۔

میں اہل سنت کی عادت خوب جانتا ہوں۔ جب بھی میں ان کتابوں سے کوئی ایسی حدیث پیش کرتا تھا جو شیعوں کے لیے بُرا یا قاطع ہوتی تو یہ سُنی بھاگ نکلتے تھے اور ان کتابوں پر اعتراض کرنے لگتے تھے جن کو وہ خود صحاح ستہ کہتے ہیں یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ۔ بعض لوگ ان کتابوں کے ساتھ سنن دارمی، مؤطا مالک اور مسند امام احمد کو بھی صحاح میں شامل سمجھتے ہیں۔

میں چند ایسی ہی روایات ان ضدی لوگوں کو گھر تک پہنچانے کے لیے صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے پیش کرتا ہوں شاید ان کی حقیقت تک رسائی ہو سکے اور شاید وہ حقیقت کو بغیر کسی تعصب کے قبول کر لیں۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب مناقب عمار و حذیفہ رضی اللہ عنہما میں علقہ سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں :

”جب میں دمشق پہنچا تو میں نے وہاں پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھی اور پھر دعا کی کہ ”اے اللہ ! مجھے کوئی نیک اور اچھا ہم نشین عطا

پڑھایا ہے۔ ۱۷
ان تمام روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو قرآن اب ہمارے پاس ہے
اس میں وَمَا خَلَقَ كَالْفَضْلِ اضافہ ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباس سے روایت بیان کی ہے کہ
عمر بن خطاب کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا اور ان پر کتاب نازل فرمائی، اس
میں آیت رَجُمَ بھی تھی، ہم نے اس آیت کو پڑھا، سمجھا، یاد کیا
چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی رجم کی سزا دی۔ آپ کے بعد ہم نے
بھی سنگسار کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر اسی طرح وقت گزرتا رہا
تو کوئی کہیں یہ نہ کہہ دے: ہمیں تو رجم کی آیت کتاب اللہ میں
ملتی ہی نہیں۔ اور اس طرح اللہ کے ایک حکم کو جو اللہ نے
نازل کیا ہے، ترک کر کے لوگ گمراہ نہ ہو جائیں۔ رجم کی سزا
برحق ہے۔ اگر کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو اسے یہ
سزا دی جائے گی بشرطیکہ ثبوت موجود ہو یا حل رہ جائے یا مجرم
اقرار کر لے۔

اس کے علاوہ ہم کتاب اللہ میں ایک اور آیت بھی پڑھا
کرتے تھے جو اس طرح تھی:

لَا تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ فَإِنَّهُ كُفْرٌ بِكُمْ أَنْ تَرْغَبُوا
عَنْ آبَائِكُمْ

یا اس طرح تھی کہ:

إِنَّ كُفْرًا بِكُمْ أَنْ تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ. ۱۸

امام مسلم نے اپنی صحیح میں (باب لَوْ أَنَّ لِبْنِ آدَمَ وَادِئِينَ لَا يَبْتَغِي

کرے۔ اس کے بعد میں کچھ لوگوں کے پاس جا کر بیٹھا تو وہاں
ایک بڑے میاں تشریف لے آئے۔ وہ آکر میرے پہلو میں بیٹھ
گئے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ معلوم ہوا کہ ابوالدرداء ہیں
میں نے ان سے کہا کہ میں نے دُعا کی تھی کہ کوئی نیک اور اچھا
ہمنشین مل جائے، اللہ میاں نے آپ کو بھیج دیا۔ انھوں نے
مجھ سے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے جواب
دیا کہ میں اہل کوفہ سے ہوں۔ انھوں نے کہا: کیا تمھاری یہاں
ابن اُمّ عتبہ نہیں ہیں جن کے پاس رسول اللہ ﷺ کے نعلین آپ
کا بچھونا اور آپ کا لوٹا تھا؟ اور تمھارے یہاں وہ بھی تو ہیں
جن کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے انھیں شیطان
سے بچالیا ہے۔ اور کیا تمھارے یہاں وہ بزرگ نہیں جو رسول اللہ ﷺ
کے رازدار تھے جن کو وہ راز معلوم تھے جو اور کسی کو معلوم نہیں تھے
پھر کہنے لگے: عبد اللہ اس آیت کو ایسے پڑھتے ہیں: وَالَّذِينَ

إِذَا يَغْشَى؟

میں نے پڑھ کر سنایا: وَالَّذِينَ إِذَا يَغْشَى وَالنَّهَارَ إِذَا
تَجَلَّى وَالذِّكْرَ وَالْأُنْثَى.

نیز یہ کہا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے منہ در منہ ایسے ہی پڑھایا تھا۔
ایک اور روایت میں یہ اضافہ ہے:

”یہ لوگ میرے پیچھے لگے رہے۔ یہ مجھ سے وہ چیز چھڑانا چاہتے تھے
جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی۔“ ۱۹

ایک روایت میں ہے کہ

وَالَّذِينَ إِذَا يَغْشَى وَالنَّهَارَ إِذَا تَجَلَّى وَالذِّكْرَ
وَالْأُنْثَى یہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے خود بالمشافہہ بٹھا کر

۱۷ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ باب مناقب عبد اللہ بن مسعود۔

۱۸ صحیح بخاری جلد ۸ باب رجم الحبلى من الزنا إذا أخصنت۔

إِلَٰهًا) ایک روایت بیان کی ہے کہ
ابوموسیٰ اشعری نے بصرہ کے قاریوں کو بلایا تو تین سو
آدمی آئے جنہوں نے قرآن پڑھا ہوا تھا۔ ابوموسیٰ نے کہا:
آپ لوگ بصرہ کے بہترین آدمی ہیں، آپ نے قرآن پڑھا ہے۔
آپ اس آیت سے قرآن پڑھ کر بنائیں:
وَلَا يَطُولَنَّ عَلَيْكُمْ الْأَمْرُ فَتَفْسُقُوا قُلُوبَكُمْ كَمَا
فَسَدَتْ قُلُوبُ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ۔

ابوموسیٰ اشعری نے یہ بھی کہا کہ ہم ایک سورت پڑھا کرتے
تھے جسے ہم طوالت اور اس کے سخت لب و لہجہ کے لحاظ سے
سورۃ براءۃ کے ساتھ تشبیہ دیا کرتے تھے۔ اب میں وہ بھول
گیا ہوں، لیکن اس میں سے اتنا اب بھی یاد ہے:

لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَّالٍ لَا تَبْغِي وَادِيَا
ثَلَاثًا وَلَا يَمْلِكُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ۔

اور ہم ایک اور سورت پڑھا کرتے تھے جسے ہم کہتے تھے کہ یہ
مُسَبَّحَاتِ میں سے کسی ایک سورت کے برابر ہے، وہ بھی میں بھول
گیا ہوں، اس میں سے اتنا البتہ یاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ
فَتَكْتُبُ شَهَادَةً فِي أَعْيُنِكُمْ فَتُسْأَلُونَ عَنْهَا يَوْمَ
الْقِيَامَةِ۔

یہ دو فرضی سورتیں جو ابوموسیٰ بھول گئے تھے ان میں ایک بقول ان کے
اہل بیت کے برابر تھی۔ یعنی ۱۲۹ آیات کی اور دوسری مسَبَّحَاتِ میں سے کسی
کے برابر تھی۔ دوسرے لفظوں میں تقریباً ۲۰ آیات کے برابر۔ ان دونوں

۱۔ سورتیں جو سُبَّحَاتِ، سَبَّحَ، يُسَبِّحُ یا سَبَّحَ سے شروع ہوتی ہیں جیسے سورۃ اٰہراء
حدید، سورۃ حشر، سورۃ صف، سورۃ جمع، سورۃ تہائم اور سورۃ اعلیٰ۔ (نابشر)

سورتوں کا وجود صرف ابوموسیٰ کے ذہن میں تھا۔ قارئین کرام! اب آپ کو اختیار
ہے، یہ سب پڑھ کر اور سن کر آپ حیرت سے ہنسیں یا روتیں۔
جب اہل سنت کی کتابیں اور احادیث کے معتبر مجموعے اس طرح کی روایات
سے پُر ہیں جن میں کبھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن ناقص ہے اور کبھی کہا جاتا ہے
کہ اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے، پھر یہ شیعہوں پر اعتراض کیسا جن کا اس پر اتفاق
ہے کہ ایسے سب دعویٰ غلط اور باطل ہیں؟

اگر فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب کے مصنف نے
جو ۳۲۲ھ میں فوت ہوا، اب سے تقریباً سو سال پہلے اپنی کتاب لکھی تھی، تو
اس سے پہلے الفرقان کا مصنف مصر میں چار سو برس ہوئے اپنی کتاب لکھ چکا
تھا جیسا کہ شیخ محمد مدنی پرنسپل شریعہ کالج جامعہ ازہر کا بیان ہے^۱
ہو سکتا ہے کہ شیخ مصنف نے سنی مصنف کی کتاب الفرقان پڑھی ہو،
جس نے اپنی کتاب میں وہ تمام روایات جمع کر دی تھیں جو اہل سنت کی صحاح میں
آئی ہیں۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس کتاب کو جامعہ ازہر کی درخواست پر مصری حکومت
نے ضبط کر لیا تھا۔ یہ تو معلوم ہے کہ اَلْاَنْسَانُ حَرِيصٌ عَلَى مَا مَنَعَ مِنْهُ کے
بمصادق جس چیز سے منع کیا جائے اس کا دُکنا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب گو مصر
میں ممنوع تھی لیکن دوسرے اسلامی ممالک میں ممنوع نہیں تھی، اس لیے یہ عین
ممکن ہے کہ فصل الخطاب جو چار سو برس بعد لکھی گئی الفرقان ہی کا چرہ برہنہ
بغل بچہ ہو۔

اس تمام بحث میں اہم بات یہ ہے کہ سنی اور شیعہ علماء اور محققین نے
اس طرح کی روایات کو باطل اور شاذ کہا ہے اور اطمینان بخش دلائل سے ثابت
کیا ہے کہ جو قرآن ہمارے پاس ہے، وہ بعینہ وہی قرآن ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اس میں نہ کوئی کمی بیشی ہے اور نہ کوئی تغیر و تبدل۔
پھر ان روایات کی بنیاد پر جو خود ان کے نزدیک ساقط الاعتبار ہیں، یہ

اہل سنت کیسے شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں اور خود کو بری الذمہ ٹھہراتے ہیں جبکہ ان کی صحاح ان روایات کی صحت کو ثابت کرتی ہیں۔

مسلمانو! یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا۔ سچ کہا ہے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے: ”یہ لوگ دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھتے ہیں مگر انھیں اپنی آنکھ کا شہتر نظر نہیں آتا۔“

میں اس طرح کی روایات کا ذکر بڑے افسوس کے ساتھ کر رہا ہوں کیونکہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان کے بارے میں سکوت اختیار کریں اور انھیں خاموشی سے ردی کی ٹوکری کے حوالے کر دیں۔

کاش بعض مصنفین جو سنت رسول کی پیروی کے مدعی ہیں شیعوں پر رکیک حملے نہ کرتے۔ کچھ معروف ادارے شیعوں کی تکفیر کرنے میں ان مصنفین کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انھیں سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔

ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد سے تو اس طرح کی کارروائیاں اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہیں۔

میں ان سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔

وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا
وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً
فَاَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصْبِرْتُمْ بِنِعْمَةِ اٰخِوََانَا.

جمع بین الصَّلَاتین

جن باتوں پر شیعوں پر اعتراض کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ شیعہ ظہر اور عصر کی نمازیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھتے ہیں۔ اہل سنت جب اس سلسلے میں شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں تو عموماً اس طرح کی تصویر کھینچتے ہیں گویا وہ خود نماز کو صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلٰی الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا.

مؤمنین پر نماز وقت مقررہ پر فرض کی گئی ہے۔

اہل سنت اکثر شیعوں کو طعنہ دیا کرتے ہیں کہ شیعہ نماز کی پروا نہیں کرتے اور اس طرح خدا و رسول کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم شیعوں کے حق میں یا ان کے خلاف کوئی فیصلہ کریں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس موضوع کا ہر پہلو سے جائزہ لیں، طرفین کے اقوال اور دلائل شنیں اور معاملہ کو اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ جلد بازی میں کسی کے خلاف کوئی یکطرفہ فیصلہ نہ کر بیٹھیں۔

اہل سنت کا اس پر تو اتفاق ہے کہ ۹ رذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھی جائیں، اس کو جمع تقدیم کہتے ہیں اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھی جائیں، اسے جمع تاخیر کہا جاتا ہے۔ یہاں تک تو شیعہ سستی کیا تمام ہی فرقوں کا اتفاق ہے۔

شیعہ سستی اختلاف اس میں ہے کہ کیا ظہر اور عصر کی نمازیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں پورے سال سفر کے عذر کے بغیر بھی جمع کرنی جائز ہیں؟ حنفی حضرات صریح نصوص کے باوجود نمازیں جمع کرنے کی اجازت کے قائل نہیں حتیٰ کہ سفر کی حالت میں بھی نمازیں اکٹھی پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس طرح حنفیوں کا طرز عمل اس اجماع امت کے خلاف ہے جس پر شیعوں اور سنیوں

دروں کا اتفاق ہے۔

لیکن مالکی، شافعی اور حنبلی سفر کی حالت میں تو دو فرض نمازوں کے اکٹھا پڑھ لینے کے جواز کے قائل ہیں۔ لیکن ان میں اس پر اختلاف ہے کہ کیا خوف، بیماری یا بارش وغیرہ کے عذر کی وجہ سے بھی دو نمازوں کا اکٹھا پڑھ لینا جائز ہے۔

شیعہ امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جمع بین الصلّاتین مطلقاً جائز ہے اور اس کے لیے سفر، بیماری یا خوف وغیرہ کی کوئی شرط نہیں۔ وہ اس سلسلے میں ائمہ اہل بیت کی ان روایات پر عمل کرتے ہیں جو شیعہ کتابوں میں موجود ہیں۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم شیعہ موقف کو شک کی نگاہ سے دیکھیں کیونکہ جب بھی اہل سنت ان کے طریقے کے خلاف کوئی دلیل پیش کرتے ہیں وہ اسے یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ انھیں تو ائمہ اہل بیت نے خود تعلیم دی ہے اور ان کی تمام شکلات کو حل کیا ہے۔ وہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ وہ ان ائمہ معصومین کی پیروی کرتے ہیں جو قرآن و سنت کا پورا علم رکھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے پہلی مرتبہ جو ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھیں وہ شہید محمد باقر صدرؒ کی امامت میں پڑھی تھیں۔ ورنہ اس سے قبل میں نجف میں بھی ظہر اور عصر کی نمازیں الگ الگ ہی پڑھا کرتا تھا۔ آخر وہ مبارک دن بھی آگیا جب میں آیت اللہ صدرؒ کے ساتھ ان کے گھر سے اس مسجد میں گیا جہاں وہ اپنے مقلدین کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے مقلدین نے میرے لیے احتراماً عین ان کے پیچھے جگہ چھوڑ دی۔ جب ظہر کی نماز ختم ہو گئی اور عصر کی جماعت کھڑی ہوئی تو میرے جی نے کہا اب یہاں سے نکل چلو۔ لیکن میں دو وجہ سے ٹھہرا رہا۔ ایک تو شیعہ صدر کی ہیبت تھی۔ جس خشوع سے وہ نماز پڑھا رہے تھے، میرا دل چاہتا تھا کہ وہ نماز پڑھاتے ہی رہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جس جگہ میں تھا وہ جگہ اور سب نمازیوں کی نسبت ان سے زیادہ قریب تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی زبردست طاقت نے مجھے ان کے ساتھ باندھ دیا ہو۔

نماز سے فارغ ہوتے تو لوگ ان سے سوالات پوچھنے کے لیے اُٹھ پڑے ہیں ان کے پیچھے بیٹھا ہوا لوگوں کے سوال اور ان کے جواب سنتا رہا۔ بعض سوال جواب

بہت آہستہ ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آئے۔ لیکن مجھے شرم آرہی تھی۔ میں ان پر اور زیادہ بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے کھانا کھلانے کے لیے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ اس دعوت کا خاص مہمان اور میرٹھ میں ہی ہوں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے جمع بین الصلّاتین کے بارے میں دریافت کیا۔

آیت اللہ سید محمد باقر صدر نے جواب دیا :

ہمارے یہاں ائمہ معصومین علیہم السلام سے بہت سی روایات ہیں کہ رسول اللہؐ نے یہ نماز پڑھی یعنی ظہر اور عصر کی نمازوں کو جمع کیا اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کیا۔ اور یہ نمازیں خوف یا سفر کی وجہ سے نہیں بلکہ اُمت سے حرج دور کرنے کے لیے اکٹھی پڑھیں۔

میں : میں حرج کا مطلب نہیں سمجھا۔ قرآن شریف میں بھی ہے : وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ۔

سید صدر : اللہ سبحانہ کو ہر شے کا علم ہے۔ اسے معلوم تھا کہ بعد کے زمانے میں وہ چیزیں ہوں گی جنہیں ہمارے یہاں پبلک ڈیوٹیز کہا جاتا ہے پھر اس طرح کی سرکاری ملازمتیں : جیسے گارڈ، پولیس، لوئرز، فوج پبلک اداروں میں کام کرنے والے ملازمین، حتیٰ کہ طلبہ اور اساتذہ بھی۔ اگر دین ان سب کو پانچ متفرق اوقات میں نمازیں پڑھنے کا پابند کرے تو یقیناً ان کے لیے تنگی اور پریشانی ہوگی، اس لیے رسول اللہؐ کے پاس وحی آئی کہ وہ دو فرض نمازیں ایک وقت میں پڑھا دیں تاکہ نماز کے اوقات پانچ کے بجائے تین ہو جائیں۔ یہ صورت مسلمانوں کے لیے زیادہ سہل تھی اور اس میں کوئی حرج یعنی تنگی بھی نہیں ہے۔

میں : لیکن سنت نبوی قرآن کو تو منسوخ نہیں کر سکتی۔

سید صدر : میں نے کب کہا کہ سنت نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ لیکن اگر کسی چیز کو سمجھنے میں دقت ہو تو سنت قرآن کی تفسیر و توضیح تو کر سکتی ہے۔

میں : اللہ سبحانہ کہتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

كِتَابًا مَّقْشُورًا - اور مشہور حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ ص کے پاس آئے اور آپ نے دن رات میں پانچ وقت نماز پڑھی۔ اس پر ان نمازوں کے نام ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر رکھے گئے۔

سید صدر: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّقْشُورًا کی تفسیر رسول اللہ ص نے دو طرح سے کی ہے۔ الگ الگ نمازوں سے بھی اور جمع بین الصلّاتین سے بھی۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ پانچ نمازیں پانچ مختلف اوقات میں بھی پڑھی جاسکتی ہیں اور تین اوقات میں بھی جمع کی جاسکتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں وہ صبح وقت پر ادا ہوں گی۔

میں: قبلہ! میں سمجھا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پھر کِتَابًا مَّقْشُورًا کیوں کہا ہے؟

سید صدر: (مسکراتے ہوئے) آپ کا کیا خیال ہے، مسلمان جمع میں وقت پر نماز نہیں پڑھتے؟ کیا وہ اس وقت احکام الہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں جب وہ عرفات میں ظہر اور عصر کی نماز کے لیے اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز کے لیے رسول اللہ ص کی پیروی میں جمع ہوتے ہیں۔

میں نے ذرا سوچ کر کہا: شاید ایسا عذر کی وجہ سے ہو۔ حجاج تھک جاتے ہیں اس لیے اللہ نے اس موقع پر ان کے لیے کچھ سہولت کر دی۔

سید صدر: یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے متاخرین سے تنگی دور کر دی اور دین کو آسان بنا دیا۔

میں: آپ نے ابھی کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے پاس وحی بھیجی کہ دو وقت کی فرض نمازیں ایک وقت میں پڑھائیں تاکہ نمازوں کے وقت پانچ کے بجائے تین ہو جائیں، تو یہ اللہ نے کس آیت میں کہا ہے؟

سید صدر نے فوراً جواب دیا: کون سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے کہ وہ دو نمازیں عرفات میں اور دو مزدلفہ میں جمع کریں اور پانچ وقتوں کا کس آیت میں ذکر ہے؟

میں اس دفعہ خاموش ہو گیا، کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں مطمئن ہو چکا تھا۔

سید صدر نے مزید کہا: اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو جو وحی بھیجتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ قرآن میں ہی ہو اور وحی مَقْشُورٌ ہی ہو:

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِذَاذًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِثْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا -

آپ کہہ دیجیے کہ اگر سب سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے روشنائی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہیں ہوں گی اگرچہ ہم ایسا ہی اور سمندر اس کی مدد کے لیے لے آئیں۔ (سورۃ کہف - آیت ۱۰۹)

جسے ہم سنت نبوی کہتے ہیں، وہ بھی وحی الہی ہی ہے، اس لیے اللہ سبحانہ نے کہا ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا -

جس کا رسول تمہیں حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو۔

بالفاظ دیگر - جب رسول اللہ ص صحابہ کو کسی کام کا حکم دیتے تھے یا کسی کام سے منع کرتے تھے تو صحابہ کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ آپ پر کوئی اعتراض کرتے یا آپ سے یہ مطالبہ کرتے کہ کلام اللہ کی کوئی آیت پیش کریں۔ وہ آپ کے حکم کی تعمیل یہ سمجھ کر کرتے تھے کہ آپ جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ وحی الہی ہوتا ہے۔

سید باقر صدر نے ایسی ایسی باتیں بتلائیں کہ میں حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے میں ان حقائق سے ناواقف تھا۔

میں نے جمع بین الصلّاتین کے موضوع سے متعلق ان سے مزید پوچھا: قبلہ! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان دو نمازیں ضرورت کی صورت میں جمع کر لے؟

”دو نمازوں کا جمع کرنا ہر حالت میں جائز ہے، ضرورت ہو یا نہ ہو۔“

میں نے کہا : اس کے لیے آپ کے پاس دلیل کیا ہے ؟

انھوں نے کہا : اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں دو فرض نمازوں کو جمع کیا ہے اور اس وقت آپ سفر میں نہ تھے ۔ نہ کوئی خوف تھا نہ بارش ہو رہی تھی اور نہ کوئی ضرورت تھی ، صرف ہم لوگوں سے تنگی رفع کرنے کے لیے آپ نے دو نمازوں کو اکٹھا پڑھا ۔ اور یہ بات ہمارے یہاں ائمہ اظہار کے واسطے سے بھی ثابت ہے اور آپ کے یہاں بھی ثابت ہے ۔

مجھے بہت تعجب ہوا ، باتیں ! ہمارے یہاں کیسے ثابت ہے ۔ میں نے آج تک نہیں سنا ! اور نہ میں نے اہل سنت و جماعت کو ایسا کرتے دیکھا ۔ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ اگر اذان سے ایک منٹ پہلے بھی نماز پڑھ لی جائے تو نماز باطل ہے ، چر جائیکہ گھنٹوں پہلے عصر کی نماز ظہر کے ساتھ یا عشاء کی نماز مغرب کے ساتھ پڑھ لی جائے ۔ یہ بات بالکل غلط معلوم ہوتی ہے ۔

آیت اللہ صدر میری حیرت کو بھانپ گئے ۔ انھوں نے ایک طالب علم کو ہستہ سے کچھ کہا ۔ وہ اٹھ کر ہلک جھپکتے میں دوکتا ہیں لے آیا ۔ معلوم ہوا کہ ایک صبیح بخاری ہے ، دوسری صبیح مسلم ۔ آقائے صدر نے اس طالب علم سے کہا کہ وہ مجھے جمع بین الفریضین سے متعلق احادیث دکھائے ۔ میں نے خود صبیح بخاری میں پڑھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر اور عصر کی نمازوں کو اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازوں کو جمع کیا ۔ صبیح مسلم میں تو بغیر خوف ، بغیر بارش اور بغیر سفر کے دو نمازوں کو جمع کرنے کے بارے میں پورا ایک باب ہے ۔

میں اپنے تعجب اور حیرت کو تو چھپا نہ سکا ۔ مگر پھر بھی مجھے کچھ شک ہوا کہ شاید بخاری اور مسلم جو ان کے پاس ہیں ان میں کچھ جعل سازی کی گئی ہے میں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ تیونس جا کر میں ان کتابوں کو پھر دیکھوں گا ۔

آیت اللہ سید محمد باقر صدر نے مجھ سے پوچھا : اب کہیے کیا خیال

ہے ؟

میں نے کہا : آپ حق پر ہیں اور جو کہتے ہیں سچ کہتے ہیں ۔ لیکن میں آپ

سے ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں ۔

فرمائیے ، انھوں نے کہا ۔

میں نے کہا : کیا چاروں نمازوں کا جمع کرنا بھی جائز ہے ؟ ہمارے یہاں بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں ، جب رات کو کام پر سے گھر واپس آتے ہیں ، تو ظہر ، عصر ، مغرب اور عشاء کی نمازیں قضا پڑھ لیتے ہیں ۔

انھوں نے کہا : یہ تو جائز نہیں ، البتہ مجبوری کی بات دوسری ہے کیونکہ مجبوری میں بہت سی باتیں جائز ہو جاتی ہیں ، ورنہ تو نماز کا وقت مقرر ہے

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ۔ میں نے کہا : آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازیں اگلا لگ بھی پڑھی ہیں اور ملا کر بھی پڑھی ہیں اور اسی سے ہمیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ نمازوں کے اوقات کون سے ہیں ۔

اس پر انھوں نے کہا : ظہر اور عصر کی نمازوں کا وقت مشترک ہے اور یہ وقت زوال آفتاب سے شروع ہو کر غروب آفتاب تک رہتا ہے ۔ مغرب اور عشاء کا وقت بھی مشترک ہے جو غروب آفتاب سے نصف شب تک رہتا ہے ۔ فجر کی نماز کا وقت الگ ہے جو طلوع فجر سے دن نکلنے تک ہے ۔ یہ جو اس کے خلاف کرے گا ، وہ اس آیت کریمہ کی خلاف ورزی کرے گا کہ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم مثلاً صبح کی نماز طلوع فجر سے پہلے پڑھ لیں یا دن نکلنے کے بعد پڑھیں ۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ظہر اور عصر کی نماز زوال سے پہلے یا غروب آفتاب کے بعد پڑھیں یا مغرب اور عشاء کی نمازیں غروب سے پہلے یا آدھی رات کے بعد پڑھیں ۔ میں نے آقائے صدر کا شکریہ ادا کیا ، گو مجھے ان کی باتوں سے پورا اطمینان ہو گیا تھا ، لیکن میں نے نمازوں کو جمع کرنا اس وقت مشروع کیا جب میں تیونس واپس آ کر تحقیق اور مطالعہ میں پوری طرح مشغول ہو گیا اور میری آنکھیں

لَهُ آقِيمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ - إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ - وَقُرْآنَ الْفَجْرِ . (سورۃ بنی اسرائیل - آیت ۷۸) - (نارشر)

کھل گئیں۔

جمع بین الصلّاتین کے بارے میں شہید صدر سے جو میری گفتگو رہی، یہ اس کی داستان ہے اور یہ داستان میں نے دو دوسرے بیان کی ہے :
ایک تو یہ کہ میرے اہلسنّت بھائیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو علماء واقعی انبیاء کے وارث ہیں ان کا اخلاق کیسا ہوتا ہے۔

دوسرے یہ بھی احساس ہو جائے کہ ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ ہماری حدیث کی معتبر کتابوں میں کیا لکھا ہوا ہے۔ ہم ایسی باتوں پر دوسروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں جن کی صحت کے ہم خود قائل ہیں اور جن کو ہم صحیح سنت نبوی تسیم کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ان باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن پر خود رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا تھا اور اس کے باوجود دعویٰ ہمارا یہ ہے کہ ہم اہلسنّت ہیں !

میں پھر اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں شیعوں کے اقوال کو شک کی نظر سے دیکھنا ہوگا کیونکہ وہ اپنے ہر عقیدے اور عمل کی سند ائمہ اہل بیت سے لاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ نسبت صحیح نہ ہو، لیکن ہم اپنی صحاح میں تو شک نہیں کر سکتے، ان کی صحت تو ہمیں تسیم ہے اور اگر ہم ان میں بھی شک کرنے لگے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ پھر ہمارے پاس دین میں سے کچھ باقی بچے گا بھی کہ نہیں !

اس لیے تحقیق کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ انصاف سے کام لے اور تحقیق سے اس کا مقصد رضائے الہی کا حصول ہو۔ اس طرح اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرور صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرے گا، اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور اسے جنت النعیم میں داخل کرے گا۔

اور یہ ہیں وہ روایات جو جمع بین الصلّاتین کے بارے میں علمائے اہل سنت نے بیان کی ہیں، ان کو پڑھ کر آپ کو یقین ہو جائے گا کہ جمع بین الصلّاتین کوئی شیعہ بدعت نہیں ہے :-

* امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں ابن عباس سے روایت بیان کی ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے جب وہ مدینے میں مُقیم تھے مسافر نہیں تھے

سات اور آٹھ رکعتیں پڑھیں۔ ۱۷
* امام مالک نے موطا میں ابن عباس سے روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے بغیر خوف اور سفر کے ظہر اور عصر کی نمازیں

اکٹھی پڑھیں اور مغرب اور عشاء کی اکٹھی۔ ۱۸
* صحیح مسلم میں باب الجمع بین الصلّاتین فی المحضر میں ابن عباس سے روایت ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے بغیر خوف اور سفر کے ظہر اور عصر کی نمازیں

اکٹھی پڑھیں اور مغرب اور عشاء کی اکٹھی۔
* صحیح مسلم میں ابن عباس سے روایت ہے کہ
رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں بغیر خوف اور بغیر بارش کے ظہر

عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھیں۔
راوی کہتا ہے کہ میں نے ابن عباس سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیوں کیا ؟ ابن عباس نے کہا : اپنی اُمت کو تنگی سے بچانے کے لیے۔

* اسی باب میں صحیح مسلم کی ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع بین الصلّاتین کی سنت صحابہ میں مشہور تھی اور اس پر صحابہ عمل بھی کرتے تھے۔
* صحیح مسلم کے اسی باب کی روایت ہے کہ

ایک روز ابن عباس نے عصر کے بعد خطبہ دیا۔ ابھی ان کا خطبہ جاری تھا کہ سورج ڈوب گیا، ستارے نکل آئے، لوگ بے چین ہو کر الصلاۃ، الصلاۃ پیکارنے لگے۔ بنی تمیم میں سے

۱۷ امام احمد بن حنبل مسند جلد ۱ صفحہ ۲۲۱

۱۸ امام مالک موطا، شرح الحواک جلد ۱ صفحہ ۱۶۰

ایک گستاخ شخص الصَّلَاة، الصَّلَاة کہتا ہوا ابن عباس تک پہنچ گیا۔ ابن عباس نے کہا: تیری ماں مرے تو مجھے سنت سکھاتا ہے! میں نے رسول اللہ کو ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھتے دیکھا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ

ابن عباس نے اس شخص سے کہا کہ تیری ماں مرے تو ہمیں نماز سکھاتا ہے۔ ہم رسول اللہ کے زمانے میں جمع بین الصَّلَاتین کیا کرتے تھے! ۱۵

* باب وقت المغرب میں صبح بخاری کی روایت ہے، جابر بن زید کہتے ہیں کہ ابن عباس کہتے تھے کہ

”رسول اللہ نے سات رکعتیں اکٹھی اور آٹھ رکعتیں اکٹھی پڑھیں۔“ ۱۶

* اسی طرح بخاری نے باب وقت العصر میں روایت بیان کی ہے کہ ابوالانامہ کہتے تھے کہ:

”ہم نے عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، پھر ہم وہاں سے نکل کر انس بن مالک کے پاس پہنچے۔ دیکھا تو عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا: چچا میاں! یہ آپ نے کون سی نماز پڑھ لی؟ کہنے لگے عصر کی، اور یہ رسول اللہ کی نماز ہے جو ہم رسول اللہ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔“ ۱۷

اہل سنت کی صحاح کی احادیث کے اس مختصر جائزے کے بعد ہم پوچھنا چاہیں گے کہ ان روایات کے ہوتے ہوئے اہل سنت آخر شیعوں کو برا بھلا کیوں

۱۵ صبح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۵۱-۱۵۲ باب الجمع بین الصَّلَاتین۔

۱۶ صبح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۲۰ باب وقت المغرب۔

۱۷ صبح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۳۸ باب وقت العصر۔

کہتے اور ان پر کیوں اعتراض کرتے ہیں۔

ہم پھر حسبِ عادت وہی بات کہیں گے کہ اہل سنت کرتے کچھ ہیں اور کہتے کچھ ہیں اور ان باتوں پر اعتراض کرتے ہیں جن کی صحت کے خود قائل ہیں۔

ہمارے شہر قفصہ میں ایک دن امام صاحب نمازیوں کے درمیان کھڑے ہو کر ہمیں بدنام کرنے کے لیے ہم پر لکھن طعن کرتے ہوئے کہنے لگے: ”تم نے دیکھا ان لوگوں نے کیا نیا دین نکالا ہے۔ ظہر کی نماز کے فوراً بعد عصر کی نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ دین محمدی نہیں ہے کوئی نیا دین ہے۔ یہ قرآن کے خلاف کرتے ہیں قرآن تو کہتا ہے: إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا بَاقٍ فَلَا تَنَاسُوا الصَّلَاةَ“۔

غرض امام صاحب نے کوئی ایسی گالی نہ چھوڑی جو انھوں نے اُن لوگوں کو زد دے ہو جو نئے نئے شیعہ ہوتے تھے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان جس نے شیعہ مذہب قبول کر لیا تھا، ایک دن میرے پاس آیا اور بڑے رنج و انوس کے ساتھ امام صاحب کی باتیں میرے سامنے دہرائیں۔ میں نے اسے صبح بخاری اور صبح مسلم دیں اور اس سے کہا کہ امام صاحب کو جا کر بتاؤ کہ جمع بین الصَّلَاتین درست ہے اور سنت نبوی ہے میں نے اس نوجوان سے کہا کہ میں امام صاحب کے پاس جاؤں گا نہیں، کیونکہ میں ان سے جھگڑنا نہیں چاہتا، ایک دن میں نے ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ سنجیدہ بحث کرنی چاہی تھی مگر وہ گالیوں پر اتر آئے اور غلط سُلط الزامات لگانے لگے۔ اس گفتگو میں اہم بات یہ تھی کہ میرے اس دوست نے ابھی تک ان امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنی ترک نہیں کی تھی۔ جب نماز کے بعد امام صاحب حسبِ معمول درس کے لیے بیٹھے، میرے دوست نے بڑھ کر ان سے جمع بین الصَّلَاتین کے متعلق سوال کیا۔

امام صاحب نے کہا: یہ شیعوں کی نکال ہوئی بدعت ہے! میرے دوست نے کہا: لیکن یہ تو صبح بخاری اور صبح مسلم سے ثابت ہے۔

امام صاحب جھٹ سے بولے: بالکل غلط۔

میرے دوست نے صبح بخاری اور صبح مسلم نکال کر انھیں دیں۔ انھوں نے

باب الجمع بین الصَّلَاتین پڑھا۔ میرا دوست کہتا ہے کہ جب انھیں ان نمازیوں کے سامنے

جوان کا درس سنا کرتے تھے حقیقت معلوم ہوئی تو وہ چکر لے اور انھوں نے کتابیں بند کر کے مجھے واپس کر دیں اور کہنے لگے کہ ”یہ رسول اللہ کی خصوصیت تھی جب تم رسول اللہ کے درجے پر پہنچ جاؤ گے اس وقت اس طرح نماز پڑھنا۔“ میرا دوست سمجھ گیا کہ یہ جاہل متعصب شخص ہے اور اس دن سے میرے دوست نے ان کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی۔

قارئین کرام! دیکھیے تعصب کیسے آنکھوں کو اندھا کر دیتا ہے اور دلوں پر غلاف چڑھا دیتا ہے، پھر حق سمجھائی نہیں دیتا۔ ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے کہ عَزْرَةٌ وَكَلْوَ طَارَتْ۔

تھی تو بکری ہی، اڑ گئی تو کیا ہوا!

میں نے اپنے دوست سے کہا کہ تم امام صاحب کے پاس ایک دفعہ پھر جا کر انھیں بتلاؤ کہ ابن عباس اس طرح نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی طرح انس بن مالک اور دوسرے صحابہ بھی پڑھتے تھے، تو پھر اس میں رسول اللہ کی کیا خصوصیت ہوتی؟ لیکن میرے دوست نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اس کی ضرورت نہیں، امام صاحب کبھی نہیں مانیں گے خواہ رسول اللہ خود ہی کیوں نہ آجائیں۔

رسول اللہ کا آنا تو خیر ناممکن بات ہے مگر اس سے اس تلخ حقیقت کا اظہار ہوتا ہے جس کو اللہ عزوجل نے سورہ روم میں اس طرح بیان کیا ہے۔
فَإِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتَى وَلَا تَسْمَعُ الْبُصْمَ الذُّعَاءَ
إِذَا وَلَوْ سَدُّوا عَنْكَ صُلًّا لَبَدَّلْنَا
إِنْ تَسْمَعُ إِلَّا مَنْ يُوْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ۔

لے کہتے ہیں، دو آدمی شکار کے لیے نکلے۔ دور سے کوئی سیاہ چیز دکھائی دی۔ ایک نے کہا کہ یہ کوا ہے دوسرے نے کہا: نہیں بکری ہے۔ دونوں اپنی ضد پر اڑے رہے۔ قریب پہنچے تو کوا پھر دھڑا کر اڑ گیا۔ پہلے شخص نے کہا: دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ کوا ہے، اب مان گئے؟ لیکن اس کا دوست پھر بھی نہ مانا۔ کہنے لگا:

”جہاں! تھی تو بکری ہی، مگر اڑنے والی بکری تھی!“

آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی بیکار سنا سکتے ہیں جبکہ وہ پیٹھ پھیرے چلے جا رہے ہوں۔ اور آپ اندھوں کو گراہی سے نہیں نکال سکتے۔ آپ صرف ان کو سنا سکتے ہیں جو ہماری نشانیوں پر ایمان لائے ہوں اور انھیں مانتے ہوں۔
(سورہ روم - آیت ۵۳)

الحمد للہ کہ بہت سے نوجوان جمع بین الصلّاتین کی حقیقت سے واقف ہونے کے بعد دوبارہ نماز پڑھنے لگے، نہیں تو وہ نماز ہی چھوڑ بیٹھے تھے کیونکہ وہ وقت پر تو نماز پڑھ نہیں سکتے تھے، رات کو چار وقت کی اکٹھی نماز پڑھتے بھی تھے تو دل کو اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ جمع بین الصلّاتین میں کیا حکمت ہے۔ جمع بین الصلّاتین کی صورت میں سب ملازمت پیشہ، طلبہ اور عوام نماز وقت پر ادا کر سکتے ہیں اور ان کا دل مطمئن رہتا ہے۔ رسول اللہ کے ارشاد کا مطلب کہ كَيْ لَا أُخْرِجَ أُمَّتِي (میں اپنی امت کو ضیق میں نہ ڈالوں) ان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

خاک پر سجدہ

شیعوں کا اس پر اتفاق ہے کہ زمین پر سجدہ افضل ہے۔ وہ ائمہ اہل بیت سے ان کے جد رسول اللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ
أَفْضَلُ السُّجُودِ عَلَى الْأَرْضِ
سجدہ زمین پر افضل ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ
لَا يَجُوزُ السُّجُودُ إِلَّا عَلَى الْأَرْضِ أَوْ مَا أَتَتْ
الْأَرْضُ غَيْرَ مَا كُوِّلَ وَلَا مَلْبُوسٍ۔
سجدہ جائز نہیں ہے مگر زمین پر یا اس چیز پر جو زمین سے
اُگے ہو مگر نہ کھائی جاتی ہو اور نہ پہنی جاتی ہو۔

صاحب وسائل الشیعه محدث حرماعلی نے اپنی اسناد سے روایت کی ہے کہ ہشام بن حکم کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا :

السَّجُودُ عَلَى الْأَرْضِ أَفْضَلُ لِأَنَّهُ أُنْخَلَعَ فِي التَّوَضُّعِ وَالْخُضُوعِ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ -

زمین پر سجدہ افضل ہے کیونکہ اس سے انتہائی تواضع اور خضوع و خضوع کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک اور روایت میں اسحاق بن فضل کہتے ہیں کہ

میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا چٹائیوں

پر اور سرکنڈوں سے بنے ہوئے بوریلوں پر سجدہ جائز ہے ؟

آپ نے کہا : کوئی حرج نہیں۔ مگر میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ زمین

پر سجدہ کیا جائے۔ اس لیے کہ رسول اللہ کو یہ بات پسند تھی کہ

آپ کی پیشانی زمین پر ہو۔ اور میں تمہارے لیے وہی بات پسند

کرتا ہوں جو رسول اللہ کو پسند تھی۔

مگر علمائے اہل سنت قائلین یا درسی وغیرہ پر بھی سجدہ میں کوئی مضائقہ

نہیں سمجھتے۔ اگرچہ ان کے نزدیک بھی افضل یہ ہے کہ چٹائی پر سجدہ کیا جائے۔

بخاری اور مسلم کی بعض روایات بتلاتی ہیں کہ رسول اللہ کے پاس کھجور کے

پتوں اور مٹی سے بنی ہوئی نہایت چھوٹی مٹی جانا نماز تھی جس پر آپ سجدہ کیا

کرتے تھے۔

صحیح مسلم کتاب الحیض میں عن قاسم بن محمد عن عائشہ کے حوالے سے روایت ہے

عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ نے مجھ سے کہا کہ ذرا یہ خمرہ

مجھے مسجد سے اٹھا دینا۔ میں نے کہا : مجھے تو ماہواری آرہی ہے

آپ نے فرمایا : تمہاری ماہواری تمہارے ہاتھ میں تھوڑا ہی

ہے۔ (مسلم کہتے ہیں کہ خمرہ کا مطلب ہے چھوٹی مٹی جانا نماز

اتنی چھوٹی کہ بس اس پر سجدہ کیا جاسکے)۔
بخاری نے اپنی صحیح میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی

ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ زمین پر سجدہ کرنا پسند فرماتے تھے۔

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ رمضان کے دسویں

عشرے میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ ایک سال آپ نے اعتکاف

کیا۔ جب اکیسویں کی شب ہوتی اور یہ وہ رات تھی جس کی صبح کو

آپ اعتکاف سے نکلنے والے تھے، اس رات آپ نے کہا :

”جس نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہو وہ رمضان کے آخری دس

دنوں کا بھی اعتکاف کرے۔ میں نے وہ رات (لیلۃ القدر) دیکھی

تھی پھر مجھے بھلا دی گئی۔ میں نے دیکھا تھا کہ میں اس رات کی

صبح کو گیلی مٹی پر سجدہ کر رہا ہوں۔ اس لیے تم اسے آخری دس

راتوں میں اور طاق راتوں میں تلاش کرو“

اس کے بعد اس رات بارش ہوتی۔ مسجد کھجور کی ٹہنیوں اور

پتوں کی تو تھی ہی ٹپکنے لگی۔ میری آنکھوں نے ۲۱ کی صبح کو

رسول اللہ کی پیشانی پر گیلی مٹی کا نشان دیکھا۔ ۱۷

صحابہ بھی خود رسول اللہ کی موجودگی میں زمین پر ہی سجدہ کرنا پسند کرتے

تھے۔ امام نسائی نے اپنی سنن میں روایت بیان کی ہے کہ

جابر بن عبد اللہ کہتے تھے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ ظہر کی نماز

پڑھا کرتے تھے۔ میں ایک ٹٹھی کنکریاں ٹھنڈی کرنے کے لیے اپنے

ہاتھ میں اٹھا لیتا تھا پھر دوسرے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ جب سجدہ

کرتا تو انھیں وہاں رکھ دیتا جہاں پیشانی رکھنی ہوتی۔ ۱۸

اس کے علاوہ رسول اللہ نے فرمایا ہے :

۱۷ صحیح بخاری جلد ۲ باب الاعتکاف فی العشر الاواخر -

۱۸ سنن امام نسائی جلد ۲ باب تبرید المحض للسنجود علیہ -

۱۹ صحیح مسلم جلد اول باب جواز غسل الرأس ورجلہ - سنن ابی داؤد جلد ۱ باب الحائض تتناول من السجود -

جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا .
میرے لیے تمام زمین سجدہ کرنے اور پاک کرنے کا ذریعہ
بنادی گئی ہے ۔ ۱۰

ایک اور حدیث نبوی ہے ۔ آپ نے فرمایا :
جُعِلَتْ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا وَجُعِلَتْ تُرْبُهَا
لَنَا طَهُورًا .

میرے لیے تمام زمین سجدہ گاہ اور اس کی خاک پاکی کا ذریعہ
بنادی گئی ہے ۔ ۱۱

پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان شیعوں کے خلاف اس لیے صدر رکھتے ہیں کہ شیعہ
قالینوں کے بجائے مٹی پر سجدہ کرتے ہیں ؟
یہاں تک کیسے نوبت پہنچی کہ شیعوں کی تکفیر کی گئی ، انھیں برا بھلا کہا
گیا اور ان پر بُہتان باندھا گیا کہ وہ بُت پرست ہیں ۔
اگر شیعوں کی جیب یا سوٹ کیس میں سے خاک کر بلا کی ٹمکی نکل آئے
تو اتنی سی بات پر شیعوں کو سعودی عرب میں کیوں زد و کوب کیا جاتا ہے ؟

۱۲ صحیح بخاری جلد ۱ کتاب التَّيَمُّمِ ۔

۱۳ صحیح مسلم جلد ۴ کتاب المساجد ومواضع الصلاة ۔

۱۴ آیت اللہ العظمیٰ آقاخان فی تفسیر القرآن میں فرماتے ہیں :

”شیعہ عقیدے کی رُو سے امام حسینؑ کی قبر کی خاک بھی اللہ کی اسی وسیع و عریض زمین کا ایک
حصہ ہے جسے اس نے اپنے پیغمبرؐ کے لیے طاہر مہبط اور جائے سُجود قرار دیا ہے تاہم کیسی طاہر اور مقدس
ہے وہ خاک جو جگر گوشہ رسولؐ کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور جس میں جو انان بہشت کے سردار
آرام فرما رہے ہیں ! اس خاک کے پہلو میں وہ عظیم ہستی محو خواب ہے جس نے اپنے جد رسول اللہؐ کے
مقصد کو زندہ کرنے ، انسانوں کو آزادی دلانے اور ظلم و ستم کو مٹانے کے لیے اپنے فرزندوں ، عزیزوں اور
دخلا دار ساتھیوں کو راہِ خدا میں قربان کر دیا ۔ یہ خاک ! خاک کر بلا انسانوں کو راہِ خدا میں جان بازی اور
فداکاری کا سبق سکھاتی ہے ، انھیں شرافت و فضیلت کا درس دیتی ہے اور ایک عظیم انظیر جگہ دوز

کیا یہی وہ اسلام ہے جو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کا احترام
کریں اور کسی کلمہ گو موجد مسلمان کی جو نماز پڑھتا ہو ، زکوٰۃ دیتا ہو ، رمضان کے
روزے رکھتا ہو اور بیت اللہ کا حج کرتا ہو ، توہین نہ کریں ۔ کیا کوئی شخص بقائمی ہوش
و حواس یہ تصور کر سکتا ہے کہ اگر بعض لوگوں کا یہ الزام درست ہو تا کہ شیعہ پتھروں
کی پوجا کرتے ہیں تو کوئی شیعہ اتنی تکلیف اٹھا کر اور اتنا مالی بوجھ برداشت
کر کے حج بیت اللہ اور زیارت قبر رسولؐ کے لیے آتا ؟

کیا اہل سنت آیت اللہ سید محمد باقر صدر شہید کے اس قول سے مطمئن نہیں
ہو سکتے ، جو میں نے اپنی پہلی کتاب ”مَمَّ الْاَهْلَئِیْتُ“ (تجلی) میں نقل کیا ہے کہ
جب میں نے ان سے خاک کر بلا پر سجدے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ :
”ہم مٹی پر اللہ کو سجدہ کرتے ہیں ۔ مٹی پر سجدہ کرنے میں

اور مٹی کو سجدہ کرنے میں بہت فرق ہے۔“

اگر شیعہ احتیاط کرتے ہیں کہ ان کا سجدہ پاک جگہ پر ہو اور عِندَ اللہ مقبول
ہو تو وہ رسول اللہؐ اور ائمہ اطہارؑ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں ، خصوصاً ہمارے زمانے
میں جب سب مساجد میں موٹے موٹے روئیں دار قالینوں کے فرش بچھ گئے ہیں ، ان

تاریخی واقعے کی یاد ذہن انسانی میں تازہ کرتی ہے ۔ انھی دُجھ کی بنا پر اس خاک کی ایک خاص اہمیت
اور عظمت ہے اور اس پر سجدہ کرنا شرعاً صحیح ہے ۔ اس سب کے علاوہ خاک کر بلا کی فضیلت میں متعدد روایات
رسول اکرمؐ سے منقول ہیں جو شیعہ اور سنی دونوں ذرائع سے آتی ہیں :

۱۔ تاذ شہید مرتضیٰ مطہریؒ اپنی کتاب شہید میں فرماتے ہیں :

”جب رسول اللہؐ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؑ کو مشہور تسبیحات (۳۲ بار اللہ اکبر ۳۳ بار اللہ
اور ۳۳ بار سبحان اللہ) پڑھنے کو کہا تو وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر پر گئیں اور تسبیح تیار کرنے کے لیے اس سے
کچھ مٹی حاصل کی ۔ ان کے اس فعل کی کیا اہمیت ہے ؟ اس کی اہمیت یہ ہے کہ شہید کی قبر متبرک ہے اور
اس کے ارد گرد کی مٹی بھی متبرک ہے ۔ انسان کو تسبیحات پڑھنے کے لیے ایک تسبیح کی ضرورت ہوتی ہے اور
اس مقصد کے لیے پتھر ، لکڑی اور مٹی کی بنی ہوئی تسبیح استعمال کی جاسکتی ہے لیکن ہم شہید کی قبر کے پاس
کی مٹی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس سے ہمارا مقصد شہید کی تعظیم بجا لانا ہوتا ہے“ (ناشر)

رَجَعَت

رَجَعَت ان مسائل میں سے ہے جن کے صرف شیعہ قائل ہیں۔
میں نے حدیث کی کتابوں میں ڈھونڈا مگر مجھے اس کا کہیں ذکر نہیں ملا۔
بعض صوفی عقائد میں البتہ ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق مغیبات سے ہے۔ جو
ان باتوں کو نہ ماننے وہ کافر نہیں ہوتا کیونکہ ایمان نہ ان امور کے ماننے پر موقوف
ہے نہ ان پر اعتقاد سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔
زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ماننے یا نہ ماننے سے
نہ کوئی نفع ہوتا ہے نہ نقصان۔ یہ صرف روایات ہیں جن کو شیعہ ائمہ اطہار
سے روایت کرتے ہیں کہ

اللہ مُجْتَنِبٌ، بعض مومنین اور بعض مجرمین مُفْسِدین کو
زندہ کرے گا تاکہ مومنین آخرت سے پہلے دنیا ہی میں اپنے
دشمنوں سے انتقام لے لیں۔

اگر یہ روایتیں صحیح ہیں۔ اور شیعوں کے نزدیک تو یہ صحیح اور متواتر ہیں
۔ جب بھی یہ اہل سنت کو پابند نہیں بناتیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان پر اعتقاد
رکھنا اس لیے واجب ہے کہ اہل بیت نے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
سے روایت کیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ ہم نے بحث میں انصاف اور بے تعصبی کا
عہد کیا ہوا ہے۔

اس لیے ہم اہل سنت کو انھیں روایات کا پابند سمجھتے ہیں جو ان کی اپنی
حدیث کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں۔ چونکہ رجعت کی احادیث ان کی اپنی کتابوں
میں نہیں آتی ہیں اس لیے وہ ان کو قبول نہ کرنے میں آزاد ہیں اور یہ بھی جب
ہے، جب کوئی شیعہ ان روایات کو ان پر مسلط کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن شیعہ کسی کو رجعت کا قائل ہونے پر مجبور نہیں کرتے اور نہ وہ یہ کہتے
ہیں کہ جو رجعت کا قائل نہیں وہ کافر ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ شیعہ، جو

قالینوں میں سے بعض کی بناوٹ میں ایسا مواد استعمال کیا جاتا ہے جس سے عام
مسلمان ناواقف ہیں۔ یہ قالین مسلمان ملکوں کے بنے ہوئے بھی نہیں ہوتے،
اس لیے ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کی بناوٹ میں ایسا مواد استعمال کیا گیا
ہو جو جائز نہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم اس شیعہ کو جو نماز
کی صحت کا اہتمام کرتا ہو، دھتکار دیں اور محض بے بنیاد مشبہ کی وجہ سے اس پر
کفر و شرک کا الزام لگائیں؟

شیعہ جو دینی امور میں خیال رکھتا ہے خصوصاً نماز کا جو دین کا ستون ہے
اور اس کا اتنا اہتمام کرتا ہے کہ نماز کے وقت اپنی پیٹی اتار دیتا ہے، گھڑی بھی
اتار دیتا ہے کیونکہ اس کا تسبیح چمڑے کا ہے جس کی اصل معلوم نہیں۔ بعض
اوقات پتلون اتار کر ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہن لیتا ہے اور یہ سب احتیاط اور
اہتمام اس لیے کرتا ہے کہ اسے نمازیں اپنے رب کے سامنے گھڑا ہونا ہے۔ اور وہ
نہیں چاہتا کہ اپنے رب کے سامنے اس حال میں جائے کہ اس کے رب کو اس کی
کوئی بات ناپسند ہو۔

کیا ایسا شیعہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جائے، اس سے
نفرت کی جائے؟ وہ تو اس قابل ہے کہ اس کا احترام کیا جائے، اس کی تعظیم کی
جائے کیونکہ وہ شاعر اللہ کی تعظیم کرتا ہے جو تقویٰ کی بنیاد ہے۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو اور صحیح بات کہو!

اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا دنیا میں بھی اور
آخرت میں بھی، تو جس مشغلے میں تم پڑے تھے اس میں تم
پر سخت عذاب نازل ہوتا۔ اُس وقت جب تم اس کو اپنی نالائقی
سے دھڑل رہے تھے اور اپنے مُنہ سے وہ کچھ کہہ رہے تھے جس کا
تحصیلِ علم نہیں تھا اور تم اس کو معمولی بات سمجھتے تھے حالانکہ
وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی۔ (سورۃ نور - آیت ۱۵)

رَجَعَتِ كَ قَاتِلِ هِي اُن كُو اِس قَدْر بُرَا بھلا كہا جاتے اور ان كے خِلاف اِس قَدْر
شُور و غوغا برپا كیا جاتے !

شیعہ مسند رَجَعَتِ كا ان روایات سے استدلال كرتے هیں جو ان كے نزدِ ك
ثابت هیں اور جن كی تائید بعض آیات سے بھی هوتی هے ، جیسے :

وَيَوْمَ نَخْشِدُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يَكْذِبُ
بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ .

اور جس دن ہم ہر اُمت میں سے ایک ایک گروہ ان لوگوں
کا جمع کریں گے جو ہماری آیتوں کو جھٹلایا کرتے تھے اور ان کی صف
(سورۃ نمل - آیت ۸۲)

بندی کی جائے گی -

تفسیر میں ہے کہ
امام جعفر صادق ؑ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ لوگ اِس آیت
كے بارے میں كیا كہتے هیں کہ وَيَوْمَ نَخْشِدُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ
فَوْجًا ؟ حماد كہتے هیں کہ میں نے كہا : لوگ كہتے هیں کہ اس كا
تعلق روزِ قیامت سے هے - امام نے كہا : یہ بات نہیں ، یہ آیت
رَجَعَتِ كے بارے میں هے ، قیامت میں كیا اللہ تعالیٰ ہر اُمت میں
سے صرف ایک ایک گروہ كو اکٹھا كرے گا اور باقی كو چھوڑ دے گا ؟
قیامت كے بارے میں دوسری آیت هے :

وَحَشَرْنَا لَهُمْ فَلَئِمْنَاهُمْ مِنْهُمْ اَحَدًا .

اور ہم ان سب كو جمع کریں گے اور ان میں سے کسی كو بھی نہ
چھوڑیں گے -

(سورۃ کہف - آیت ۲۷)

شیخ محمد رضا مظفر کی کتاب عقائد الاسلامیہ میں هے :

اہل بیت علیہم السلام سے جو روایات آئی هیں ان کی بنا پر
شیعوں كا عقیدہ یہ هے کہ اللہ تعالیٰ مُردوں میں سے كچھ كو اسی
دنیا میں زندہ كرے گا ، ان کی شكلیں وہی هوں گی جو ان کی زندگی
میں تھیں - پھر ان میں سے ایک گروہ كو عزت دے گا اور ایک گروہ

كو ذلیل كرے گا - اس وقت حق پرست ، باطل پرستوں سے ،
اور مظلوم ، ظالموں سے بدلہ لیں گے - بدلہ لینے كا یہ واقعہ
قائم آل محمد ؑ كے ظُور كے بعد هوگا -

رَجَعَتِ صرف ان مومنین کی هوگی جن كے ایمان كا درجہ بہت
بلند تھا اور مُفسدین میں سے صرف ان کی جو حد درجہ فساد میں تھے
اس كے بعد یہ لوگ پھر مرجائیں گے اور روزِ قیامت دوبارہ محشور
هوں گے اور ان كو ان كے استحقاق كے مطابق ثواب و عذاب دیا
جائے گا -

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان دوبارہ زندگی پانے والوں اور
لوٹ كر آنے والوں کی ایک تمنا كا بھی ذكر كیا هے - جب دوسری
دفعہ بھی ان کی اصلاح نہیں هوگی اور خدا كے غضب كے سوا انھیں
كچھ نہیں ملے گا ، تو یہ تیسری دفعہ دُنیا میں آنے کی تمنا کریں گے :
قَالُوا رَبَّنَا اَمَتْنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ
فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوجٍ مِنْ سَبِيلٍ .

اور وہ کہیں گے لے ہمارے پروردگار ! تو نے ہمیں دو دفعہ
موت اور دو دفعہ زندگی دی سوا ب ہم اپنے گناہوں كا اقرار
كرتے هیں ، تو كیا كوئی صُورت هے نکلنے کی ؟ (سورۃ مؤمن - آیت ۱۱۶)

میں كہتا ہوں کہ اگر اہل سنت والجماعت رَجَعَتِ پر یقین نہیں ركھتے ، تو
انھیں اس كا پورا حق هے ، لیكن انھیں یہ حق نہیں هے کہ جو اس كے قاتل هیں اور
جن كے نزدِ ك یہ نصوص سے ثابت هے ان كو بُرا بھلا كہیں ، اس لیے کہ کسی
شخص كا کسی بات كو نہ جاننا اس کی دلیل نہیں کہ جو شخص جانتا هے وہ غلطی پر هے
اسی طرح کسی كے کسی چیز كو نہ ماننے یا نہ جاننے كا یہ مطلب نہیں کہ اس چیز كا وجود
ہی نہیں - مسلمانوں كے كتنے ہی ناقابلِ تردید دلائل هیں جنھیں اہل کتاب یعنی یہود
و نصاریٰ تسلیم نہیں كرتے -

اہل سنت کی بھی كتنی ہی روایات اور كیتنے ہی اعتقادات ایسے هیں خُصُوصاً

وہ جن کا تعلق اولیاء اور صوفیاء سے ہے جو ناممکن اور کریمہ نظر آتے ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اہل سنت کے عقیدے کی مذمت کی جائے اور اس سے ڈرایا جائے۔

رجعت کا ثبوت قرآن اور سنت نبوی میں ملتا ہے اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ناممکن اور محال بھی نہیں ہے۔ خود قرآن شریف میں رجعت کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے :

أَوْ كَالَّذِي مَدَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا
قَالَ أَنِّي يُخَيِّ هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةً
عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ.

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا جسے ایک گاؤں میں جو اپنی چھتوں کے بل گر چکا تھا اتفاقاً گزر ہوا تو اس نے کہا کہ اللہ اس بستی کے باشندوں کو مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا، تو اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور اس کو سو سال تک مردہ رکھا، پھر زندہ کر دیا۔ (سورۃ بقرہ - آیت ۲۵۹)

یا ایک اور آیت میں ہے :

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ
أَلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ
أَحْيَاهُمْ.

کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر ہے جو شمار میں ہزاروں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے، تو اللہ نے ان سے کہا کہ مروجو، پھر انہیں زندہ کر دیا۔ (سورۃ بقرہ - آیت ۲۶۳)

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو پہلے موت دے دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا :

وَاذْكُرْهُمْ يَا مُوسَىٰ لَئِنْ تَوَمَّنْ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ
جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ثُمَّ

بَعَثْنَا كُفَّ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔
اور جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے
جب تک خدا کو سامنے نہیں دیکھ لیں گے۔ اس پر تمہارے دیکھتے
دیکھتے بجلی کی کڑک نے آکر تمہیں دبوچ لیا۔ پھر موت آجانے کے
بعد ہم نے تمہیں از سر نو زندہ کر دیا تاکہ تم احسان مانو۔

(سورۃ بقرہ - آیت ۵۶)

اصحاب کہف تین سو سال سے زیادہ غار میں مردہ پڑے رہے :
ثُمَّ بَعَثْنَا هُمْ لِنَعْلَمَ أَىَّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا
لَبِثُوا أَمَدًا۔

پھر ہم نے انہیں زندہ کر کے اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ ان دونوں
گروہوں میں سے کونسا گروہ اس حالت میں رہنے کی مدت سے زیادہ
واقف ہے۔ (سورۃ کہف - آیت ۱۲)

(دیکھیے، کتاب اللہ کہتی ہے کہ سابقہ امتوں میں رجعت کے واقعات ہوتے
رہے ہیں، تو اُمت محمدیہ میں بھی ایسے کسی واقعہ کا وقوع پذیر ہونا ناممکن نہیں ہے،
خصوصاً جبکہ ائمہ اہل بیت اس کی خبر دے رہے ہوں جو سچے ہیں اور باخبر ہیں۔
بعض بے جا دخل اندازی کرنے والے کہتے ہیں کہ رجعت کو تسلیم کرنا تنازع
(آواگون) کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے جو کہ کفار کا عقیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ
یہ بات بالکل غلط ہے اور اس کا مقصد محض شیعوں پر الزام تراشی اور انہیں
بدنام کرنا ہے۔

تنازع کے ماننے والے یہ نہیں کہتے کہ انسان اسی جسم، اسی روح اور
اسی شکل کے ساتھ دنیا میں واپس آتا ہے۔ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی
جو مرجاتا ہے، اس کی روح ایک دوسرے انسان کے جسم میں جو دوبارہ پیدا ہوتا
ہے داخل ہو جاتی ہے بلکہ اس کی روح کسی جانور کے جسم میں بھی داخل ہو سکتی ہے
جیسا کہ ظاہر ہے یہ عقیدہ اس اسلامی عقیدے سے بالکل مختلف ہے جس کے مطابق
اللہ تعالیٰ مردوں کو اسی جسم اور اسی روح کے ساتھ اٹھاتا ہے۔ رجعت کا تنازع

سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ یہ ان جاہلوں کا کہنا ہے جو شیعہ اور شیعوں میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔

مہدی منتظر علیہ السلام

مہدیؑ موعود کا مسئلہ بھی ان موضوعات میں شامل ہے جن کی وجہ سے اہل سنت شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ بعض تو اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ تمسخر و استہزاء سے بھی نہیں چوکتے۔ کیونکہ اہل سنت اس کو بعید از عقل اور محال سمجھتے ہیں کہ کوئی انسان بارہ سو برس تک زندہ مگر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔

بعض مبصر مصنفین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شیعوں نے امام غائب کا خیال اس لیے گھڑا ہے کہ انھیں مختلف ادوار میں کثرت سے حکمرانوں کے ظلم و ستم سہنے پڑے ہیں چنانچہ انھوں نے اس تصور سے اپنے دل کو تسلی دے لی کہ مہدیؑ منتظرؑ کے زمانے میں جو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے نہ صرف انھیں امن چین نصیب ہوگا بلکہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا بھی موقع ملے گا۔ پچھلے چند سالوں میں مہدیؑ منتظرؑ کے ظہور سے متعلق چرچا بڑھ گیا ہے، خصوصاً ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد جب پاسداران انقلاب نے یہ اپنا خاص طریقہ اور شعار بنالیا کہ وہ اپنی دعاؤں میں امام خمینی کے لیے یہ دعا کرتے تھے کہ خدایا خدایا تا انقلاب مہدیؑ خمینی را نگہدار! اس وقت سے مسلمان اور خصوصاً تعلیم یافتہ مسلمان یہ پوچھنے لگے کہ مہدیؑ کی اصلیت کیا ہے۔ کیا اسلامی عقائد میں مہدیؑ کا واقعی وجود ہے یا یہ محض شیعوں کی من گھڑت ہے۔ اگرچہ شیعہ علماء نے ہر دور میں مہدیؑ سے متعلق کتابیں لکھی ہیں اور

لے شیعوں کے مسمیٰ ہیں کیونکہ

داد تحقیق دی ہے۔ نیز شیعہ اور سنی علماء کو اکثر کافر نسوں وغیرہ میں ایک دوسرے سے ملنے اور عقائد سے متعلق مختلف مسئلوں پر گفتگو کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے، اس کے باوجود اہل سنت کے لیے یہ موضوع چستان بنا ہوا ہے اس لیے کہ انھیں اس سے متعلق روایات سننے کا کم ہی اتفاق ہوتا ہے۔

اسلامی عقائد میں مہدیؑ منتظرؑ کی حقیقت کیا ہے؟ اس بحث کے دو جزو ہیں :- پہلے جزو کا تعلق کتاب و سنت کے حوالے سے مہدیؑ کی بحث سے ہے اور دوسرے کا تعلق مہدیؑ کی زندگی، ان کے غائب ہونے اور دوبارہ ظاہر ہونے سے ہے۔

جہاں تک اس بحث کے پہلے جزو کا تعلق ہے، شیعہ اور سنی دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہؐ نے مہدیؑ کی بشارت دی ہے۔ آپؐ نے اپنے اصحاب کو بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ مہدیؑ کو آخری زمانے میں ظاہر کرے گا۔ مہدیؑ کی احادیث شیعہ اور اہل سنت دونوں کی معتبر کتابوں میں ملتی ہیں۔

میں اپنی عادت کے مطابق صرف ان روایات سے استدلال کروں گا جن کو اہل سنت صیح اور معتبر سمجھتے ہیں۔

سنن ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اگر دنیا کا فقط ایک دن باقی رہ جائے تو اس ایک ہی دن کو اللہ تعالیٰ اتنا طویل دے گا کہ اس میں ایک شخص کو بھیجے گا جس کا نام میرے نام پر ہوگا اور اس کی کنیت میری کنیت پر ہوگی۔ وہ زمین کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و ستم سے بھری ہوئی ہوگی۔ لے

ابن ماجہ میں ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا : ہم اہل بیت کے لیے اللہ نے دنیا سے

زیادہ آخرت کو پسند کیا ہے۔ میرے بعد میرے اہل بیت کو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا، انھیں دھتکارا جائے گا پھر ایک قوم مشرق کی طرف سے آئے گی جس کے ساتھ کالے جھنڈے ہوں گے وہ لوگ بھلائی مانگیں گے مگر انھیں ملے گی نہیں۔ اس پر وہ لڑیں گے اور کامیاب ہوں گے۔ پھر جو وہ مانگتے تھے اس کی انھیں پیشکش کی جائے گی مگر وہ قبول نہیں کریں گے۔ آخر وہ (حکومت) میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کے حوالے کر دیں گے جو زمین کو جو ظلم سے بھری ہوئی ہوگی، انصاف سے بھر دے گا۔ لے

سنن ابن ماجہ میں ہے :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : مہدی ہم اہل بیت سے ہے، مہدی فاطمہؑ کی اولاد سے ہوگا۔

سنن ابن ماجہ ہی میں ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : میری امت میں مہدی ہوگا۔ اس کا زمانہ اگر کم ہوا تو سات سال ورنہ نو سال ہوگا۔ اس عرصے میں میری امت کو وہ آرام و اطمینان نصیب ہوگا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ غلہ کی اتنی فراوانی ہوگی کہ ذخیرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جو شخص مہدی سے کچھ مانگے گا وہ اسے مل جائے گا۔ لے

صحیح ترمذی میں آیا ہے :

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ایک شخص میری امت میں سے حکمران ہوگا۔ اس کا نام وہی ہوگا جو میرا نام ہے۔ اگر قیامت آنے میں ایک دن بھی باقی ہوگا تو اللہ اس دن کو اتنا طویل

لے سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۴۰۸۲ -

لے سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۴۰۸۶ -

کر دے گا کہ یہ شخص حکمران ہو سکے گا۔ لے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : دنیا اس وقت تک ختم نہیں ہوگی

جب تک حکومت ایک عرب کو نہ مل جائے جو میرے اہل بیت میں ہوگا اور جس کا نام میرے نام پر ہوگا۔

صحیح بخاری میں ابو قتادہ انصاری کے آزاد کردہ غلام نافع سے روایت ہے

کہ ان سے ابو ہریرہ نے کہا کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : کیسا ہوگا جب ابن مریمؑ تم میں نازل

ہوں گے اور تمہارے امام تم میں سے ہوں گے۔ لے

قاضی ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ

اس بارے میں متواتر احادیث ہیں کہ اس امت میں مہدی

ہوں گے۔ اور عیسیٰ بن مریمؑ آسمان سے اتر کر آئیں گے اور

مہدی کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ لے

ابن حجر مکی، ہیثمی نے صواعق محرقة میں لکھا ہے :

ظہور مہدی کی متواتر احادیث بکثرت آتی ہیں۔ لے

صاحب غایۃ المآمول کہتے ہیں کہ :

قدیم زمانے سے علماء میں یہ مشہور ہے کہ آخری زمانے میں

اہل بیت میں ایک شخص کا ضرور ظہور ہوگا جسے مہدی کہا

جائے گا۔ مہدی کی احادیث بہت سے صحابہ نے روایت کی ہیں

اور اکابر محدثین نے انھیں اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے،

جیسے : ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، طبرانی، ابویعلیٰ، بزار،

لے جامع ترمذی جلد ۹ صفحہ ۷۴-۷۵

لے صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۲۳ باب نزول عیسیٰ بن مریمؑ۔

لے فتح الباری جلد ۵ صفحہ ۳۶۲

لے صواعق محرقة جلد ۲ صفحہ ۲۱۱۔

امام احمد بن حنبل، حاکم، وغیرہ - جس نے بھی ہمدی سے متعلق

تمام احادیث کو ضعیف کہا ہے وہ غلطی پر ہے۔

مناصرین میں سے اغوان المسلمین کے مفتی سید سابق نے اپنی کتاب العقائد الاسلامیہ میں ہمدی کی احادیث نقل کی ہیں۔ ان کے نزدیک ہمدی کا تصور اسلامی عقائد کا جزو ہے جس کی تصدیق واجب ہے۔

شیعہ کتابوں میں بھی ہمدی کی احادیث کثرت سے نقل کی گئی ہیں۔ یہ تک کہا گیا ہے کہ احادیث ہمدی سے زیادہ کوئی حدیث رسول اللہ ص سے روایت نہیں کی گئی ہے۔

محقق لطف اللہ صافی گلیائیگانی نے اپنی مفصل کتاب منتخب الاثر میں ہمدی علیہ السلام کے متعلق احادیث ساٹھ سے زیادہ سننی مآخذوں سے نقل کی ہیں، ان میں صحاح ستہ بھی شامل ہیں اور نوٹس سے زیادہ شیعہ مآخذوں سے نقل کی ہیں جن میں کتب اربعہ بھی شامل ہیں۔ لہ

لہ اسلام میں ہمدی پر اعتقاد کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ بعض علماء نے اس عقیدے کو دین کے واجبات میں شمار کیا ہے۔ ہمدی کی خصوصیات اور شخصیت کے بارے میں اختلاف ہوتا ہے لیکن سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے متعلق زیادہ تر روایات صحیح ہیں اور جو شجرہ ان کے بارے میں دی گئی ہے وہ متواتر ہے۔

اس سلسلے میں یہ امر دلچسپی کا باعث ہے کہ جیسا کہ مشہور مؤرخ طبری نے لکھا ہے :

”ہمدی کی غیبت سے متعلق روایات شیعہ محدثین نے امام محمد باقرؑ اور امام

جعفر صادقؑ کی زندگی ہی میں (یعنی ولادت ہمدی سے ۵۰ سال پہلے) اپنی

کتابوں میں درج کر دی تھیں۔ یہ امر بجائے خود ان روایات کی صحت کا منہ بولتا

ثبوت ہے۔“

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں کئی مقامات پر ہمدی کے بارے روایات بلا واسطہ نقل کی گئی ہیں اور اسی قبیل کی تقریباً پچاس احادیث دوسری معروف تالیفات میں بھی درج ہیں، جن میں سے بعض کے

نام یہ ہیں :

دوسری بحث ہمدی کی ولادت، ان کی زندگی، ان کی غیبت اور ان

کی عدم وفات سے متعلق ہے۔

یہاں بھی علمائے اہل سنت کی ایک خاصی بڑی تعداد یہ مانتی ہے کہ ہمدی محمد بن الحسن العسکری ہیں جو ائمہ اہل بیت میں سے بارہویں امام ہیں وہ زندہ موجود ہیں اور آخری زمانے میں ظاہر ہو کر زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ ان سے دین کو کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ علمائے اہل سنت اس طرح شیعہ امامیہ کے اقوال کی تائید کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض علماء کے نام یہ ہیں :

۱۔ محی الدین ابن عربیؒ ۶۳۸ھ فتوحات مکیہ

۲۔ سبط ابن جوزیؒ ۶۵۴ھ تذکرۃ الخواص

۳۔ عبد الوہاب شمرانی مصریؒ ۹۷۶ھ عقائد الأکابر

۴۔ ابن خشابؒ — توارخ موالید الأئمہ ووفیاتہم

۵۔ محمد نجاری خنقیؒ — فصل الخطاب

جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن ابوداؤد، مسند احمد بن حنبل، معجم طبرانی، طبقات ابن سعد، مستدرک حاکم، صواعق مخرقة، منہاج السنۃ النبویہ، ینایح المودة، دلائل النبوة، فتوحات مکیہ، المکالم تاریخ بغداد اور کتاب الیقین۔

ان معتبر مآخذ میں رسول اکرم ص سے تقریباً پچاس ایسی احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں یوم قیامت سے پیشتر ہمدی کے ظہور کے بارے میں واضح پیشین گوئی کی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر احادیث صحیح ہیں اور ان کو ۳۳ معروف صحابیوں اور صحابیات نے آنحضرت ص سے بلا واسطہ نقل کیا ہے جن میں سے چند یہ ہیں :

امام علیؑ - امام حسینؑ - ابوسعید خدریؓ - عبداللہ بن مسعودؓ - ثوبان

ابوہریرہؓ - انس بن مالکؓ - جُبَیر بن عبداللہؓ - عثمان بن عفانؓ - عوف بن

مالکؓ - طلحہ بن عبید اللہؓ - صدیف بن یمانؓ - عمران بن حصینؓ - عبداللہ بن

عمرؓ - اُمّ سلمہؓ - اُمّ حبیبہؓ - عاتشہؓ - عبدالرحمن بن عوفؓ - ابو ایوبؓ

انصاریؓ - عباس بن عبد المطلبؓ - ابن عباسؓ اور عمار بن یاسرؓ۔

(نارشر)

۶۔ احمد بن ابراہیم بلاذری ————— الحدیث المتسلسل

۷۔ ابن الصباغ مالکی ————— ۸۵۵ھ الفصول المهمة

۸۔ العارف عبدالرحمن ————— مرآة الأسرار

۹۔ کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی ————— ۴۵۲ھ مطالب السؤل فی مناقب آل الرسول

۱۰۔ سلیمان ابراہیم قندوزی حنفی ————— ۱۲۹۱ھ منابع المودة

اگر کوئی شخص تبتیح اور تحقیق سے کام لے تو ایسے علماء کی تعداد جو ہمدی کی ولادت، اور ان کے اس وقت تک زندہ باقی رہنے میں یقین رکھتے ہیں جب تک ان کا ظاہر ہونا اللہ کو منظور نہ ہو، اس سے کئی گنا بڑھ جائے گی۔ اس کے بعد وہ اہل سنت باقی رہ جاتے ہیں جو احادیث کی صحت کا اعتراف کرنے کے باوجود ہمدی کی ولادت اور ان کے زندہ باقی رہنے کا انکار کرتے ہیں، ان کا یہ انکار دوسروں پر حجت نہیں، کیونکہ ان کا ان باتوں سے انکار اور ان کو مستبعد سمجھنے کی وجہ محض ضد اور تعصب ہے، ورنہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ قرآن کریم کسی ایسے نظریے کی نفی نہیں کرتا بلکہ خود اللہ نے متعدد مثالیں بیان کی ہیں تاکہ جمود کا شکار لوگ آزادی سے سوچ سکیں اور اپنی عقلوں کی باگ ذرا ڈھیلی چھوڑ دیں تاکہ انھیں یقین آجائے اور وہ مان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد معجزات اپنے پیغمبروں کے واسطے سے دکھائے ہیں تاکہ معاندین صرف ان چیزوں کے ساتھ نہ چسپے رہیں جو ان کی محدود اور ناقص عقلوں کے مطابق ممکن الوقوع ہیں یا وہ ایسے واقعات ہیں جو عام طور پر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن!

وہ مسلمان جس کا دل نور ایمان سے روشن ہے اسے اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ اللہ نے عزیرؑ کو سو سال تک مردہ رکھنے کے بعد پھر زندہ کر دیا۔ حضرت عزیرؑ نے اپنی کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھا تو وہ ابھی تک خراب نہیں ہوئی تھیں، اپنے گدھے کو دیکھا تو اللہ نے اس کی ہڈیاں درست کر دیں اور ان پر گوشت چڑھا دیا۔ گدھا دوبارہ ویسا ہی ہو گیا جیسا پہلے تھا۔ حالانکہ اس کی ہڈیاں گل سرچکی تھیں حضرت عزیرؑ نے یہ سب دیکھ کر کہا: میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دیکھیے! کتنی جلدی حضرت عزیرؑ کے خیالات بدل گئے۔ ابھی تو اُجر طس ہوئی بستی کو دیکھ کر انھوں نے حیرت سے کہا تھا کہ اسے موت کے بعد اللہ کیسے زندہ کرے گا؟

جو مسلمان قرآن کریم میں یقین رکھتا ہے، اسے اس بات پر کوئی حیرانی نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے پرندوں کے ٹکڑے کر کے ان کے اجزاء پہاڑوں پر بکھیر دیے اور پھر جب ان کو بلایا تو وہ دوڑتے ہوئے آگئے۔

وہ باایمان مسلمان جسے اس پر کوئی حیرانی نہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا، تو وہ آگ ٹھنڈی ہو گئی، اور اس نے حضرت ابراہیمؑ کو نہ جلایا اور نہ کوئی ضرر پہنچایا۔

وہ باایمان مسلمان جسے اس پر کوئی حیرانی نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور وہ ابھی زندہ ہیں اور ایک نہ ایک دن زمین پر واپس آئیں گے وہ باایمان مسلمان جسے اس پر کوئی حیرانی نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور پیدائشی مبروص اور اندھے کو اچھا کر دیتے تھے۔

وہ باایمان مسلمان جسے اس پر کوئی حیرانی نہیں کہ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے لیے سمندر بھٹ گیا تھا اور یہ لوگ اس کے بیچ میں سے اس طرح گزر گئے تھے کہ ان کے بدن بھی گیلے نہیں ہوتے تھے حضرت موسیٰؑ کا عصا سانپ بن گیا تھا اور دریائے نیل کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا تھا۔

وہ باایمان مسلمان جسے اس پر تعجب نہیں کہ حضرت سلیمانؑ پرندوں، جنوں اور چوٹیوں سے باتیں کیا کرتے تھے، ان کا تخت ہوا پر اڑتا تھا اور وہ لمحوں میں ملکہ بلقیس کا تخت منگوا لیتے تھے۔

وہ باایمان مسلمان جسے اس پر کوئی تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو نوادپرستین سو سال تک مردہ رکھا اور پھر زندہ کر دیا کہ پوتے کے پوتے کی عمر دادا کے دادا سے زیادہ ہو گئی۔

وہ باایمان مسلمان جسے اس پر تعجب نہیں کہ حضرت خضرؑ جن کی ملاقات حضرت موسیٰؑ سے ہوئی تھی زندہ سلامت ہیں۔

وہ باایمان مسلمان جسے اس پر تعجب نہیں کہ ابلیس ملعون زندہ ہے حالانکہ وہ حضرت آدمؑ سے بھی پہلے کی مخلوق ہے اور ساری تاریخ انسانیت اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزری اور وہ ہر موڑ پر اس کے ساتھ رہا ہے۔ وہ خود پوشیدہ ہے۔ اس کی بد اعمالیوں سے سب واقف ہیں، نہ کسی نے اس کو دیکھا ہے اور نہ کوئی دیکھے گا، وہ اور اس کے چیلے چانٹے سب لوگوں کو دیکھتے ہیں مگر ان کو کوئی نہیں دیکھتا۔

پس جو مسلمان ان سب باتوں پر یقین رکھتا ہے اور ان کے وقوع پذیر ہونے پر اسے کوئی حیرانی نہیں ہوتی، اس کے لیے اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ ہمدی ایک عرصے تک اللہ تعالیٰ کی کسی مصلحت کی وجہ سے پوشیدہ رہیں؟ جن واقعات کا ہم نے ذکر کیا ہے اس سے کئی گنا زیادہ غیر معمولی واقعات قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ خارق العادت واقعات عام طور پر نہیں ہوتے، نہ لوگ ان سے مانوس ہیں بلکہ سب لوگ مل کر بھی چاہیں تو اس قسم کے واقعات پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہ سب اللہ کے اپنے کیے ہوئے کام ہیں اور اللہ کو کوئی چیز زمین میں ہو یا آسمان میں کسی کام کے کرنے سے نہیں روک سکتی۔ مسلمان ان باتوں کی تصدیق کرتے ہیں کیونکہ قرآن میں جو کچھ آیا ہے مسلمان اس پر بغیر کسی استثناء یا ذہنی تحفظ کے ایمان لاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمدی سے متعلق امور سے شیعہ زیادہ واقف ہیں کیونکہ ہمدی ان کے امام ہیں اور شیعہ ان کے اور ان کے آباء و اجداد کے ساتھ رہے ہیں، مثل مشہور ہے کہ

أَهْلُ مَكَّةَ أَدْرَى بِشِعَابِهَا

مکہ کی وادیوں کو اہل مکہ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا۔

شیعہ اپنے ائمہ کا احترام اور تعظیم کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ائمہ کی قبروں کو پختہ در شاندار بنایا ہے جو زیارت گاہ و خلائق ہیں۔ اگر بارہویں امام حضرت ہمدی علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہو تو آج ان کی قبر بھی مشہور ہوتی۔ شیعہ یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ مرنے کے بعد زندہ ہوں گے۔ کیونکہ دوبارہ زندہ ہونا ممکن ہے

جیسا کہ قرآن میں متعدد ایسے واقعات کا ذکر ہے۔ اور شیعہ تو رجعت کے بھی قائل ہیں۔

لیکن شیعہ من گھڑت اور فرضی باتیں نہیں کرتے، نہ وہ بہتان باندھتے ہیں نہ خیالی دنیا میں رہتے ہیں، جیسا کہ ان کے متعصب دشمن سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کا اصرار اس پر ہے کہ امام ہمدی علیہ السلام زندہ ہیں، ان کو اللہ کی طرف سے رزق ملتا ہے، وہ اللہ کی کسی مصلحت کے تحت پوشیدہ ہیں۔ ممکن ہے کہ راسخون فی العلم کو یہ مصلحت معلوم بھی ہو۔ شیعہ اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں :

عَجَّلَ اللَّهُ تَعَالَى فَرَجَهُ .

کیونکہ ہمدی کے ظہور سے مسلمانوں کی عزت و حرمت، کامیابی و کامرانی اور صلاح و فلاح وابستہ ہے۔

امام ہمدی علیہ السلام کے بارے میں شیعہ سنی اختلاف کوئی ٹھوس اور حقیقی اختلاف نہیں ہے کیونکہ اہل سنت کا بھی عقیدہ ہے کہ امام ہمدی آخری زمانے میں ظاہر ہوں گے، زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے، ان کے دور میں مسلمان تمام روئے زمین کے مالک ہوں گے خوشحالی عام ہوگی اور کوئی غریب نہیں رہے گا۔

اختلاف فقط اس میں ہے کہ شیعہ کہتے ہیں کہ ان کی ولادت ہو چکی ہے جبکہ اہل سنت کہتے ہیں کہ وہ ابھی پیدا ہوں گے یہ

لیکن اس بات پر فریقین کا اتفاق ہے کہ ان کا ظہور قیامت کے قریب ہوگا اس لیے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے اور پرانے زخموں پر پھیلا رکھنے کے لیے سب مسلمانوں کو چاہیے کہ مل کر کیا شیعہ کیا سنی خلوص سے اپنی دعاؤں اور نمازوں میں اللہ تعالیٰ سے التجا کریں کہ وہ امام ہمدی کے ظہور میں یہ جلدی فرماتے،

لہ یہ اسی خیال کا شاخسانہ تھا کہ انڈونیشیا خاتون زہرہ فونانے ہمدی کی والدہ ہونے کا ڈرامہ چلایا۔ اور یہ کہ متعدد لوگوں نے مختلف زمانے میں "ہمدویت" کا جھوٹا دعویٰ کیا۔

(ناشر)

کیونکہ ان کے ظہور میں اسلام اور مسلمانوں کی عزت ہے اور ان کے خروج سے امت محمدیہ کی کامیابی و خوشحالی وابستہ ہے۔ بلکہ پوری انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے کہ مہدی آکر زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں۔

سب مسلمان کیا سنتی اور کیا شیعہ امام مہدی کے آنے پر یقین رکھتے ہیں خواہ اہل سنت کے قول کے بموجب وہ پیدا ہوں یا شیعوں کے کہنے کے مطابق وہ غائب رہنے کے بعد ظاہر ہوں۔

اہم بات یہ ہے کہ یہ کوئی فرضی اور خیالی قصہ نہیں ہے جیسا کہ بعض شریک ظاہر کرنا چاہتے ہیں، بلکہ مہدی کی شخصیت ایک حقیقی شخصیت ہے جس کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور جواب پوری انسانیت کا خواب بن گئی ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ یہ عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی عقیدہ ہے کہ ایک مُنْجی یا نجات دہندہ آئے گا جو دنیا کی اصلاح کرے گا۔ اس نجات دہندہ کے یہود و نصاریٰ بھی منتظر ہیں، اسی لیے مہدی کے دادا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا نام "مہدی مُنْشَقَر" رکھا ہے۔

اے اللہ! سب مسلمانوں کو خیر و تقویٰ کی توفیق دے، ان کی صفوں میں اتحاد اور دلوں میں اتفاق پیدا کر، ان کی خرابیوں کی اصلاح کر، اور انھیں دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی عطا کر۔

ائمہ کی محبت میں غلو

یہاں غلو سے مراد حق کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کا اتباع کرنا اور محبوب کو مبود بنالینا نہیں، ایسا کرنا تو کفر و شرک ہے جس کا کوئی مسلمان جو اسلام کے پیغام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین رکھتا ہو قائل نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت کی حدود مقرر کر دی تھیں جب آپ نے امام علی علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ:

هَذَاكَ فَيْدَكَ اِنَّانِ مُجِبُّ غَالٍ وَمُبْغِضُ قَالٍ

تمہارے بارے میں اپنے خیالات کی بنا پر دو طرح کے لوگ ہلاک ہو جائیں گے، ایک حد سے زیادہ محبت کرنے والا اور دوسرا حد سے زیادہ بغض رکھنے والا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور قول ہے:

يَا عَلِيُّ اِنَّ فَيْدَكَ مَثَلُ مَنِ عَيْسَى بْنِ مَرْيَمَ ابْغَضَتْهُ الْيَهُودُ حَتَّى بَهَتُوا اُمَّهُ وَاحَبَّهُ النَّصَارَى حَتَّى اَنْزَلُوهُ بِالْمَنْزِلَةِ الَّتِي لَيْسَ بِهَا

اے علی! تمہاری مثال عیسیٰ بن مریم کی س ہے۔ یہودی ان سے اتنا بغض رکھتے تھے کہ ان کی والدہ پر بہتان باندھتے تھے۔ اور عیسائیوں نے ان سے ایسی محبت کی کہ انھیں اس درجے پر پہنچا دیا جس درجے پر وہ نہیں تھے۔ لہ

غلو یہ ہے کہ محبت کس پر اس طرح چھا جائے کہ وہ محبوب کو مبود بنادے اور اس کو وہ درجہ دے جس کا اس سے کوئی تعلق نہیں یا بغض اس قدر غالب آجائے کہ بہتان باندھنے اور بھوٹے ایہام لگانے لگے۔

شیعوں نے علی اور اولاد علی میں سے ائمہ کی محبت میں غلو نہیں کیا بلکہ انھیں وہی درجہ دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ آپ کے وصی اور خلیفہ تھے۔ ائمہ کی تو کجا کوئی شیعہ ائمہ کی نبوت کا بھی قائل نہیں۔ فتنہ انگیزوں کو چھوڑیے جو یہ تک کہتے ہیں کہ "شیعہ تو علی کو خدا مانتے ہیں" اگر یہ صحیح ہے

لے مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۳۔ حافظ ابن عساکر تارخ دمشق جلد ۲ صفحہ ۲۳۳۔ امام ساقی رحمہ اللہ امیر المؤمنین۔ امام بخاری تارخ کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۸۱۔ حافظ سیوطی تارخ الخلفاء صفحہ ۱۷۳۔ محب طبري ذخائر العقبی صفحہ ۹۲۔ ابن جریر صواعق حرقہ صفحہ ۷۴۔

۱۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کو یہ بتا دیا جائے کہ جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کی شخصیت کو اور یہودیوں نے حضرت عزیر کی شخصیت کو ایک سماوی جوہر بنا دیا تھا اسی طرح مسلمانوں میں سے کچھ بدعقیدہ لوگوں نے حضرت علی کو خدا کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ انسان کو خدا بنانے کا

کہ کچھ لوگ واقعی ایسا مانتے ہیں تو ان کا تعلق نہ شیعوں سے ہے نہ خوارج سے۔ بہر حال یہ شیعوں کا تصور نہیں کہ قرآن کہتا ہے:

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ
اے رسول! اپنی اُمت سے کہہ دیجیے کہ میں تم سے اپنی رشتہ
کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ بجز اپنے قریبنداروں سے مودت کے۔
یاد رہے کہ مودت کا درجہ محبت سے بڑھ کر ہے۔ مودت کا تقاضا یہ ہے
کہ دوسرے کے لیے کچھ قربانی دی جائے۔

یہ عمل حضرت علیؑ تک ہی محدود نہ تھا، ان کے جانشینوں کو بھی خدا کا رتبہ دے دیا گیا تھا۔
ایسے بد عقیدہ لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام ثانی امام علی بن موسیٰ رضاؑ اپنی
دُعا میں فرماتے ہیں:

”خُدا یا! میں ہزار ہوں ان لوگوں سے جو ہمارے لیے ایسی بات کہتے ہیں
جس کے ہم سزاوار نہیں۔ اور میں ہزار ہوں ان لوگوں سے جو ہم سے ایسی
بات منسوب کرتے ہیں جو ہم نے کبھی کہی ہی نہیں۔
خُدا یا! زندگی اور موت دینا تجھ سے مخصوص ہے اور روزی رساں بھی
صرف تو ہے۔ میں تو فقط تیری عبادت کرتا ہوں اور تجھی سے مدد مانگتا ہوں۔
تو ہی میرا، میرے آبا۔ داجداد کا اور میری اولاد کا خالق ہے اور ربوبیت تیرے
ہو! کسی اور کو زیبا نہیں۔“

پس جاننا چاہیے کہ جن لوگوں نے عہد کو مقبُود بنا دیا انھوں نے عہد سے محبت میں
تُکڑ کیا جو کفر کی حدود میں آتا ہے، جیسا کہ حضرت امیر المومنینؑ کا قول ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

”کُفر ان چار ستونوں پر قائم ہے: گناہ۔ شک۔ شبہ اور۔ قُلُو“
علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں:

جو شخص یہ مانے کہ اللہ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ اور ان کے اولیاءِ باصفا
کو خلق فرمایا اور پھر ساری مخلوق کی خلقت اور تربیت ان کو سونپ دی،
وہ غالی ہے۔

اس میں شیعوں کی کیا خطا اگر رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ
”علیؑ! تم دنیا میں بھی سردار ہو اور آخرت میں بھی سردار
ہو، جس نے تم سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس
نے تم سے بُغض رکھا اس نے مجھ سے بُغض رکھا۔ تمہارا دوست
اللہ کا دوست ہے اور تمہارا دشمن اللہ کا دشمن ہے۔ خرابی اس
کی ہے جو تم سے دشمنی رکھے!“ (مُتدرک حاکم جلد ۳۔ حاکم نے کہا ہے
کہ یہ حدیث علیؑ شرطِ شیخین میں ہے۔ نیابتِ الوردہ۔ الریاض النضرۃ جلد ۲ صفحہ ۱۸۵)

❶ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں:

”جو شخص حضرت امیر المومنینؑ یا آپ کی اولاد میں سے کسی امام کو
خُدا یا نبی مانے وہ غالی ہے۔“

❷ شیخ صدوقؒ فرماتے ہیں:

”غُلّات (جمع ہے غالی کی) یہودیوں اور نصاریوں سے بدتر اور کاذب ہیں۔“
غالی فرقوں میں سے (جن کا ذکر شہرستان نے الملک والمغل میں، نوبختی نے فِرَی شیعہ
میں اور مقریزی نے خُطط میں کیا ہے) اکثر تو میٹ گئے ہیں مگر کچھ اب بھی کس نہ کسی شکل میں
اور کہیں نہ کہیں باقی ہیں۔ انھوں نے ائمہ اہلبیت سے محبت و عقیدت ہی میں جوش اور بہانے
سے کام نہیں لیا بلکہ بہت سے ایسے عقائد بھی اختیار کر لیے جن کا اسلام سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔
جیسے تنازع اور حُلُول وغیرہ۔ حتیٰ کہ بعض نے تو حلال حرام کی تمیز ہی اٹھا دی اور حشر نشر کا بھی
انکار کر دیا۔

غالیوں کا ایک فرقہ نصیری ہے جو محمد بن نصیر نیری کی طرف منسوب ہے۔ یہ شخص
حضرت امام حسن عسکریؑ کا صحابی تھا، بعد میں آپ کی امامت کا مُنکر ہو گیا اور اپنی امامت کا دعویٰ
کر بیٹھا۔ نصیری فرقہ آج بھی غالباً ملک شام کے شمالی اطراف میں آباد ہے۔ یہ فرقہ حضرت علیؑ کی
خُدائی کا قائل ہے۔ اس کے علاوہ ترک کا تختاجی فرقہ اور ترکستان کا عَلِیُّ اللہی فرقہ بھی
آپ کی خُدائی کے متفقہ ہیں۔ واللہ اعلم

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا :

علیؑ سے محبت ایمان ہے اور علیؑ سے بغض نفاق ہے۔

(یعنی مسلم جلد ۴ صفحہ ۴۸ - کنز العمال جلد ۱۵ صفحہ ۱۰۵)

آپؐ نے یہ بھی فرمایا :

”جو شخص آخردم تک آل محمدؑ کی محبت پر قائم رہا وہ شہید مرا۔ یاد رکھو جو آل محمدؑ کی محبت پر مرا اس کی بخشش ہوگئی، یاد رکھو جو آل محمدؑ کی محبت پر مرا وہ گویا سب گناہوں سے توبہ کر کے مرا

یاد رکھو جو آل محمدؑ کی محبت پر مرا وہ کامل ایمان مرا۔ یاد رکھو جو

آل محمدؑ کی محبت پر مرا اسے موت کا فرشتہ جنت کی بشارت

دے گا۔ (تفسیر ثعلبی، تفسیر زمخشری، تفسیر فخرالدین رازی)

اس میں شیعوں کی کیا خطا اگر وہ ایسے شخص سے محبت کرتے ہیں جس کے

بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

کل میں علم ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ

سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کو اس سے

شہرستان الملل والنمل میں لکھتے ہیں کہ

”ایک نال فرقد دعویٰ کرتا تھا کہ حضرت علیؑ قتل نہیں ہوئے ہیں وہ اب بھی زندہ ہیں۔ ایک اور دیوالائی تصورات رکھنے والا فرقد کہتا تھا کہ بادل حضرت علیؑ کی دیولوک ہے۔ یہ بادلوں کی گرج اور بجل کی چمک آپؑ کی آواز ہے۔“

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں کہ

”ایک شخص مغیرہ بن سید کہا کرتا تھا کہ حضرت علیؑ اگر چاہیں تو عاد و ثمود

اور ان دونوں قوموں کے درمیان کی صدیوں کے سب لوگوں کو زندہ کر دیں۔“

غلات کے ایسے ہی باطل عقائد کی بنا پر ائمہ اہلبیتؑ میں سے حضرت امام محمد باقرؑ حضرت امام جعفر صادقؑ، حضرت امام علی نقیؑ اور حضرت امام حسن عسکری علیہم السلام نے ان سے اپنی لافٹنی کا اظہار کیا بلکہ ان پر بار بار لعنت کی اور اپنے اصحاب سے بھی لعنت کرنے کو کہا۔

پس یہ کہنا صحیح ہے کہ خالیوں کا شیعہ اثنا عشریوں سے قطعاً کوئی تعلق نہیں اور ان کے اقوال و عقائد کی وجہ سے ان پر اعتراض کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ شیعہ اپنے محبوب کو معبود نہیں کہتے، بلکہ ان کے لیے وہ کچھ کہتے اور مانتے ہیں جو ان کا حق ہے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ان کے مناقب میں کہا ہے۔ مختصر یہ کہ ائمہ اہلبیت کی ولایت شیعوں کی شناخت ہے، کیونکہ :

ائمہ اہلبیت اللہ کی محبت اور رسول اللہ ﷺ کی ذریت ہیں۔ یہ نفوس قدسیہ درود میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شام ہیں۔ یہ ساری اُمت سے افضل اور ممتاز ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ انھیں کو

مُباہلہ میں لے کر گئے تھے۔ یہ اصحاب کساء اور آیہ تطہیر کا مصداق ہیں۔ انھیں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا کہ ان کا دوست میرا دوست ہے اور ان کا دشمن میرا دشمن ہے۔ انھیں کی شان میں سورہ کوثر بھی اُتری۔ اور سورہ قل اُتی بھی اُتری۔ یہی رسول اللہ ﷺ کے وہ قرابت دار ہیں جن کی مودت کو اللہ نے واجب کیا ہے۔ یہی ائمہ قرآن کے ترجمان اور رسالت کے پاسان ہیں اور یہی ائمہ انسانیت کے لیے ملجأ و مآوی ہیں۔

ائمہ اہلبیت رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کی تبلیغ میں مصروف رہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اپنی ریت میں قرار دیا تھا۔ انھوں نے ہی دُنیا کو عبادت کا ڈھنگ اور دُعا کا آہنگ سکھایا اور حلال و حرام سمجھایا۔ یہی غلادۃ رسالت مشریت کا امین ہے اور اس نے شریعت کو بدعت سے بچانے میں فعال کردار ادا کیا۔ مسجدوں سے گونجتی یہ تکبیریں اور محرابوں سے اُٹھتی لا اِلهَ اِلَّا ہِیہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں کی محنتوں اور قربانیوں کے صدقے میں باقی ہیں۔ انھیں میں باب مدینہ علم ہیں اور انھیں میں باب الحوائج ہیں۔ انھیں کا نام نا امیدی اور مایوسی میں مرثدہ جانفرا ہے۔ انھیں کے توسل سے دُعائیں مستجاب ہوتی ہیں اور انھیں کی شفاعتیں بار بار ہوتی ہیں کیونکہ انھیں اذن شفاعت دیا گیا ہے۔

ائمہ اہلبیت ہی اُدیٰ الامر ہیں اور نا سَخُون فی العلم ہیں۔ یہی لوگ تو ہدایت یافتہ اور ہدایت کرنے والے ہیں۔ یہی نجات کا سفینہ اور علوم ربّانی کا خزینہ ہیں۔ یہی لوگ تو ہیں جن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور جن کی مخالفت اللہ کی مخالفت ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کے چنیدہ اور برگزیدہ بندے ہیں۔ انھیں کے سرور و سردار حضرت علیؑ کو قرآن نے تاج ولایت پہنایا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی ولایت کبریٰ کو اللہ کا حصار بتایا ہے۔

فَرَدَقِ اِنے مشہور قصیدہ مہمبہ میں حُبِ اہل بیت کے بارے میں کہتا ہے :

مِنْ مَعْشَرِ حُبِّهِمْ دِينَ وَبَعْضُهُمْ

کُفْرٌ وَقَرْبُكُمْ مِنْجِي وَمُعْتَصِمٌ
 اِن کا تعلق اس خاندان سے ہے جس سے محبت کرنا دین ہے
 اور جس سے بغض کفر ہے اور جس سے قرب میں نجات اور پناہ
 ہے۔

اِنْ عُدَّ اَهْلُ التَّقَى كَانُوا اَيْمَتَهُمْ
اَوْ قِيلَ مَنْ خَيْرَ اَهْلِ الْاَرْضِ قِيلَ هُمْ
اگر اہل تقویٰ کا شمار کیا جائے تو یہ ان کے امام ہیں اور اگر یہ کہا
جائے کہ زمین پر بسنے والوں میں سب سے بہتر کون ہے تو کہا
جائے گا یہی تو ہیں۔

شہید اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتے ہیں اور اسی محبت کی وجہ سے

مُبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا :

اِنَّ هٰذَا لَعِلْمًا جَمِيًّا .
ایک دوسرے مرتبہ پر آپ نے کہا :
سَلَوْنِيْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِيْ .

اللہ ایک بار آپ نے فرمایا تھا: "تم لوگو! میں زمین کے راستوں سے زیادہ آسمان کے راستوں سے واقف ہوں۔"

یہ بھی آپ ہی نے کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اگر میں مسندِ قضاوت پر بیٹھوں تو اپنی قومیت میں قورات سے، اہل انجیل میں انجیل سے اور اہلِ قرآن میں قرآن سے فیصلہ کروں۔“

آپ کی اعلیٰیت کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا تھا: لَوْلَا عَلِيُّ لَهْلَكَ

آپ کی علمیت کے متعلق ہم یہ تو نہیں کہتے کہ آپ مَا كَانْ وَمَا يَكُونُ کا سارا علم

555

محبت ہے۔ (عصم مسلم جلد ۲)

معلوم ہوا کہ جس کو علیؑ محبوب ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہے اور وہ مومن ہے۔ اور جس کو علیؑ ناپسند ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہے اور وہ منافق ہے۔

امام شافعی نے حُبِ اہل بیت کے بارے میں کہا ہے: **يَا أَهْلَ بَيْتِ رَسُولِ اللَّهِ حُبُّكُمْ فَرَضٌ مِنَ اللَّهِ فِي الْقُرْآنِ أَنْزَلَهُ لِي أَهْلُ بَيْتِ رَسُولِ اللَّهِ بِمَحَبَّتِ اللَّهِ فِي الْقُرْآنِ** اے اہل بیت رسول! تمہاری محبت اللہ نے قرآن میں فرض کی ہے

کَفَاكُمْ مِنْ عَظِيمِ الْقَدْرِ اَنْتُمْ
مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لَا صَلَوةَ لِهٖ

مختصری فضیلت کے بیان میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ جن نے
نماز میں تم پر درود نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں ہوگی

کون ہے جو اس سے انکار کرے کہ
حضرت علیؓ سید المسلمین ہیں، امیر المؤمنین ہیں، امام المقتدین ہیں
قائد المومنین ہیں۔ یا یہ کہ آپ ہی بیت شکن، خیمہ شکن اور بیعت شکن
الذین ہیں۔ لیلۃ البیت آپ نے بستر رسول پر سو کر جان بھاری کی اعلیٰ
مثال قائم کی۔
حضرت علیؓ بیخ السلام ہیں۔ ائمہ اہلبیت کا تعارف کرتے ہوئے فرماتے ہیں
اس بیت میں کسی کو آں محمد پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دین کی بنیاد اور
یقین کے ستون ہیں۔ حجۃ دلائل کی خصوصیات انھیں کے لیے ہی الہامی ہیں۔

کے موصی اور وارث ہیں۔ اس کے بعد اسی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں نے تم کو رسول اللہ بنایا ہے اور تم میرے وارث ہو گئے۔

رسول اللہؐ کی موجودگی میں تو ہنستا کھیلتا رہتا تھا لیکن ابن الخطاب کو دیکھ کر بھاگ جاتا تھا۔

غلو اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اہل سنت رسول اللہؐ کی سنت کو چھوڑ کر صحابہ خصوصاً خلفائے راشدین کی سنت کا اتباع کرتے ہیں۔



قارئین محترم!

حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کے دوراہے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو ڈاکڑ تيجان نے اپنی اس بحث میں ایک راہ دکھا دی ہے۔ اب یہ حقیقت کے شنیداریوں اور ہدایت کے متلاشیوں کا کام ہے کہ وہ بھی تحقیق کا بیڑا اٹھائیں تاکہ جس طرح ڈاکڑ صاحب کا دل دس سالہ تحقیق عینق کے بعد ایمان کی تجلی سے پُر نور ہوا ہے، ان کے دل بھی منور ہو جائیں۔ البتہ ہدایت کے اس سفر میں یہ بات صادق آتی ہے کہ از تو حرکت، از خدا برکت یعنی ڈھونڈھنے والا حق کو ڈھونڈھے اور واقعی ظلمات سے عزم ہجرت کرے کیونکہ ارشادِ ربانی ہے: **وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا**۔

ظاہر ہے کہ تلاش حق کا یہ معاملہ انتہائی نازک اور سنجیدہ ہے کیونکہ اس کا تعلق جنت یا جہنم سے ہے نجات یا عذاب سے ہے لہذا کون چاہے گا کہ وہ جہنم کا ایندھن بنے۔ پس متلاشی حق کو چاہیے کہ فرق و اریت سے بالاتر ہو کر چراغ عقل کی روشنی میں غور و فکر کرے اور اپنے ضمیر سے فیصلہ چاہے، کیونکہ ضمیر کی عدالت میں بندہ ہوتا ہے اور خدا!

وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ

ناشر

اور ان کو بے جا طور پر مقدس سمجھتے ہیں۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رد عمل ہے اس کا کہ شیعہ نسب صحابہ کی عدالت کے قائل نہیں۔

چنانچہ ائمہوں کی یہ پالیسی تھی کہ وہ صحابہ کی نشان بڑھانے تھے اور اہل بیت نبویؐ کا درجہ گھٹاتے تھے، حتیٰ کہ محمدؐ و آل محمدؐ پر درود میں جس وعلیٰ اصحابہ اجمعین کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ کیونکہ درود اہل بیت کی ایسی فضیلت ہے جس میں ان کے پچھلوں میں سے کوئی بھی ان کا شریک و ہم نہیں، بنی امیہ چاہتے تھے کہ صحابہ کو بھی اس بلند درجے تک پہنچا دیں۔ وہ یہ نظر انداز کرتے تھے کہ اللہ سبحانہ نے سب مسلمانوں کو جن میں صحابہ بدرجہ اولیٰ شامل تھے حکم دیا ہے کہ محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ اور حسینؑ پر درود بھیجیں، اور جس نے ان پر درود نہیں بھیجا اور فقط محمدؐ پر اتکاف کیا، اس کی نماز مقبول نہیں ہوگی، جیسا کہ شیخ بخاری اور مسلم جیسے ثابت ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت صحابہ کے معاملے میں غلو کرتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت مقبول حد سے تجاوز کر کے سب صحابہ کی عدالت کے قائل ہیں۔

اہل سنت کا غلو اس وقت ظاہر ہو جاتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ غلطی کرتے تھے جس کی اصلاح کوئی صحابی کرنے لگے۔ یا وہ یہ کہتے ہیں کہ شیطان

لے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن عاصی بن وائل نے آپ کو آہستہ یعنی بے اولاد ہونے کا طعنہ دیا تو خداوند عالم نے آپ کو گوشہ (آل محمدؐ) عطا فرمایا اور آپ کے دشمن کی نسل کو جس پر اسے گھنہ تھا، جہنم کر دیا۔ اس لیے کہ حضرت نے فرمایا: **بِصَلَاةٍ بَرَاءَةٍ** بھیجی۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہ! صلوة براء کیا ہے؟ فرمایا: **اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ** کہہ کر رک جانا۔ لہذا محمدؐ پر یوں درود بھیجو کہہو: **اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ عَلَى آلِ مُحَمَّدٍ**۔ (صواعق محرکہ)

پس صلی اللہ علیہ وسلم۔ **تُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ** صلی اللہ علیہ وسلم۔ **وَبَارِكْ وَسَلِّمْ** اللہم صل علی محمدؐ النبی الامی وغیرہ کہنا سب صحابہ کے دل میں آئے۔ (ناشر)

البطل والسنن
 أبو عبد الله محمد بن عبد الله بن أبي بلال أحمد بن سالي سوني ٥١٠ هـ
 الفتوحات المكية
 أبو عبد الله محمد بن عبد الله بن محمد بن علي (ابن عربي) ٤٣٨ هـ
 تذكرة السبط
 شمس الدين يوسف بن قزويني (سبط ابن خنزي) ٤٥٢ هـ
 تذكرة خواص الأمم
 ٤٥٢ هـ
 مطالب السؤول في مناقب آل أبي طالب
 أبو سالم كمال الدين محمد بن طلحة شافعي ٤٥٢ هـ
 كفاية الطالب في مناقب علي بن أبي طالب
 أبو عبد الله محمد بن يوسف كنجي شافعي ٤٥٨ هـ
 تلخيص
 أبو عبد الله محمد بن أحمد بن الحسين ٤٦٨ هـ
 سراج اعلام النبلاء
 ٤٦٨ هـ
 الفصول المهمة
 نور الدين علي بن محمد بن صبار مالكي ٨٥٥ هـ
 الانزهار في معرفة الشعراء الأشعار
 حافظ جلال الدين سيوطي ٩١١ هـ
 جامع الصغير وجامع الكبير
 ٩١١ هـ
 ارشاد الساري لشرح صحيح البخاري
 أبو العباس شهاب الدين أحمد بن محمد سلطان ٩٢٣ هـ
 صلوة الموحدة في الأدب على ابن أبي الدنيا
 شهاب الدين ابن حجر هشاش مكي ٩٤٢ هـ
 عقائد الاكابر
 سيد عبد الوهاب شعران ٩٤٦ هـ
 احقاق الحق
 قاضي نور الله الحسيني تستري شهيد ١٠٩١ هـ
 استغفار الراغبين
 محمد علي صبان مصري ١٢٠٦ هـ
 سنن أبي المودّة
 حافظ سليمان بن ابراهيم قندوزي ١٢٩١ هـ

شرح نهج البلاغة
 شيخ محمد عبده مصري
 الصلوة بين النصوص والتشريع
 شبلي
 اعلام النصار
 عمر رضا
 نور الابصار
 مومن بن مومن شبلنجي مصري
 توارخ مواليد الائمة
 ابن خشاب
 فصل الخطاب
 محمد نجاري خفي
 الحديث المتسلسل
 بلاذري
 مرآة الاسرار
 عارف عبد الرحمن
 شرح المواهب
 زرقاني

فضاء كل خمسة من الصحاح
 علامة تفضل حسين فيروز آبادي

